فاطمہ مرنیسی

اسلام اور جمہوریت

ترجمہ: محمد رشید رازی

مشعل

MashalBooks.org

1

فاطمہ مرنیسی

اسلام اور جمہوریت

ترجمہ: محمد ارشد رازی

مشعل بکس

آر بی 5 عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان

MashalBooks.org

MashalBooks.org

3

اسلام اور جمہوریت

فاطمہ مرنیسی

ترجمہ: محمد ارشد رازی

کاپی رائٹ ©2002 مشعل بکس

کاپی رائٹ انگریزی© فاطمہ مرنیسی

مشعل بکس

آر بی 5 عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان

MashalBooks.org

فہرست

تعارف	اسلام اور جمہوریت	5
باب1	اجنبی مغرب کا خوف	17
باب2	امام کا خوف	28
باب3	جمہوریت کا خوف	51
باب 4	اقوام متحدہ کا چارٹر یعنی تاسیسی منشور	72
باب5	قرآن حکیم	87
باب6	حریتِ فکر کا خوف	96
باب 7	انفرادیت کا خوف	118
باب 8	ماضی کا خوف	130
باب9	حال کا خوف	147
باب10	عورتوں کا گیت.....منزل آزادی	167
	نتیجہ :	
	سیمرغ ہم میں ہیں	193
	حواشی	196

MashalBooks.org

MashalBooks.org

تعارف

اسلام اور جمہوریت

خلیجی جنگ: خوف اور اس کی سرحدیں

جنگ خلیج ختم ہو چکی، فوجیوں کو اپنے اپنے اڈوں پر واپس پہنچے عرصہ گزر گیا، لیکن میرے جیسے بہت سے لوگوں کے لئے یہ جنگ ان چیزوں میں سے ایک ہے جن کی کوئی انتہا نہیں ہوتی.....جیسے علامتی زخم اور لاعلاج بیماریاں۔ زندگی بہرطور رواں دواں ہے۔ موسم بہار میں خود کو گنگناتے، بالوں میں پھول اڑستے اور کسی نئی لپ اسٹک کا جائزہ لیتے پا کر آپ حیران رہ جاتی ہیں۔ زندگی اپنے تسلسل میں ہے، بظاہر یوں گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھار کسی ناشناسا ملک میں نامانوس بستر پر، صبح دم کچی پکی نیند میں کسی چیز کے چٹخنے کی آواز آتی ہے اور کہیں اور سوتے اٹھتے خیالات و احساسات آپ کے شعور پر یلغار کر دیتے ہیں۔ تب آپ کو لگتا ہے کہ ایک انجانا خوف آپ کے اندر گویا گود دیا گیا ہے۔ ایک چرکا جو خراش سے گہرا نہیں لیکن اپنے انمٹ ہونے میں اتنا ہی شدید.....اس لئے کہ یہ کہیں اس حصے میں گڑا ہے جہاں بچپن کے خوف ہوتے ہیں۔

اس طرح کی پہلی واردات کا آپ کسی سے کوئی ذکر نہیں کرتے.....قریب ترین دوستوں سے بھی نہیں۔ بس اسے بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاموش، خود پروان چڑھتی حساسیت میں گھرے کافی کی چسکیاں لیتے ہیں۔ یہ حساسیت ان لوگوں کا مقدر ہوتی ہے، جن کی زندگی بے اساس ہوتی ہے وہ خوابوں کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں، خصوصاً جلد محو ہو جانے والے خوابوں کے متعلق ۔ آپ بستر کو چھو کر اس کے حقیقی ہونے

MashalBooks.org

کا تعین کرتے ہیں اور پھر کھڑکی میں کھڑے ہو کر شہر سے ایک تعلق پیدا کرنے کی کوشش میں گلیوں بازاروں کو ذہن نشین کرنے لگتے ہیں۔ تاہم گزرتے وقت کے ساتھ آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے جہاں گردی کم کر دی ہے تا کہ انجانی چیزوں سے بچ سکیں اور یوں بھی آپ کے لئے خواب یاد رکھنا بھی مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آپ امن اور چین کی آس میں یہ سب قبول کرتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ اگلا واقعہ نمودار ہوتا ہے اور آپ کا اپنا بستر نامانوس اجنبی علاقہ بن جاتا ہے۔

ساری دنیا میں اس جنگ کے خلاف بے دھڑک اور توانا ترین آواز خواتین اور خصوصاً عرب خواتین نے اٹھائی، جس کی جزئیات میں سے ایک یہ تھی کہ اس تنازعے کے دوران بے نقاب اور نقاب پوش ہر دو طبقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین نے امن کیلئے آواز اٹھانے میں پہل کی۔ لیکن اسے نظرانداز کر دیا گیا حالانکہ یہ بجائے خود ایک انقلابی اقدام کے مترادف تھا۔ عورتوں نے روایت کے برعکس سیاسی رہنماؤں.....یعنی مردوں کی اجازت کا انتظار نہیں کیا۔ تونس، رباط اور الجزائر کی خواتین نے خوف و خدشات کے اظہار میں جو آواز اٹھائی، غالباً وہ بلند ترین تھی۔ خواتین نے دھرنوں اور مارچوں کے اہتمام میں مردوں پر تقریباً ہمیشہ سبقت لی۔ دوسری طرف مردوں نے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بڑی طاقتوں اور چھوٹی طاقتوں سے مذاکرات کے کئی دور کئے جن میں کئی کئی بار کی ناکامی کے بعد کسی فیصلے پر پہنچا جا سکا۔ خود میں نے رباط میں منعقدہ کئی اجلاسوں میں شرکت کی اور درجنوں بار بغیر کسی التوا کے ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے دانشور جنگ کے خلاف محاذ آرائی میں اکٹھے ہوئے۔ جب کبھی کسی غیر ملکی سفارت خانے کو تین چار پیراگراف پر مشتمل یادداشت پیش کرنے یا کسی سربراہ مملکت کو بیان دینے پر قائل کرنے کی تجویز منظور ہوئی، مجھ پر کھلا کہ بظاہر سیدھا سادہ یہ طرز اظہار دراصل قانونی اور سفارتی موشگافیوں کا ایک ناقابل یقین حد تک پیچیدہ سلسلہ ہے۔ یوں میں کئی بار سخت حیرت سے دوچار ہوئی، کیونکہ محض عورت ہونے کی وجہ سے اقتدار سے باہر رکھے جانے کے باعث مجھے ان پیچیدگیوں کی کبھی خبر نہ ہونے پاتی۔ لیکن عورت ہونے کے ناطے اپنے حصے کی اس محرومی کا مداوا یہ ہے کہ میری فکر بہت سی حدوں سے آزاد ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے ساتھ بے اختیاری کا ناقابل برداشت احساس بھی وابستہ ہے۔

MashalBooks.org

عام حالات میں خاموش اور تابع فرمان عرب خواتین نے اس ختم نہ ہونے والی رات، یعنی جنگ، میں اپنے خدشات کی چیخ اتنی شدت سے کیوں بلند کی؟ انہیں تو سرکار قانونی طور پر کمتر گردانتی ہے! تو کیا انہیں جبلی طور پر احساس تھا کہ انسانی حقوق کے سب سے بڑے علمبردار یعنی اقوام متحدہ کی طرف سے جائز قرار دیئے گئے اور اس کی سرپرستی میں ہونے والے اس خون خرابے سے عرب قوتیں بے لگام ہو جائیں گی اور دوسروں کے قتل کو عین قانونی اور جائز خیال کرنے لگیں گی؟

کیا خواتین کی احتجاجی چیخ عید الضحیٰ پر قربانی کے لئے تیار کھڑی بھیڑوں کی سی تھی اور انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مغربی ریاستوں کے سربراہان اور اقوام متحدہ کے اعلیٰ ترین عہدیدار یعنی جمہوریت اور انسانی حقوق کے معبد کے سب سے بڑے پروہت نئی رسوم کی طرح ڈال رہے ہیں؟ ایسی رسوم کی طرح جو کہنگی اور تباہی میں پہلی تمام رسوم کو مات کر دیں گی اور ان کے ردعمل میں ایسی ہی روایات و رسوم قائم ادا ہوتی نظر آئیں گی۔

عرب معاشرہ حالت امن میں ہو تو عورتوں کا مقدر بڑی حد تک متعین اور دوسروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لیکن غیر ملکی قوتوں کے ہاتھوں آگ اور خون میں دھکیل دیئے جانے کی صورت میں ان کا مقام بڑی حد تک متزلزل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اگر بین الاقوامی قانون کے نام اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے حکم پر جنگ عرب معاشرے پر مسلط کر دی جائے تو یہ سب عورتوں کے لئے کس درجہ خوفناک امکانات کا حامل ہوگا؟ اور جب یہ سب کچھ وہ مغربی طاقتیں کر رہی ہوں جنہیں دنیا کی اخلاقی رہنمائی کا دعویٰ بھی ہے، تو اس عمل کو کیا کہا جائے گا؟ یہی مغربی طاقتیں باقی ساری دنیا پر جمہوریت کا ایسا خاکہ مسلط کرنے پر مصر ہیں جس میں تشدد کسی طور جائز نہیں۔ کیا یہ جنگ ناگزیر تھی؟ کیا اس سے بچا نہیں جا سکتا تھا؟ یہاں یہی سوال زیر غور ہے۔

نسل در نسل چلنے والی حکومتیں مراتب کے طے شدہ نظام جمہوریت کی وعید کو اپنے لئے خطرہ کیوں خیال کرتے ہیں؟ افریقہ اور ایشیا میں جمہوریت حکومتوں کو غیر مستحکم کیوں کر دیتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جمہوریت ان معاشروں کی روایات کے اجزائے ترکیبی سے جا ٹکراتی ہے؟ یعنی تقدس کے لبادہ میں لپٹے تشدد سے متصادم ہوتی ہے۔

MashalBooks.org

جب مغرب نے انسانی حقوق کی کسی بھی خلاف ورزی کو جرم قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی تو مدتوں نوآبادیاتی نظام کے جبر وتشدد کا شکار رہنے والی قوتیں بھی اسے قابل اعتماد رہنما خیال کرنے لگیں۔ جمہوریت تشدد اور اسے جائز قرار دیئے جانے کی راہ میں حائل دیوار ہے۔ اس لئے جمہوریت کو ریاستی اور ریاستوں کے مابین خونریزی سے عبارت عہد کے خاتمے کی نوید سمجھا جاتا ہے۔

تیسری دنیا کی یادداشت میں اہل مغرب ظالمانہ نوآبادیاتی نظام کے کار پردازوں کے طور پر ثبت ہیں۔ خیر کے علمبردار کی حیثیت سے انہیں اپنا سکہ جمانے میں جس قدر کامیابی دیوار برلن کے انہدام پر ملی، ماضی میں کبھی ممکن نہ ہوسکی تھی۔ اس ایک لمحے اور اس کے بعد مسلسل گرتی اقربا پرور جابر آمریتوں نے، جن میں سے چاؤشسکو کا انجام خصوصاً عبرت انگیز تھا، ذرائع ابلاغ کے سہارے مدت سے جمود کے شکار عرب شہروں میں ایک امید افزاء ہلچل مچا دی۔ مجھے وہ جون یاد ہے جب پھیری والے مچھیرے نے کلو بھر مچھلی تھمائی اور مجھے کھڑا چھوڑ کر قریبی دکان کو دوڑ لگائی جہاں ٹی وی پر نکولائی اور ایلینا چاؤشسکو کی گرفتاری پر رپورٹ چل رہی تھی۔ دس منٹ بعد لوٹا تو میں نے یوں کھڑا چھوڑ جانے پر خفگی کا اظہار کیا۔ اس کے جواب سے مجھ پر کھلا کہ یہ لمحہ اس کے لئے کیا معنی رکھتا ہے- وہ بولا:

''میرے پاس دو راستے تھے۔ آپ کو فارغ کرتا جس کے عوض مجھے چالیس درہم ملتے یا پھر قدرت خداوندی کا نظارہ کرتا۔ آپ خود ہی بتائیں ان دونوں میں کوئی مقابلہ ہے؟ چالیس درہم یا قدرت خداوندی؟ چالیس درہم کو کون پوچھتا؟ مادام، میں ان پڑھ ہوں لیکن آپ کی طرح، جو ممکن ہے تعلیمی اسناد سے لدی ہوں، مجھے بھی اتنا شعور ہے کہ تاریخ ایک موڑ پر کھڑی ہے۔''

دیوار برلن کا ٹوٹنا اور مشرقی یورپ میں جابرانہ حکمرانوں، اداروں اور اِن حکومتوں کی علامتوں کا انہدام جغرافیائی اور نسلی اعتبار سے مقامی ہونے کے باوجود اپنے معانی میں عالمگیر تھا۔ یہ بجا ہے کہ دیوار برلن کا ٹوٹنا صرف اہل یورپ، بلکہ زیادہ درست معنوں میں اہل جرمنی کا، معاملہ تھا۔ ہم نے جرمنوں کو اس دیوار پر چڑھتے، اس کے گرنے پر خوشیاں مناتے، اس کے ٹکڑے کرتے اور پھر ان ٹکڑوں کو جواہرات کی طرح گلے میں حمائل کرتے دیکھا تھا؛ وہ ٹکڑے جو مٹتی سرحدوں اور کٹے پھٹے حجاب (پردہ ، نقاب) کی باقیات

تھیں۔اگرکوئی عرب بچہ 'آہنی پردے، کے ترجمے کی کوشش کرے تو وہ لفظ ''حجاب'' پر قدرے لڑکھڑائے گا اور اس کا جواب ہوگا، ''الحجاب الحدیدی'' ۔اور وہ بچہ بالکل درست ہوگا کیونکہ لفظ ''پردے''(Curtain) کا ترجمہ کسی ایسی چیز کے طور پر ہی ہوسکتا ہے جو مکان کو ایسے دوحصوں میں بانٹ دے جن کے درمیان اشیاء کی نقل وحرکت ممکن نہ رہے۔ یوں پردے کا ترجمہ ''حجاب'' عین درست مفہوم ادا کرتا ہے۔شمالی افریقہ کے شہروں میں جوتوں کی رکھوالی کرنے والوں سے لے کر دور دراز کے پہاڑی سلسلوں میں بسنے والے دہقان تک بھورے بالوں والے ان نوجوان لڑکوں لڑکیوں کی قومیت بتا سکتے تھے جوگاتے ناچتے باہم گلے ملتے، نشہ آزادی میں چور اور آمریت کوختم کرنے کی آرزو لئے دیوار برلن گرا رہے تھے۔''حجاب برلن'' کے یوں پھٹ گرنے پر دنیائے عرب کے شہروں میں ایک اورلفظ جو بہت مشہور ہوا، شفافیہ(Transparency) تھا۔

ہرطرح کے اختیارات سے محروم، فیصلوں سے بے دخل اور اپنے ممالک کی بے ڈھب سیاست کی سی پارہ پارہ زندگی گزارنے والے عرب نوجوان لڑکوں لڑکیوں میں اچانک شمال کے ان لوگوں میں دلچسپی بیدار ہوئی جوگلیوں بازاروں میں آزادی اور انصاف کے حصول کی خاطر نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔ اس وقت تک ان کے ذہن میں جرمنی کا خاکہ فقط ایک ایسے ملک کا تھا جہاں ڈوئچے مارک کے استحکام کی برکت سے لوگ غریبوں کی قسمت پر بسورنے کی بجائے ہمہ وقت حصول مسرت میں مگن رہتے ہیں اور اب وہ ان جرمنوں کو دیکھ رہے تھے جن میں انصاف اور آزادی کی طلب نے زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ عرب نوجوان نسل کو جرمنوں کا یہ رگ و ریشے میں بسا جذبہ، اتنا بنیادی اور شناسا لگا کہ بے اختیار احساس محرومی میں اپنے اکیلے ہونے کا احساس جاتا رہا۔ وہ بے اختیار پکار اٹھے، ''واللہ'' یہ جرمن بھی ہماری طرح محسوس کرتے ہیں، اپنے نسبتاً غریب بھائیوں سے محبت کرتے ہیں اور انہیں آزاد کروا رہے ہیں۔'' رباط شہر میں جوتوں کی مارکیٹ سوق السبت کے ایک دکاندارعلی نے اپنی حیرت کا اظہار انہی الفاظ میں کیا تھا۔ دیوار برلن گرنے کے تین دن بعد اپنی دکان میں رکھنے کو اس نے ایک بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن خرید لیا تھا۔ یورپ جو1969ء کی انسانیت نوازی کی لہر کے بعد عیش کوشی اور آزادہ روی کے باعث، ہمارے نزدیک بے حسی کا شکار ہوگیا تھا،اچانک جذبات میں جلنے لگا۔عرب ٹیلی ویژن پر ایسا یورپ

نمودار ہوا جس کی توقع نہیں کی جا رہی تھی۔ ''کافر اور انسان دوست! اللہ اکبر'' ایک آنکھ ٹی وی اور دوسری جوتوں پر جمائے علی نے منہ ہی منہ میں کہا:

''حجاب، برلن'' کے ٹوٹنے کے بعد اور بغداد پر حملے سے ذرا پہلے تک کے زمانے میں عرب عوام اہل یورپ کو عقیدہ جمہوریت کے معمار، مبلغ اور محافظ کی حیثیت سے دیکھنے لگے تھے؛ جمہوریت جس کے حتمی نتیجے کے طور پر تشدد کا مسئلہ کم ہوتے ہوتے بالآخر حل ہو جائے گا۔ اس کا استعمال بھی کم کم ہونے لگا- لیکن پھر اس جنگ نے تشدد کی مذمت، عدم تشدد کے وعدوں اور اہل یورپ کے نغمات سے عالمگیر سطح پر اٹھنے والی امید کی توانا لہر کو بے رحمی سے برابر کر دیا۔ چند ماہ کی اس جنگ کے دوران اظہار رائے سے محروم عرب شہریوں کو لگا گویا الف لیلیٰ کی کہانی میں آنے والے کسی ڈرامائی موڑ کی طرح، یورپی انسان دوست نسل کو گہری نیند سلا دیا گیا ہے۔ اب ان کے ٹیلی ویژن پر جو چہرے نظر آتے تھے وہ ایک اور ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے جسے وہ تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ ہو بہو نوآبادیاتی دور کے سے۔ کیپی (فوجی ٹوپی بمعہ چشمہ) لگائے، تمغوں سے آراستہ جنرل جو بڑے فخر سے بغداد پر گرائے جانے والے بموں کی ٹنوں میں گنتی بتا رہے تھے۔ بم باری شروع ہونے کے دو ہفتے بعد علی نے اپنا ٹی وی فروخت کر دیا اور حاصل ہونے والی رقم مراکشی ہلال احمر کو دے آیا۔

''استاذہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہ مقابلہ بڑی طاقتوں کے درمیان ہے۔ یہ معاملہ انہیں آپس میں طے کرنا چاہیے۔ بغداد کے جوتا فروش اس میں شامل نہیں ہیں۔ لوگوں پر بم کیوں گریں؟ آپ تصور کر سکتی ہیں کہ سوق السبت پر ایک بم گرایا جائے تو کیا ہوگا؟ محض ایک پٹاخہ پورے شہر کو آگ میں جھونک دے گا۔ میں چھیالیس برس کا ہوں۔ کیپی میں فرانسیسی جنرل آخری بار دیکھا تو دس برس کا تھا؛ اس وقت 1955ء میں جب آزادی ملا ہی چاہتی تھی۔ لیکن کیل کانٹے سے لیس یہ امریکی!.....سب امریکی فلموں کا سا لگتا ہے۔ بس ایک فرق ہے کہ ان کا نشانہ ہمارے اپنے بھائی ہیں۔ مجھے ڈراؤنے خواب آنے لگے ہیں۔ میری بیوی مجھے ٹی وی دیکھنے سے منع کرتی ہے۔''

تشدد بجائے خود خلاف تہذیب ہے لیکن اگر اس کا نشانہ بننے والے کو کچھ لمحے پہلے ایسے افعال قبیحہ سے پاک عہد کی نوید سنا دی جائے تو اس کی شدت اتنی زیادہ ہوگی کہ انسانی

ذہن اس کا احاطہ نہ کر پائے گا- تشدد کے حوالے سے اہل یورپ کی اس بے رخی نے عوام الناس کو ذہنی پراگندگی اور انتشار سے دوچار کر دیا ہے۔

خلیج کی جنگ اس بحث کو کیفیتی حوالے سے ماضی میں بہت دور لے گئی ہے۔ چنانچہ مجھے اپنے احساس کی وضاحت کے لئے نسلی گروہی اصطلاحات استعمال کرنا ہوں گی۔ لگتا ہے کہ بحیرہ روم کے بالمقابل ساحلوں پر دو متحارب قبائل خیمہ زن ہیں۔ آج سے قبل شمال میں اپنے ساتھیوں کو ان کے یورپین اور خود کو اپنے عرب ہونے میں کبھی اتنا منجمد نہیں پایا۔ ہم میں سے کوئی ایک تو بہرحال دقیانوسی تھا کہ اختلافات کم نہ کئے جا سکے۔ میں نے دوران جنگ مکالمہ کیلئے فضا سازگار ہونے کی امید میں، جرمنی اور فرانس میں ہونے وداے مباحثوں اور مکالموں میں شرکت کی اور میرا مذکورہ بالا خیال پختہ تر ہوگیا۔ کیونکہ یہ سارا عمل لاحاصل رہا۔ فقط اتنا ثابت ہوا کہ ہم میں باہم حائل درمیانی دیوار گرانے کی اہلیت موجود نہیں اور نہ یہ صلاحیت کہ ایک دوسرے سے ملیں اور اس ایقان کے ساتھ کہ اختلاف خوف و خدشے کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ جب تک اختلاف کو دھمکی خیال کیا جاتا رہے گا حد بندیاں ہی قانون بنی رہیں گی۔

ایک حرم میں پیدا ہونے کی وجہ سے بہت کم عمر میں ہی جبلی سطح پر میں جان گئی تھی کہ ہر حد بندی کے دوسری طرف کچھ نہ کچھ پوشیدہ ہے اور وہ خالی از خطر نہیں۔ مجھے اس کتاب میں اسی خوف و خدشہ بلکہ خدشات پر کچھ کہنا ہے۔ ہر طرح کے خوف کے متعلق جو ہر سمت سے، باطن اور خارج سے، مشرق اور مغرب سے پھٹ پڑتے ہیں اور پھر عکس در عکس باہم ضرب کھاتے لامحدود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انفرادی خدشات پر بھی بات ہوگی لیکن زیادہ تر اجتماعی خدشات زیر بحث آئیں گے۔ ان میں سے اول الذکر کا نتیجہ خودکشی کی صورت نکلتا ہے جو بالآخر ایک انفرادی معاملہ ہے۔ لیکن موخرالذکر کا نتیجہ فتنہ یعنی تشدد کے پھٹ پڑنے کی صورت نمودار ہوتا ہے اور اپنی ہلاکت آفرینی میں شدید ترین ہے، کیونکہ اس کا مقام وقوع ایک گروہ کا داخلی علاقہ ہے۔

میرے گروہ میں یہ حد بندیاں قانون کی صورت ٹھوس شکل میں ہیں۔ بحیرہ روم کے جس طرف میں رہتی ہوں، یہ حد بندیاں ''حدود'' کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ ''حدود'' ایسا معین اور یقینی حصار ہے جو خطرے کی صورت پناہ کی ضمانت ہے: جس طرح کے حصار

ہمارے اجداد نے شہروں کے گرد تعمیر کئے تھے۔ لیکن جنگ خلیج نے ثابت کر دیا کہ یہ حدود کم از کم جب تک عربوں کے ہاتھ میں ہیں، بے مقصد ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ ایک عرب عورت اپنے گروہ کے اندر اپنا مسئلہ، اپنے حجاب کا مسئلہ، اٹھانے پر کیونکر اصرار کر سکتی ہے؟ اگر اس عورت کا قبیلہ بغداد کو بموں کا ہدف بنا لینے والی دنیا میں خود کو غیر محفوظ اور آسان شکار خیال کرنے لگے، عورت گروہ کے اندر صفوں کی نئی حد بندیوں پر بات چیت کے موقف پر کیونکر اڑ سکتی ہے؟

دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) میں بغداد کی بنیاد رکھی گئی تو یہ شہر مدینتہ السلام (شہر امن) کہلاتا اور زمین پر جنت کی یاد دلاتا تھا، جسے قرآن میں دارلسلام کا نام دیا گیا ہے۔ یہ نام اسے شہر کے بانی دوسرے عباسی خلیفہ المنصور نے دیا تھا۔ منصور نے یہ نام اپنے سکوں، وزنوں اور خطوں پر بھی استعمال کیا۔ شہر کو ناقابل شکست بنانے کے خیال سے معماروں نے اسے مدور شکل میں تعمیر کیا تھا۔ کیا انہیں علم تھا کہ ان سے قبل جنوبی عرب میں صبائیوں نے سیاست کا ایک معبد دائروی شکل میں تیار کیا تھا۔ حصاروں یعنی ''حدود'' کا تصور المنصور کی جنت میں بھی موجود تھا۔ بنیادی طور پر المنصور نے یہ حصار دفاعی نقطہ نظر سے تعمیر کروائے تھے لیکن اس کے پیش نظر یہ واحد مقصد نہیں تھا۔ المنصور کے نزدیک بھی ایک مثالی منظّم مسلم آبادی کی بنیاد حصاروں کے وجود کو تسلیم کر لینے پر تھی جو اختلافات کی شناخت اور پھر انہیں بے لگام ہونے سے روکنے میں معاونت کریں۔ اپنے تحفظ کو ہر ممکن حد تک یقینی بنانے کی غرض سے المنصور نے 157ھ/773ء میں حکم دیا کہ منڈی شہر سے باہر منتقل کر دی جائے تا کہ ناشکرے اور شرانگیز عوام الناس کو محل سے دور رکھا جا سکے۔ زمین پر جنت کا تصور منصور کے ذہن میں اسی طرح کا تھا۔

کیا تب سے معاملات میں کچھ تبدیلی آئی ہے؟ بارہ صدیوں کے بعد بھی ہم اپنی جو چھوٹی سے جنت روزانہ تعمیر کرتے ہیں کیا وہ مدینتہ السلام کے نمونے پر نہیں ہوتی؟ ہم میں سے کون ایسے شہر امن کا تصور کر سکتا ہے جو حصاروں، حدود فاصل، دیواروں، حجابوں اور ''حدود'' سے خالی ہو؟ ہم میں سے کون ہے جو بغیر حصاروں کے خود کو محفوظ خیال کرے۔ اس کے باوجود جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ بغداد سمیت دنیائے عرب کا سارے شہر ہمیں ہمارے تخیل کے حصاروں کے سوا کوئی حصار فراہم نہیں کر سکتے۔ ہمارے شہروں کے

گرد سے حصار نوچ لئے گئے ہیں اور ''حدود'' کے بغیر کوئی کیسے جیئے گا۔ ایسے کرہ ارض پر کسی کو احساس تحفظ کہاں نصیب ہوسکتا ہے جہاں بقول مسٹر بش ''آزادی کے تحفظ'' کے نام پر اعلیٰ درجہ کی تکنیکی مہارت اور معیار کے حامل تشدد کو کسی بھی وقت ظہور میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ نظام جتنا مہلک ہے اتنا ہی تیز رفتار بھی ہے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ گھر جسے تحفظ حاصل نہ ہو، عربی میں ''عریاں'' کہلاتا ہے، اس عورت کی طرح جو حجاب کے بغیر ہے۔ (القرآن 33/13)۔

بغیر حجاب، بے نقاب گلیوں میں گھومتی عورت کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ''حدود'' سے باہر اور معیارات و مسلمات سے ماورا ہونے کی کوشش میں ہے۔ اسے غیر محفوظ خیال کیا جاتا ہے۔ محض اس لئے نہیں کہ اس نے حرم کو، جو دراندازی سے محفوظ ممنوعہ علاقہ ہے، چھوڑا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس نے ایسے علاقہ میں آنے کی جسارت کی ہے جو اس کا نہیں ہے۔ ایک اور لفظ جسے واعظین اپنے خطبوں میں مرد و زن کے اختلاط سے مسلم شہر کو لاحق خطرات کی وضاحت میں برتتے ہیں، تبرج ہے۔ یہ لفظ بھی عسکری ذخیرہ الفاظ سے لیا گیا ہے - یہ لفظ ''برج'' سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ''گڑھی'' یا ''مورچہ'' ہے۔ لغت کے مطابق اسے یہ نام ''بلند اور فاصلے سے نظر آنے'' کے باعث دیا گیا ہے۔

ایک خود آگاہ عورت کا بے نقاب باہر نکل آنا جارحانہ عمل ہے۔ یعنی کھلے چہرے آزادانہ گھومنا دوسروں کے سامنے اپنی نمائش کرنا ہے اور یہ ترغیب کی وہ قسم ہے جس کے خلاف مردوں کے پاس کوئی دفاع نہیں ہے۔

شادی شدہ لوگوں کے لئے عربی میں ایک لفظ ''محصن'' موجود ہے، یعنی ''محفوظ لوگ''۔ یہ لوگ جنسی ترغیب سے محفوظ ہیں کیونکہ یہ ایک دوسرے کی جنسی تشفی کے ضامن ہیں۔ ''محصن'' قانونی تصور ہے اور شادی شدہ لوگوں کے زنا کاری جیسے تنازعات میں استعمال ہوتا ہے۔ اور شادی شدہ لوگوں کے لئے ناجائز جنسی تعلقات کی سزا زیادہ سخت مقرر کی گئی ہے۔ شادی شدہ مرد و زن کو جنسی ترغیب سے مامون کیا گیا ہے۔ ''محصنہ'' کو جنسی ترغیب سے یہ حفاظت اس تشفی کی صورت میسر ہے جو اسے شوہر فراہم کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک شہر کی حفاظت ''حصن'' (فصیل، شہر پناہ) کرتی ہے۔ اسے اپنے طالب اور خواہش مند مردوں کے خلاف فقط جسمانی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ترغیب سے بھی

تحفظ میسر ہے۔ اسے ترغیب سے تحفظ حاصل ہے جو اسے اللہ کی مقرر کردہ سرحدوں کی خلاف ورزی کی طرف بھی دھکیل سکتی ہے۔ شہر کے گرد حفاظتی فصیل کی طرح ''حدود'' بھی بے لگام جنسی خواہشات کے خلاف حصار ثابت ہوتی ہیں۔

تاہم ان حدود کا ایک وظیفہ اور بھی ہے جو حکمت عملی میں پہلے وظیفے سے کسی طرح کم اہم نہیں۔ دوسرے وظیفے کی تفہیم سے پتہ چلے گا کہ واعظین مرد و زن کے اختلاط پر اس قدر تردد کا اظہار کیوں کرتے ہیں۔ حدود کا دوسرا وظیفہ شہر کو انفرادیت سے بچانا ہے جو تمام مسائل اور مشکلات کی جڑ ہے۔ حدود فرد میں اس بنیادی نظم کو نقش کرتا ہے جس کے باعث گروہ کے گرد محیط شہر میں پرامن طور پر چلنا پھرنا ممکن رہتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس انفرادیت اور خواہشات کو بڑی احتیاط اور تردد سے حجاب کے پیچھے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ اس حجاب کے پیچھے جس کا اہتمام سرحدوں سے گھرے علاقے میں کیا گیا ہے۔ حجاب کو اس تناظر میں دیکھے بغیر حجاب کے غائب ہونے سے پیدا ہونے والے اضطراب کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اپنی اصل میں حجاب حدود کا استعارہ ہے یعنی ان حد بندیوں کا جو فاصل کا کردار ادا کرتے ہوئے نظم و ضبط پیدا کرتیں اور، پھر، اسے برقرار رکھتی ہیں۔ یہ حد بندیاں خصوصاً ان لوگوں کو غیر موثر بنانے کیلئے ہیں جو اسلام کی سرزمین یعنی دارالسلام کی تحدیدات کو ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں۔ باقی دنیا سے دارالسلام کی حفاظت کا کام یہ حد بندیاں اسی طرح کرتی ہیں۔

بہرحال اب حد بندیاں اور معیارات معدوم ہوتے نظر آتے ہیں۔ اندرونی مکان کا بیرون سے فرق کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ لاکھوں کی مقدار میں نوجوان مرد و زن عرب شہروں میں پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت کی عمر بیس اور تیس کے درمیان ہے۔ یہ غیر شادی شدہ ہیں اور انہیں شادی کی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ اپنا حسن اور کشش بے نقاب کئے خواتین نسبتاً آسان شکار ہیں کیونکہ وہ ''حصن'' کے بغیر ہیں۔ حد بندی کی خلاف ورزی تقریباً یقینی ہے کیونکہ قرآن کے مطابق، (4/28) ''مرد کمزور پیدا کیا گیا تھا۔'' واعظین کے نزدیک یہ کمزوری شہوت ہے جسے آغاز ہی سے ایک بڑا مسئلہ شمار کیا گیا ہے۔ مسلم مرد کو، جو پہلے ہی اتنے زیادہ اور ناقابل قیاس وقوعوں کا ممکنہ ہدف ہے اور جو اس

کائنات کی تماشا گاہ کا فقط بیگانہ وار مسافر ہے، ''لاحاصل خواہشات کے تعاقب'' سے کس طرح روکا جائے- حد بندیاں، حدود، حصن اور برج مختصر یہ کہ علامتی یا پتھر سے بنے یہ سب حفاظتی انتظامات دراصل دشمن کی حوصلہ شکنی کا سامان ہیں۔ ایک مسلم مرد کو ہر لحظہ چوکنا اور دفاع کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ اس کی ایک آنکھ حدود پر ہونی چاہیے جو اپنی اصل میں ایک عورت کو ملفوف کر دینے والا لبادہ ہے اور دوسری آنکھ سلطنت کی سرحدوں پر ہونی چاہیے۔ لیکن اگر دونوں فصیلیں ایک ساتھ گر جائیں تو کیا ہوگا؟ اب دشمن فقط زمین پر نہیں ہے بلکہ آسمانوں، ستاروں اور وقت پر اس کی حکومت ہے۔ ٹیلی ویژن کے ذریعے وہ کسی بھی شخص کی بیوی کو، خواہ نقاب پوش ہے یا بے نقاب، ترغیب دے سکتا ہے۔ اس وقت دنیا کے صاحبان قدرت کے نزدیک بم کبھی کبھار استعمال ہونے والے لوازم میں شامل ہیں۔ کروز میزائل کسی نہایت ہی فیصلہ کن موڑ پر استعمال ہوسکتا ہے؛ ان موقعوں کے لئے جب قربانی ناگزیر ہو جائے- ورنہ عموماً ہماری نشوونما فقط سافٹ ویئر پر کی جاتی ہے۔ اشتہاری پیغامات، نوعمروں کے گیت، روزمرہ کے استعمال میں آنے والی تکنیکی معلومات، ڈپلومہ کے حصول کے لئے مختلف کورس مختلف زبانوں کی تدریس اور ایک مخصوص طرز حیات پر عبور اسی سافٹ ویئر کے اجزاء ہیں۔

یہ بجا ہے کہ مکہ آج بھی دنیا کا مرکز ہے لیکن اس کی حفاظت کے لئے امریکی فضائیہ درکار ہے۔ لیکن یہ قوت کس کے خلاف دفاع میں کارگر ہوسکتی ہے۔ فکری انتشار اور کج روی کی وہ کونسی شکل ہے جس کے خلاف یہ ہماری حفاظت کرسکتی ہے؟ شہر میں موجود عورتوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ بگاڑ کس شکل میں ہے اور اسے رفع کرنے کو کونسی دعا پڑھی جائے۔ ایک شہر میں، جو حدوں کے بغیر ہے، کون کس سے خوفزدہ ہوسکتا ہے؟ اس شہر کی عورتوں کا کیا بنے گا جس کی ''حدود'' کی حفاظت غیر ملکیوں کے ہاتھ میں ہے۔

خدشات کا ایسا کونسا اور کتنی صحت کے ساتھ سدباب کیا جائے گا کہ عسکری نقشہ پوری طرح خواہشات کے نقشے پر منطبق ہو جائے؟ اور پھر اس کا کیا انتظام کیا جائے گا کہ یہ دونوں نقشے برقرار رہیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کی عکاسی بھی کریں تاکہ پہلے سے الیکٹرانی ایجنڈا کے چنگل میں پھنسے عرب مرد کو کمزور تر کیا جا سکے؟ اور پھر ان موہوم

MashalBooks.org

حد بندیوں کی قیمت کون ادا کرے گا؟ روایتاً توازن کو ازسرنو قائم کرنے کی رسوم میں عورتیں طے شدہ ہدف ہوتی تھیں۔ شہر میں جونہی گڑ بڑ کے آثار نظر آتے خلیفہ حکم جاری کرتا کہ عورتیں گھر کی چاردیواری تک محدود ہوکر رہ جائیں۔ کیا ہمیں، ایک مسلم شہر کی باسی عورتوں کو ہی اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی؟ ہم عورتیں جن کے جسم پر خواہش کی مدافعت میں قائم کی گئی حد بندیاں گود دی گئی ہیں؟ اصل مسئلہ سیاسی اور جنسی ہر دو اعتبار سے انفرادیت اور ذمہ داری کا ہے۔ آنے والے وقتوں میں امت کی حفاظت کے لئے جو رسوم ادا کی جائیں گی ان میں ایک بار پھر ہماری قربانی ہوگی اور ان کے ہاتھوں جو اصل مسئلہ سے گریزاں ہیں۔

جنگ خلیج کے بعد کے نئے شہر میں، جو مدینتہ السلام کے سوا کسی بھی شہر سے مشابہ ہوسکتا ہے، عورتوں کا کیا بنے گا۔ عورتوں کا جو پہلے سے ہی حد بندیاں عبور کر چکی ہیں، انہیں تسلیم کرنے سے انکاری ہیں اور، اسی لئے، خدشات کو جنم دیتی ہیں؟ ایسے بغداد کا تصور کیونکر ممکن ہے جہاں حفاظتی فصیل غائب ہو جانے کے بعد بھی تحفظ ممکن ہے؟

MashalBooks.org

باب1

اجنبی مغرب کا خوف

مغرب کے لئے عربی لفظ ''غرب'' سے دوخوفزدہ کر دینے والی اشیاء ''تاریکی'' اور ''ناقابل فہم'' بھی وابستہ ہیں۔ ''غرب'' ایک عجیب اور نامانوس اجنبی (غریب) سرزمین ہے۔ انسان اپنی فہم سے بالاتر اشیاء سے خوف کھاتا ہے۔ ''غرب'' وہ مقام ہے جہاں سورج ڈھلتا اور تاریکی منتظر رہتی ہے۔مغرب میں ہی تاریکی سورج کی راہ روکتی اور اسے نگل جاتی ہے۔ چنانچہ وہاں ہر طرح کی دہشت ناکی ممکن ہے۔مغرب ہی ہے جہاں ''غرابہ'' (عجبیت) نے ڈیرے ڈالے ہیں۔

ہمارے بچپن میں خالہ حلیمہ بچوں کو جمعہ کی رات کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ جب کہانی کے تسلسل میں ''اجنبی'' (غریب) کا کردار متعارف کرواتیں تو میرا کزن عزیز میری آستین کو جھٹکے سے کھینچتا اور میں مینا کی آستیں کو۔ سانس اچانک رک جاتی۔ ہمارے جبڑے باقلہ کے بھنے دانے کٹکٹانا بھول جاتے۔ ہمیں جبلی طور پر خبر تھی کہ اب ہماری عمر رسیدہ خالہ کے پرامن کمرے میں خوفناک واقعات وقوع پذیر ہونے کو ہیں۔غرب میں تاریکی ہر شئے کو نگل جاتی ہے اور بصارت کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ چیزوں کی حرکات وسکنات اور ممکنہ خطرات سے آگہی کے لئے دوسری حسیات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔غروب آفتاب کا مقام ہمیشہ سے بہت دور واقع ہوا ہے اور ہماری آبادیوں کا سا نہیں ہے۔ وہ رات کی سرزمین ہے۔عربی میں کوے کے لئے لفظ ''غراب'' ہے اور چونکہ اس کا رنگ عدم بصارت کا مماثل ہے، اس لئے کوا بدشگونی کی علامت سمجھ جاتا ہے۔

MashalBooks.org

ڈوبتے سورج کی سرزمین سے فاصلوں اور اس کے ساتھ ساتھ، ''کہیں اور کسی اور مقام'' کا تصور وابستہ ہے، چنانچہ الف لیلیٰ میں مغربی ہمیشہ جادو سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ ہر وہ کام کرتے ہیں جس کی اسلام میں ممانعت ہے۔ المغرب الاقصی (مغرب بعید) عربی ادب میں مراکش کے لئے مسلم نام ہے۔ عرب یعنی المشرق (چڑھتے سورج) کے باسیوں کے نزدیک ہمارا مشکوک ٹھہرنا ناگزیر تھا۔ عیسائیت کی سرحدوں کے قرب میں بسنے والے ہم لوگ سرحدی علاقوں کے باشندے خیال کئے جاتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ ہمارا نسلاً بربر ہونا ہے؟ ظاہر ہے کہ عرب فتوحات سے قبل ہماری زبان اور رسوم و رواج عربوں سے مختلف تھے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ طنجہ سپین سے فقط چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کی دریافت سے قبل بحرالکاہل دنیا کا آخری کنارہ خیال کیا جاتا تھا؟ فرق بہرحال موجود ہے۔ لیکن اس فرق کا عملی کردار اس وقت سامنے آئے گا جب عرب دنیا کو جمہوری بننے کے چیلنج کا سامنا ہوگا اور یہ اپنے ماضی کے کئی پہلوؤں کو بطور خزینہ کھوجنے کے عمل سے گزرے گا۔ جب کوئی فرانسیسی (Le Maghrebian) کہتا ہے، تو اس کا سیدھا سا مطلب ہوتا ہے، ''اجنبی''۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ ''عجیب'' اور ''اجنبی'' اپنے تصور میں دونوں مکانی ہیں۔ یہ سمجھا ہی نہیں گیا کہ حفاظت کس سے کی جانا ہے لیکن حد بندیاں کھڑی کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ عربوں کو جنگ خلیج نے کم از کم دو سبق ضرور دیئے ہیں؛ اول یہ کہ اب کوئی سرحد غرب سے ہماری حفاظت نہیں کر سکتی اور دوئم یہ کہ ایک خاص حد تک قابل تسخیر ہونا ہمارے اجزائے ترکیبی میں شامل ہے۔ چنانچہ کسی بھی طرح کی دہشت کا سامنا ہمارے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے- حالانکہ واحد ممکنہ عمل یہی ہونا چاہیے کہ اس دہشت کا سامنا کریں اور کوشش کریں کہ اسے سمجھ جائیں۔ ہم خوفزدہ رہتے رہتے تھک گئے ہیں۔ بالآخر شہر اور اس کے باسیوں نے کھیل کے قواعد بدلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مسخر ہونے سے بچنے کے لئے سمجھنا بہت ضروری ہے۔ یہ اجنبی غرب کا کام نہیں کہ ہمیں سمجھے- اب ہمیں مغرب کو سمجھنا ہوگا۔ اس کام کے لئے ہمارے پاس ذرائع اور وسائل کی کمی نہیں ہے۔ لاکھوں عرب ہیں جو مغربی زبانیں جانتے ہیں اور انکے خیالات، عزائم اور تمدن سے بخوبی واقف ہیں.....لاکھوں عرب مغرب میں مقیم ہیں جن میں ہم مغرب کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

MashalBooks.org

مغرب کے مقابل آنا:

اس وقت تک عرب اپنے بے مثل ہونے اور اپنی تحدیدات کے سحر میں گرفتار ہے.....اوراسی عمل نے انہیں منفرد بنائے رکھا۔لیکن اب وہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ غیر عرب کیا ہے۔مغرب اتنا مضبوط کیوں ہے۔ بلاشبہ یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ مغرب کی طاقت کا راز جمہوریت اور فرد اور اس کے حقوق کے تحفظ میں ہے۔ بغداد پر بمباری کے خلاف الجزائر، تونس اور رباط میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں کے شرکا جو نعرے لگا رہے تھے،ان آدرشوں کے مطالبے بھی ان میں شامل تھے۔ تین فروری1991ء کو مراکش میں احتجاج برائے امن کے شرکاء نعرے بلند کر رہے تھے:۔

''انہوں نے ہم سے نہیں پوچھا، انہوں نے ہم سے نہیں پوچھا۔
فیصلہ ہمیں کرنا ہے۔
انہوں نے ہم سے نہیں پوچھا، انہوں نے ہم سے نہیں پوچھا۔''

عوام جمہوریت کے لئے اپنی امنگ کا نعرہ لگاتے ہیں تو مورچہ بند اہل اقتدار خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔فطری امر ہے کہ فیصلہ سازی پر قابض یہ لوگ کوشش کریں گے کہ مغرب کے قدیم خوف کو جمہوریت کے تصور پر منطبق کریں۔ اسے ایسی اجنبی اور سحر انگیز بیٹی ثابت کریں جسے وجود میں لانے کی ذمہ داری جزواً مغرب پر ہے۔ یوں اسے ایک مغربی سماجی اختلال کے طور پر متشخص کریں اور پھر اجنبیت کے رتھ پر بٹھا کر دیس نکالا دے دیں۔ اس لائحہ عمل پر کروڑوں پیٹرو ڈالر خرچ کئے جا چکے ہیں۔ اگر یہ کتاب اس عمل میں استعمال ہونے والی چند تکنیکوں کی نشان دہی میں بھی کامیاب ہو جاتی ہے تو پیش نظر مقصد حاصل ہو جائے گا۔ ان تکنیکوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قدیم خدشات کو استعمال کرتے ہوئے وراثتی چلے آنے والے اضطرابوں کو جدید دور پر منطبق اور چسپاں کر دیا جائے۔ اس سارے عمل میں امید، تمنا، نوید مسرت اور تکلیف کے خوف جیسے محسوساتی عناصر استعمال میں لائے جاتے ہیں جن کے متعلق کوئی حتمی پیش گوئی قدرے مشکل ہے۔ یہ کام خاصا پیچیدہ ہے۔ مسجد اور سیٹلائیٹ، گناہ اور کوکا کولا، روحانی پسپائی اور بنک اکاؤنٹ جیسی اشیاء ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ ہم ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہیں جس میں انتہا کی مشرقی سوفسطائیت

پائی جاتی ہے اور جہاں سیدھے اور واضح جواب کے سوا کسی بھی چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔ سوائے سفید اور سیاہ کے آپ کسی بھی رنگ کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

لیکن ہمیں آگے بڑھنے میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ تمام ممکنہ راستوں اور طریقوں کا جائزہ لینے میں ضروری درکار وقت صرف کرنا ہوگا اور صبر سے کام لینا ہوگا۔ وگرنہ ممکن ہے کہ ہم وہاں سے بھی آگے جا نکلیں جہاں واضح اور نمایاں راستے ختم ہو جاتے ہیں۔ میں اس امر کی ضمانت نہیں دے سکتی کہ قاری اسلام اور جمہوریت کی کشمکش کے ہر پہلو سے اچھی طرح واقف ہو جائے گا۔ اس طرح کی یقین دہانیاں صرف واعظین، پیش امام اور مسلم جمہوریتوں کے صدر صاحبان کرا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ابہام اور قضیوں کی کھوج کا راستہ اختیار کیا جائے تو، بطور عورت، میں جانتی ہوں کہ قدیم قفل اور ان کی حفاظت میں رکھے خدشات دونوں سے باخبر ہوا جا سکتا ہے۔

مغرب خدشات یوں بنتا ہے جیسے مکڑی اپنا جالا۔ اس جالے کے تانے بانے میں کوئی بھی خیال اور نظریہ اس انداز میں بنا جاتا ہے کہ وہ خدشے کی بو دینے لگے اور ممنوعات میں سے ایک لگنے لگے- ایک لمحے کو دریا کی سطح پر تیرتی دو کشتیوں کا تصور کریں جو ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک مشرق اور دوسری مغرب ہے۔ دونوں پر بہت سے لوگ سوار ہیں۔ مشرق کی نگاہ اپنے سامنے پڑتی ہے اور اچانک اسے دوسری کشتی اپنے عکس کی صورت نظر آتی ہے۔ اس وقت مغربی کشتی صرف ایک آئینے کا کردار ادا کر رہی ہے۔ مشرق پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ مغرب مختلف ہے بلکہ اس لئے کہ وہ مشرق کو اپنے ایسے حصے کے طور پر نظر آ رہا ہے جسے وہ خود اپنے آپ سے چھپانا چاہتا ہے.....یعنی انفرادی ذمہ داری- بغیر کسی قاعدے قانون کے بننے والے صاحب اختیار رہنما کی بجائے فرد کی خودمختاری پر اصرار یعنی جمہوریت، واعظین اور اماموں کے دعووں کے برعکس، اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے دبا دیا جاتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو جمہوریت مسلم مشرق کے لئے اجنبی نہیں۔ یہ ایک عفونت زدہ زخم ہے جسے مشرق صدیوں سے اٹھائے پھرتا ہے۔ رائج نظام کی باغی قوتوں نے مخالفت کا علم بلند کیئے رکھا- صاحبان اقتدار نے بھی انہیں کچلنے اور نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مقتدرہ اور انفرادیت کے درمیان جاری موت کے اس رقص کو مسلمانوں سے چھپایا جاتا ہے، کیونکہ یہ خون میں یوں تربتر ہے کہ کوئی تہذیب اسے سطح پر نہ آنے دے گی۔ خون کے خشک نہ

ہونے والے دریاؤں میں نہائی اس روایت کو ہمارے اساتذہ نے ہم سے چھپایا اور ہم نے اپنے آپ سے اور ساتھ ہی ساتھ امت میں وحدت اور اتحاد کے فوائد پر رجز خوانی بھی جاری رکھی۔ مغرب ہمیں اسی لئے ڈراؤنا لگتا ہے کہ ہم مخالفین، کافروں اور مسلمانوں، دونوں، کی دبی لاشوں کو قبروں تک محدود رکھنے میں کامیاب نہیں رہتے۔ ان مقتولین میں مذہبی اور لامذہبی، دانشور اور گمنام معمار سبھی شامل تھے جنہیں خلفاء نے مروا دیا- پھر ان صوفیوں اور فلسفیوں سب کی لاشیں بھی اپنے نہاں خانوں سے نکل آتی ہیں جن کی مذمت کی گئی کہ یہ یونان، ہندوستان اور قدیم فارس سے درآمدہ نظریات کے پرچارک ہیں اور یوں واجب القتل ٹھہرائے گئے۔

جنگ خلیج کے دوران گلیوں میں نکل آنے والے ہجوم کی جمہوریت کے لئے نعرہ بازی کو مغربی ذرائع نے کاملتاً نظرانداز کر دیا۔ لیکن اپنی اہمیت میں یہ امر اس دوران وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں سے کسی سے کم تر نہ تھا اور یہ مستقبل میں علاقے کی حرکیات میں اہم کردار ادا کرے گا۔ لیکن مغرب اور اس کے کیمرے ایک اور حجاب کے پیچھے کچھ دوسرے خدشات پر مرکوز رہے کہ انہیں عرب دنیا میں قدامت پسندانہ جنونیت کے ظہور کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں خود تین جنوری کو عراق کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لئے ہونے والے مظاہرے میں شامل تھی۔ اس مظاہرے کو ایک یورپی ٹی وی نیٹ ورک، ٹی وی فائیو (T.V.5)، نے کور کیا۔ فرانسیسی مبصر نے اس ساری کاروائی کو غیر ملکیوں سے خوف زدگی میں مبتلا بنیاد پرستوں کی کاروائی کے طور پر پیش کیا جس میں فرانسیسی جھنڈا بھی جلایا گیا۔ یہ درست ہے کہ فرانسیسی جھنڈا جلایا گیا اور دوسرے مظاہرین کے ساتھ بنیاد پرست بھی شامل تھے لیکن مراکشی بائیں بازو کے تمام دھڑے اور میرے جیسے ہزاروں ایسے بھی شامل تھے جن کا کسی پارٹی یا گروہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کی نمائندگی اس مظاہرے میں نہ ہوئی ہو۔ یونیورسٹی پروفیسروں اور طالب علموں سے لے کر جوتا فروش علی تک سب اس میں شامل تھے۔ علی جو سوق السبت کا جوتا فروش ہے۔ میری طرح اس کا بھی کسی جماعت سے باضابطہ کوئی تعلق نہیں۔ علی اکثر ایک فقرہ دہراتا ہے، ''داڑھی والے ہوں یا کلین شیو مجھے کسی پر اعتبار نہیں۔''

خلیفہ خود اپنے روبرو:

آیئے دوبارہ دریا اور عکس اور خصوصاً اس مقام عجیب کو لوٹتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہے۔ یعنی دوبارہ اپنی ذات سے رجوع کرتے ہیں۔ الف لیلیٰ کی کہانیوں میں سے ایک میں حاکم وقت کو خود اپنے آپ سے ملنے کا ناقابل توضیح تجربہ ہوتا ہے۔ ایک دریا پر اپنا ثانی دیکھنا اس کے لئے احاطہ عقل سے باہر ایسا تجربہ تھا کہ اس سے زیادہ ناقابل فہم (عجب) وقوع پذیر نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ حکمران، ظاہر ہے، ہارون الرشید پانچواں عباسی خلیفہ تھا جس کی پرشکوہ زندگی اور حاکمانہ طمطراق اکثر اس کے معاصرین کے تخیل کو ہوا دیتا تھا۔

''بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رات خلیفہ مضطرب تھا اور اس کی بے چینی اپنے عروج پر تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے وزیر جعفر برمکی کو طلب کیا اور کہا، ''میرا دم گھٹا جاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ بغداد کی گلیوں میں پھر کر اپنی توجہ بٹاؤں۔'' برمکی نے جواب دیا، ''حکم کی تعمیل ہوگی۔'' وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، لباس فاخرہ ایک طرف پھینک، تاجروں کے لبادے زیب تن کئے اور گلیوں میں نکل گئے۔ یہ تین افراد خلیفہ، برمکی اور مسرور جلاد پھرتے پھراتے دجلہ پر جا نکلے جہاں ان کی ملاقات کشتی میں بیٹھے ایک بوڑھے ملاح سے ہوئی۔''

خلیفہ کے خدام نے ملاح کو حکم دیا کہ انہیں دریا کی سیر کروائے اور ساتھ ہی اسے پرکشش معاوضے کی پیش کش کی لیکن ملاح نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا:

''خلیفہ ہارون الرشید ہر رات اپنے شاہی بجرے میں سیر کو نکلتا ہے۔ ایک نقیب بہ آواز بلند پکارتا ساتھ ہوتا ہے کہ ''ہر فرد چھوٹا ہے یا بڑا، خاص ہے یا عام، خبردار رہے کہ اس رات جس کسی کی کشتی دریا پر پائی گئی اس کی گردن اڑا دی جائے گی یا پھر اسے اسی کشتی کے مستول پر پھانسی دے دی جائے گی۔''

ساتھ ہی بوڑھے نے دریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں ایک بجرا دکھایا جو ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔

''بجرے کے سامنے والے حصے میں ایک شخص طلائی مشعل لئے کھڑا نظر آیا۔ اسی طرح کے لباس میں ایک اور شخص ویسی ہی مشعل لئے دنبالے میں کھڑا تھا۔ دو سو سفید فام غلام بجرے پر دائیں بائیں قطاروں میں کھڑے تھے۔ درمیان میں سرخ سونے کا ایک تخت تھا

جس پر ایک وجیہہ شخص بیٹھا تھا۔ اس نے طلائی زری سے مزین سیاہ لبادہ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے سامنے ایک شخص اس انداز میں کھڑا تھا گویا وہ وزیر جعفر ہو۔ اس کے سر پر ایک خواجہ سرا جلاد مسرور کے انداز میں شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ اب خلیفہ نے تخت پر بیٹھے نوجوان کو غور سے دیکھا اور جعفر سے کہا، ''بلاشبہ یہ نوجوان خلافت کے لئے موزونیت میں رتی برابر کم نہیں۔''

اس نے کہا، ''اے جعفر، بخدا، میری عقل ماؤف ہوگئی ہے اور اس معاملے کو دیکھ کر سراپا حیرت ہوگیا ہوں۔'' خود اپنے آپ کو دیکھنے سے زیادہ اضطراب انگیز شائد کوئی عمل نہیں۔ اگر قسمت ہمیں اپنے ہی رو برو لے آئے تو ہمارا ردعمل کیا ہونا چاہیے؟ اس سے کم حیران کن واقعہ بھی عقل ماؤف کر دینے کو کافی ہے۔ سب سے زیادہ ناقابل فہم اجنبی وہ ''غریب'' ہے جس کا ٹھکانہ ہمارے اندر ہے۔ ہماری ذات کے پنہاں گوشوں میں گہری ترین تہوں میں مدفون ''غریب'' اس ''عجوبہ'' کے مقابلے میں باقی ہر چیز کا سراغ لگانا زیادہ آسان ہے۔

جمہوریت اقتدار کی اس کشتی کی سی ہے جو وقت کے دریا پر بہتی چلی آ رہی ہے اور ہمیں اس کا سامنا کرنے پر مجبور کرتی ہے جس پر ہم نے اپنے مسلم تمدن میں تا حال غور نہیں کیا۔ وہ چیز عقل (دلیل) اور رائے (ذاتی خیال یا فیصلہ) ہے۔ ابتداء ہی سے مسلمانوں نے اس سوال کو اٹھانے اور حل کرنے کی کوشش میں جانیں دی (اور لی) ہیں کہ آیا اطاعت کی جائے یا تعقل سے کام لیا جائے یعنی ایمان لایا جائے یا تفکر سے کام لیا جائے۔ یہ وثوق کہ فرد اور اس کی آزادی فقط مغرب کی ملکیت نہیں، ہماری روایت کے عین قلب کی مانند ہے لیکن اسے خون کے دریا میں ڈبو دیا گیا ہے۔ جمہوریت پر مصر مغرب ہمیں بجا طور پر ''غریب'' اجنبی لگتا ہے کیونکہ یہ وہ آئینہ ہے جو ہمیں ڈراتا ہے۔ ایک ایسا زخم جس پر پندرہ صدیاں بھی مرہم نہ رکھ سکیں۔ یعنی یہ زخم کہ شخصی رائے ہمیشہ انتشار کا باعث بنتی ہے۔ تلواروں کی دہشت اور سیاسی جبر و تشدد نے مسلمانوں کو ذمہ داری، آزادی فکر اور اندھی اطاعت جیسے معاملات پر بحث سے محترز رہنے پر مجبور کئے رکھا۔ یہ عمل اجتہاد کے دروازے بند ہونے کے ساتھ شروع ہوا۔

جمہوریت پر مسلسل بحث سے ''غرب'' ہماری آنکھوں کے سامنے ان لوگوں سے

بھرے سرابی جہاز لاتا ہے جن کے سرتن سے محض اس لئے جدا کر دیئے گئے کہ انہوں نے اطاعت سے انکار کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں اس سے قلم اور تلوار کے مابین جدوجہد بھی سطح پر آتی ہے۔ کشمکش اور جدوجہد کے فریقین میں ایک طرف انصاف کرنے کو ترستے قاضی، آزادہ روی کے طالب صوفی اورانفرادیت کے اظہار کو بے چین شاعر جبکہ دوسری طرف خلفاء اور ان کی شریعت تھی: وہ شریعت جو انہوں نے احکام الٰہی سے اپنے مطلق اقتدار کی تقویت کے لئے اخذ کی تھی۔

مغرب مسلمانوں کو امام مالک بن انس کو یاد کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ مالک ابن انسؒ مالکی فقہ کے بانی تھے جس پر ہم شمالی افریقہ کے مسلمان عمل پیرا ہیں۔ ان کا انتقال 179 ہجری میں خلیفہ کے حکم پر ہونے والے تشدد کے نتیجے میں ہوا۔ ''مدینہ کے گورنر نے انہیں طلب کیااور ایک فتویٰ کے سلسلے میں اپنے الفاظ واپس لینے پر مجبور کیا۔ ان کے انکار پر گورنر نے حکم دیا کہ انہیں برہنہ تن کوڑے لگائے جائیں۔ ان کا دایاں ہاتھ (جس میں قلم ہوتا تھا) اتنی بری طرح کوٹا گیا کہ کندھا اتر گیا۔ اس پر بھی امام مالک نے اپنے الفاظ واپس لینے سے انکارکیا۔ یہ واقعہ 147 ہجری کا ہے۔ یہ جاننا اتنا اہم نہیں کہ وہ کون سے الفاظ تھے جنہیں کالعدم قرار دلوانے کیلئے اس قدر تشدد کیا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ امام کے الفاظ ان کی رائے کا اظہار تھے۔ اس رائے کا جو خلیفہ کی رائے سے مختلف تھی۔ امام مالک اس زدوکوب سے سنبھل نہ سکے۔ باقی زندگی اپاہج کی سی گزاری لیکن تصنیف و تالیف اور جدوجہد جاری رکھی حتیٰ کہ انہی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسے۔

مغرب اپنے سیٹلائٹ اور ذرائع ابلاغ کے نیٹ ورک سے جو متواتر پروپیگنڈہ کرتا ہے وہ کچھ لوگوں کو خوفزدہ کر دیتا ہے، کیونکہ اس سے ماضی کے ان عظیم لوگوں کی فراموش شدہ یاد تازہ ہو جاتی ہے جنہیں آج کے لیڈر بھلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے ماضی کے وہ عظیم لوگ اس چھوٹی سی چیز کا دفاع کرنا چاہتے تھے: اس نازک سی اور لطیف چیز کا، جسے ''کرام'' (عزت نفس) کہتے ہیں۔ صوفی منصور ملاّج مصر تھا کہ انسانی وجود ''حق'' (سچائی) کا منبع ہے یعنی ہر فرد الوہی حسن کا عکاس ہے اور نتیجتاً اس کا صاحب اختیار ہونا لازم ہے۔ 390 ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں اسے بغداد میں زندہ جلا دیا گیا۔ اِس کا جرم اس نوعیت کے سوال اٹھانا تھا کہ اس دنیا کے خاکی اسی الوہیت سے اتنے بے گانہ کیوں ہیں۔

MashalBooks.org

اب چونکہ خلیفہ کے اقتدار کا انحصار ہی عام فرد کی الوہیت سے دوری اور خلیفہ سے اس کے قرب میں ہے، چنانچہ اگر ہر کوئی خدا کے اتنا ہی قریب ہو جائے جتنا وہ خود ہے تو اس کے وجود کا جواز باقی نہیں رہتا۔ حلاج کو اصرار تھا کہ خدا کی مخلوق ہونے کے حوالے سے انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسے تعقل سے نوازا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں اسی مہتم بالشان دانش کی عظمت اور قوت منعکس ہوتی ہے۔اس نے مقتدرہ یا حکومت کو چیلنج کرنے کا نہایت سیدھا، مختصر اور موثر راستہ اختیار کیا کہ خود اپنی ذات کو ہی حق قرار دیا۔ یعنی وہ مجسم حق ہے۔ اس کی انالحق (میں ہی سچ ہوں) صدا بالصحرا ثابت نہ ہوئی۔ حجاج اور اس کے خیالات بغداد کے گلی کوچوں میں موضوع بحث بنے۔ اس کی تعذیب کے دن بغداد کے کوچہ گرد بھی موقع پر موجود تھے۔ اسے سرعام تعذیب دی جانا تھی تاکہ ہر کوئی خلیفہ کے فیصلے کی حکمت جان لے۔ اگر عام انسان بھی خدا کی توجہ کے لائق اور خود کو کماحقہ سچائی پر خیال کرنے لگے تو خلیفہ اور امام اور ان کے برپا کردہ جور وستم کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ بہت سے لوگ تھے جن کے نزدیک حلاج کے الفاظ بامعنی تھے اور وہ ان سے متفق بھی تھے۔ چنانچہ خلیفہ کے لئے منصور کو سزا دینے کا فیصلہ کچھ آسان بھی نہ تھا۔ ''اسے ایک ہزار کوڑے لگے اور اس کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ جلادوں نے اس کے ہاتھ پاؤں قلم کر دیئے اور سر کاٹ کر ایک طرف رکھ لیا۔ باقی جسم کو آگ لگا دی۔ جب سوائے راکھ کے کچھ نہ بچا تو اسے دجلہ میں بہا دیا گیا۔ سر کو دجلہ کے پل پر لٹکا دیا گیا۔''

دوران تعذیب منصور پڑھتا رہا ''انا الحق''

یہ سب کون یاد رکھنا چاہتا ہے؟ کون گڑے مردے اکھاڑنا چاہتا ہے؟ اور کون چاہتا ہے کہ ماضی بعید میں طلوع آفتاب کے ملول اور مل گجے اجالے پر نظر ڈالے جب انفرادیت اور وقار کے لئے اٹھنے والی آواز کو خون میں نہلا دیا جاتا ہے۔ ہم اپنے اندر کے ناسوروں سے کس طرح بھاگ سکتے ہیں جنہیں ہم مدتوں سے فراموش خیال کرنے کی خودفریبی میں مبتلا ہیں؟ اگر ہم اپنے ماضی کی درست طور پر تفہیم کر سکیں تو مغرب اور اس کی جمہوریت کے لئے ہماری بیگانگی کم ہو جائے گی۔ کیا غرب مطلق العنان آمروں اور ان کی جگہ سنبھالنے کو منتظر بیٹھے چھوٹے آمروں کو اس لئے خوفزدہ کرتا ہے کہ عام لوگ عربوں کی ٹوٹی پھوٹی انفرادیت کی تلاش دوبارہ شروع نہ کر دیں۔

MashalBooks.org

انسانی حقوق کا عالمگیر اعلان عوام الناس کو خوفزدہ نہیں کرتا کیونکہ اس کی رو سے ''حکومتی اختیارات کی بنیاد لوگوں کی رضامندی'' پر ہوگی اور یہ کہ ''ہر کسی کو اپنے ملکی حکومت میں حصہ لینے کا حق حاصل ہوگا۔'' اس کے خوفزدہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے خوارج کی یاد تازہ ہوتی ہے یعنی اسلامی تاریخ کے آغاز میں نمودار ہونے والے اس فرقے کی جسے ہمارے ذہنوں پر دہشت گردی اور طوائف الملوکی کے ہم معنی بنا کر نقش کر دیا گیا ہے۔

صوفیاء کے ساتھ ساتھ، جنہوں نے اندھی اطاعت کے مسترد کئے جانے کی ضرورت کو باقاعدہ ایک فلسفے کی شکل دی، ایک اور تحریک اٹھی۔ انہوں نے خود کو ایسے اماموں کے قتل کے لئے وقف کر دیا تھا جو ان کے خیال میں راہ حق پر نہیں تھے۔ یوں اسلام میں مقتدرہ کے ساتھ اختلاف کے حوالے سے اوائل ہی میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ کا رجحان دانشورانہ تھا۔ اس میں انسانیت اور دنیا کی فلسفیانہ اساس پر بحث کا رجحان پایا جاتا تھا۔ جبکہ دوسرے رجحان کے علمبرداروں نے طاقت کا سہارا لیا اور سیاسی چیلنج کو پر تشدد بنا دیا۔ پہلی روایت فلاسفہ کی تھی۔ اسی رجحان کے حامیوں میں صوفیاء بھی شامل تھے۔ اس رجحان کی علمی اساس میں یونانی، ہندوستانی اور قدیم ایرانی تمدنوں سے خوشہ چینی بھی شامل تھی۔

اہل خوارج نے پرامن طور پر امیر اور امت کے درمیان تعلق تبدیل کرنے کا خواب نہیں دیکھا بلکہ ان کا خیال تھا کہ محض امام سے بغاوت اور بعض صورتوں میں اسے قتل کر دینے سے معاملات تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ اہل فلاسفہ اور صوفیوں نے انسان اور الوہیت کی ماہیئت پر غور کرتے ہوئے عمیق خیالات پیش کئے اور ذاتی رائے اور تعقل کے مقام کا سوال اٹھایا۔ کیفیتی اعتبار سے ان کا کام روشن خیالی کے داعی مغربی فلسفیوں کا سا تھا۔ کیونکہ ہر دو روایات نے ایک ہی طرح کے سوالات اٹھائے۔ انہی خیالات کے بارے میں آج ہمیں بتایا جاتا ہے کہ یہ مغرب سے درآمدہ ہیں۔ ان مسائل کے حل پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔ ایک مسئلہ طاقت (یعنی امت مسلمہ کے رہنما امام کی تابعداری) اور دوسرا انفرادی آزادی کا ہے۔ مسلمانوں نے ان مسائل کو نظری سطح پر حل کیا اور نہ ہی عملی سطح پر۔ نظری سطح پر ان مسائل کے حل میں بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اس طرح کے مباحث کو خلیفہ ہمیشہ جبراً بند کروا دیتا تھا اور جہاں تک عملی سطح کا تعلق ہے تو نمائندگی کا تصور کبھی عملی شکل میں سامنے نہیں آیا حالانکہ امت کی طرف سے امام کے انتخاب کا تصور سنی اسلام میں گہری جڑیں رکھتا

ہے۔

لیکن ''غریب'' ابھی تک ''عجیب'' ہے۔ ناشناسا اور اجنبی ہمیشہ مسحور کن ہوتا ہے اور جیسا کہ الف لیلیٰ میں ملتا ہے، کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ جب خلاف معمول کا سامنا ہو تو اس کا طرز عمل کیسا ہوگا۔ کوئی چیز جو آپ کو مسحور کرتی ہے لیکن احاطہ ادراک سے باہر رہتی ہے، بالآخر آپ کو تباہ کر دیتی ہے۔ بجا ہے کہ مغربی جمہوریت اپنے اندر تخم حیات لئے نظر آتی ہے لیکن ہماری تاریخ میں اس کے ساتھ موت بھی وابستہ ہے۔ لیکن کس کی موت؟ مطلق العنان ٹیکنو کریٹ یا بے اختیار دانشوروں کی موت؟ اس سارے نظام کی محافظ نوکر شاہی کی موت یا چیلنج بن کر سامنے آنے والے عوام کی موت؟

MashalBooks.org

باب2

امام کا خوف

امت مسلمہ کوراستی پر رکھنے والایعنی امام.....جس کی دیومالائی حدود کو چھوتی شخصیت نے ستر کی دہائی کے آخر میں آیت اللہ خمینی کے ایران میں داخل ہونے کے وقت سے مغربی ٹیلی ویژن کے ناظرین کو مسحور کررکھا ہے.....مسلم سیاسی نظریے میں کوئی مضبوط شخص نہیں ہے۔ اوائل اسلام سے ہی اس کی حیثیت ایسی رہی کہ اسے چیلنج کیا جاسکتا تھا اور وہ قابل تسخیر بھی تھا۔ یہ عوامل بیشتر اوقات امام کے قتل پر منتج ہوئے۔ اسلام میں ایک مثالی رہنما کی خصوصیات اور عامتہ الناس اور اس مثالی رہنما کے درمیان تعلق کو نظریہ امامت میں بیان کیا گیا ہے۔ امامت کا ایک اہم عنصر اس کا قابل تسخیر ہونا تھا۔ لیکن جدید اسلام میں امامت کے نظریے سے یہی عنصر غائب ہو چکا ہے اور سیاستدانوں نے اسے اپنی ذاتی آمرانہ خواہشات کی تکمیل میں انتہائی ڈھٹائی سے استعمال کیا ہے۔

قطع نظر اس کے کہ مذکورہ بالا حکمران تسلیم شدہ ہیں یا وہ لوگ ہیں جو انہیں کو چیلنج کرتے ہوئے ان کی جگہ لینے کے خواہش مند اور روحانی ضروریات پوری کرنے کا دعوی بھی کرتے ہیں، اسلام کواستعمال کرنے والے یہ سیاستدان تسلیم کر چکے ہیں کہ آمریت کا ننگا اقرار ممکن نہیں ۔ ایسے رہنما کو کون ووٹ دے گا جو کسی مکان کی چھت سے اپنی تقریر میں اعلان کرتا ہے کہ وہ افراد کا حق فیصلہ سازی غصب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ان کا دعویٰ ہوتا ہے کہ حکومت سنبھال لینے کی صورت میں وہ امام کا سا طرز عمل اختیار کرے گا۔ یوں جدید سیاستدان پندرہ صدیوں کی امیدوں کو حیات نو دیتے ہیں۔ ایک امام اسی لئے عادل ہے کہ وہ امت مسلمہ کی ضروریات پر ہمہ تن گوش اور عوام الناس کی فلاح میں سرگرم ہے۔

MashalBooks.org

لیکن اگر مسلم سیاسی نظریے کے حوالے سے دیکھا جائے تو امام کے عادل ہونے میں ہی اس کا قابل تسخیر اور قابل مواخذہ ہونا مضمر ہے۔ دور جدید کے دو مظاہر ایسے ہیں جنہوں نے مل کر امام کے قابل تسخیر ہونے کا عنصر منظر عام سے غائب کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک مظہر اجتماعی مسلم یادداشت میں سے تعقل کی روایت کی علیحدگی اور دوسرا جدید ذرائع ابلاغ ہے۔ ان دو عوامل نے مل کر ایک عفریت نما پیکر کو جنم دیا ہے؛ ناقابل چیلنج، مختار کل اور ناقابل احتساب- یہ امام ذرائع ابلاغ کا پیدا کردہ ہے۔

میڈیا امام اور روایتی امام:

ان دو قسموں کے اماموں میں فرق کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ایک امام جدید ذرائع ابلاغ کی پیداوار ہے اور وہ اپنی تخلیق کے لئے میڈیا کے استعمال کا قائل اور ماہر ہے۔ اس کے بالمقابل پیغمبر ﷺ کی روایت کا امام ہے یعنی قرآن کا بیان کردہ مثالی امام جس کی خصوصیات اور اوصاف کو بعدازاں امامت اور خلافت کے ادارے کی صورت مسلم سیاسی نظریے میں باقاعدہ منضبط کر دیا گیا۔ یہ امام امت مسلمہ کا صاحب بصیرت رہنما ہے۔ بلاشبہ ان دو اماموں میں خاصا فرق ہے۔ میڈیا امام مضبوط جبکہ روایتی امام قابل تسخیر ہے۔ میڈیا امام کو ہم ٹی وی سکرین پر اعلان کرتے دیکھتے ہیں کہ اس کے اختیارات خدا کی طرف سے تفویض کردہ ہیں۔ روایتی امام نے بھی یہی کیا تھا لیکن ٹی وی کی ایجاد سے پہلے۔ یہ فرق بہت اہم ہے کیونکہ ٹیلی ویژن پیچیدگیاں نہیں دکھا سکتا۔ ٹی وی جزئیات میں کسی ایک کا انتخاب کرتا ہے اور اسے سکرین پر پھیلا کر بہت بڑا کر دیتا ہے؛ اتنا بڑا کہ وہ پوری سکرین پر چھا جاتی ہے۔ یہ تکنیکی اثر ہمارے مثالی امام کیلئے تباہ کن ہے۔ اس کے قابل تسخیر ہونے کا عنصر کسی ایک یا دوسری وجہ سے ختم ہو چکا ہے۔ لیکن اس حقیت کا اطلاق اس امر کا محتاج ہے کہ امام اور اس کے مخالفین کو ٹی وی پر وقت اور آزادی اظہار یکساں قواعد کے تحت نہ دی جائے۔ تاہم کوئی امام ایسا نہیں جس کا کوئی مخالف نہ ہو۔ اس حقیقت کو نظرانداز کرنا تاش پھینٹنے کے مترادف ہوگا اور سیاست میں یہ عمل ہمیشہ صاحب اقتدار کی معاونت کرتا ہے۔ یہی حقیقت اس ضرورت کو ناگزیر بناتی ہے کہ ہم عہد حاضر کے اپنے جدید سیزروں کو ان کے قابل تسخیر ہونے کی صفت لوٹا دیں جو وہ کھو چکے ہیں۔ اگر ہمیں آج کی دنیا میں کارگر اور

فعال خیالات و احساسات کو سمجھنا ہے تو امام کو قابل تسخیر ہونے کی صفت سے متصف کرنا ضروری ہے اور خیال رکھنا ہوگا کہ عصری احساسات میں سے اہم ترین رواداری ہے۔

لفظ ''امام'' اور ''خلیفہ'' دونوں سے مراد مسلمانوں کے رہنما ہیں۔فرق یہ ہے کہ امام کی بنیاد مکانیت کے تصور پر ہے جبکہ خلیفہ دنیاوی معاملات سے زیادہ وابستہ ہے۔ امام وہ شخص ہے جس کی اقتداء میں باقی امت ہے، اس کا مقام رہنمائی کا ہے جبکہ خلیفہ حضرت محمد ﷺ کا بطور حکمران جانشیں ہے۔ بلاشبہ امام کی اصطلاح بسااوقات نماز کی امامت کروانے والے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے جبکہ خلیفہ کے ذمے نماز کی امامت کے علاوہ انصاف اور فوجی مہمات کی رہنمائی جیسے فرائض کی ادئیگی بھی شامل ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ خلیفہ بیک وقت امام بھی ہوتا ہے کہ وہ نماز کی امامت کرواتا ہے لیکن امام کا خلیفہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ وہ ایک جزو وقتی ملازم بھی ہوسکتا ہے جو قریبی مسجد میں نماز پڑھاتا ہے ۔ ابتداء میں دونوں کام باہم منسلک تھے لیکن جلد ہی دونوں وظائف الگ الگ کر دیئے گئے۔ خلیفہ نے نماز کی امامت کا کام کسی اور شخص کو تفویض کر دیا۔لیکن اس کے باوجود جب سیاسی حوالے سے رہنمائی کی بات کی جاتی ہے تو ''امام'' اور خلیفہ ہم معنی ہو جاتے ہیں۔

برنارڈ لوئس نے بالکل درست نشان دہی کی ہے کہ آیت اللہ کا عہدہ انیسویں صدی کی اختراع ہے جبکہ خمینی عہد حکومت بیسویں صدی کی۔ دوران جلاوطنی فرانس سے بھیجی جانے والی آڈیو کیسٹوں کی وساطت سے برسراقتدار آنے والا شخص ازمنہ وسطیٰ کی فرسودہ روایات کا محافظ نہیں ہوسکتا ۔ یہ درست ہے کہ ہم اسلام کے ازمنہ وسطی کے متعلق بہت زیادہ صحت کے ساتھ بہت کچھ نہیں جانتے لیکن اتنا بہرحال یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آئمہ کو ٹیپ ریکارڈر کی سہولت میسر نہیں تھی۔ ہم یہ اندازہ بھی خاصی صحت سے کر سکتے ہیں کہ ہماری بے خبری محض اتفاقیہ ہونے سے کہیں آگے کی بات ہے۔اس طرح کی بے خبری کا پروان چڑھایا جانا درحقیقت ایک کلیدی سیاسی عمل ہے جو نہایت صحت سے بنائے گئے منصوبے کا عکاس ہے۔ اپنی تاریخ کے گہرے شعور کی عدم موجودگی میں ہم کس طرح جانچ سکیں گے کہ سیاستدان جو ''مسلم تشخص'' بیچ رہے ہیں، ان میں سے کونسا مستند ہے؟

بنیاد پرست ریاستیں، جو اپنے سیاسی طور پر جائز ہونے کی بنیاد ماضی پر رکھتی ہیں، نہ

صرف یہ کہ اسلامی تاریخ کو درست تناظر میں نہ سمجھنے پر تلی ہوئی ہیں بلکہ وہ وضاحت میں لکھی گئی تاریخ کی کتابوں کو سنسر بھی کرتی ہیں۔ ان مسلم ممالک میں بھی جہاں حکومتیں تیل کی دولت سے مالا مال ہیں، عجائب گھروں، دستاویزات کے ذخائر یا آثار قدیمہ کی تلاش و حفاظت جیسے کاموں پر کوئی سنجیدہ توجہ نہیں دی جاتی۔ اسلامی ممالک کے نوادراتی ذخائرہ میں، خواہ وہ لاہور میں ہوں یا رباط میں، سب سے عبرت انگیز چیز وہ گرد ہے جو ان ذخائر میں دستیاب قلیل چیزوں پر جمی ملتی ہے۔ وہاں فرائض پر مامور کسٹوڈین کی خانقاہی خاموشی اس پر مستزاد ہے۔ آپ کو انہیں زحمت دیتے ہوئے باقاعدہ معذرت طلب کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے.....اور اگر آپ کو کسی چیز کی فوٹو کاپی یا نقل مطلوب ہے تو اتنے زیادہ اور ناقابل یقین نوکرشاہانہ مراحل سے گزارا جاتا ہے کہ واپس گھر پہنچ کر ماضی کے تصورات میں کھو جانے ہی میں عافیت محسوس ہونے لگتی ہے۔

وحدانیت پر مبنی مذاہب میں سے اسلام واحد مذہب ہے جس کے ٹھیکیداروں نے علمی جستجو کی ممانعت کر دی ہے۔ یا کم از کم ایک باقاعدہ نظام کے ذریعہ اس عمل کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ واضح طور پر یہی ہے کہ تعقلی تجزیہ ایک آمر کے مقاصد سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں کی جو تاریخ ہمارے پاس ہے، وزیروں کے حکم سے مرتب کردہ ہے جن کے پیش نظر محض خلیفہ کی محلاتی ضروریات تھیں۔ اسی طرح کی تاریخ میں امام کے متعلق لوگوں کے خیالات و افکار سے دامن بچا کر چلنا ایک ترجیحی عمل تھا۔ اس طرح کی تاریخ نے جن چیزوں کو دفن کرنے کی کوشش کی ان میں سے ایک امام کا خوف بھی ہے۔ محض اس خوف کو نہیں جسے امام نے ہوا دی بلکہ اس خوف کو بھی جو وہ ہمہ وقت ذات کی گہرائیوں میں بہت اندر ساتھ لئے پھرتا تھا۔ اپنے اس طرز عمل میں وہ ایک سنگدل عاشق کا سا ہے۔

دنیا میں امام کے سے نازک اختیارا و اقتدار کی مثال اور کہیں نہیں ملتی - اس کی اطاعت واجب ہے مگر صرف اس وقت تک جب تک وہ عادل ہے۔ قرآن میں امام سے مراد کہیں ایک انسان اور کہیں ''امام مبین'' یعنی (کھلا اور واضح راستہ) ہے۔ امام عادل وہ شخص ہے جو پہلے سے طے شدہ راستہ اختیار کرتا ہے اور امت مسلمہ اس کی اقتداء میں ہر دو جہانوں میں مسرت و کامیابی حاصل کرتی ہے پہلے سے طے شدہ اس لائحہ عمل کی اہمیت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک امام معتبر اور قابل اعتماد ہوجاتا ہے۔ محض مسلمانوں کے ساتھ درشتگی

سے پیش آنے کا استحقاق حاصل کرنے کی غرض سے خود کو امام کا لقب دینے والا سیاستدان امام عادل کے تصور سے مطابقت نہیں رکھتا- بہت کم امام مسلمانوں کی اس مسرت تک رہنمائی میں کامیاب ہو پائے اور بہت سے اسی وجہ سے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ انہیں غیر مطمئن پیروکاروں نے قتل کر دیا۔ اسلام میں اختیار، صاحب اختیار اور عوام کے درمیان تعلق کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ مکانی ہیں۔ یہ نکتہ کئی مقامات پر سامنے آئے گا کیونکہ جدید مغربی انداز کی جمہورت کے قیام کے خیال سے جنم لینے والے اضطراب کا مغز یہی ہے۔جمہوریت میں پہلے سے طے کردہ ایسا کوئی رستہ موجود نہیں جسے اختیار کرنا لازم ہو۔ راستہ کے پہلے سے طے شدہ ہونے کی وجہ سے انفرادی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔

عورتوں کی طرح امام پر بھی حدود کی پابندی عائد ہوتی ہے کہ اس کے افعال و اعمال کسی صورت اللہ کی متعین کردہ حدود سے متجاوز نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ فرقوں کے نزدیک کسی امام کے افعال حدود اللہ سے تجاوز کرنے لگیں تو اس کا قتل واجب ہوجاتا ہے۔ لیکن جدید ذرائع ابلاغ نے امام کا جو ہیولیٰ بنایا ہے اس میں وہ اتنا قابل تسخیر اور کمزور نظر نہیں آتا۔ اس جدید امام کی تصویر بنانے کے لئے دو ضروریات کو ایک دوسرے پر منطبق کر دیا گیا ہے۔ پہلی ضرورت مغربی صحافی کی ہے جو اپنے مخاطب کو ہر ممکن تیزی سے ایک غیر مبہم اور سادہ سی تصویر دکھانا چاہتا ہے کہ دنیا کے اس ہمارے حصے میں کیا وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ دوسری ضرورت اس سیاسی رہنما کی ہے جو امام ہونے کا دعویدار ہے اور چاہتا ہے کہ کیمرے کے سامنے انٹرویو دے جو عالمگیر پیمانے پر نشر بھی ہو۔ اس کے پاس ایک واضح اور طے شدہ پیغام ہے کہ مسلمانوں پر اس کی اطاعت لازم ہے۔ اگر ان دو ضروریات کو ایک دوسرے سے متمیز نہ کیا جائے تو ہم ذرائع ابلاغ کے تشکیل شدہ اور بلاتردد مشتہر کردہ اسلام کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ اس ''مجنونانہ اور جابرانہ'' اسلام کو پیش کرتے ہوئے بہت سے اہم تاریخی اور علامتی میکانزم نظرانداز کر دیئے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر صورتوں میں ذرائع ابلاغ کے نظرانداز کردہ میکانزم کو یہاں متعارف کروانے سے میرا مقصد اسلام کا قدرے مختلف تصور پیش کرنا ہے۔ ایسا تصور جس میں چھوٹی چھوٹی جزئیات اور تفاصیل بہت اہم ہیں کیونکہ انہیں جانے بغیر تاریخ کے پیچ وخم درست اور مفصل طور پر واضح نہیں ہو پاتے۔

آج اسلام کو متعصّبانہ جبر کا ایسا قلعہ خیال کیا جاتا ہے جس میں تعقل و استدلال کے

لئے کوئی جگہ نہیں اور جس میں غیر فعال اور مجہول مسلمان بلاسوچے سمجھے امام کی تقلید کرتے چلے جاتے ہیں۔ کم از کم دو وجوہ کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے متعلق اس متعصّبانہ رائے سے زیادہ غلط اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایک تو یہ کہ مسلم رہنماؤں کی تاریخ ایک کے بعد دوسرے سیاسی قتل کی افسوسناک داستان ہے۔ اہل ایمان میں سے ہی غیر مطمئن اٹھتے اورامام کو قتل کر دیتے۔ میں اس رجحان کو ''باغی اسلام کی روایت' کہتی ہوں اور یہ لمحاتی جمہوریت یا ''عوامی طاقت'' کا اظہار ہے جس کی بجاآوری میں اس امر پر کچھ زیادہ غور وفکر نہیں کیا جاتا تھا کہ بنیادی تبدیلیاں کس طرح لائی جانا ہیں۔ رہنما کی شخصیت پر مرتکز انقلاب کی اس باغیانہ روایت کے ساتھ ساتھ ایک اور طرح کی عدم اطاعت بھی موجود تھی جسے تعقل کی روایت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بغاوت کی یہ روایت سیاسی عمل میں عقل (اور ذاتی رائے) کو متعارف کروانے سے عبارت تھی۔

اس تعقل پسند روایت کے اپنے محافظ اور اپنے شہید تھے۔ ان میں سے معروف تر معتزلہ تھے جنہوں نے قدر کا مسئلہ اٹھایا کہ آیا فرد اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہے یا نہیں۔ اس روایت میں عقل کو خدا کا انسانیت کے لئے قیمتی تحفہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس نقطہ نظر کے حامی ہماری سیاست کی پیچیدگیوں اور گھٹیاپن کے پس منظر میں لو دیتے نظر آتے ہیں۔ اہل اقتدار نے انہیں فلاسفہ قرار دیتے ہوئے متواتر ان کے خلاف تلوار اٹھائے رکھی۔ معتزلہ کی مذمت میں کہا جاتا کہ وہ قدیم یونانی فلسفہ سے ماخوذ بشرنوازمی کی اسلام میں ملاوٹ کر رہے ہیں۔

مسلم تاریخ کی ابتدائی صدیوں ہی میں معتزلہ کوامت سے خارج کر دیا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ وہ دشمنانہ نظریات کی اشاعت کے عمل میں غیرملکیوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ انہیں ملحد قرار دیا گیا کہ وہ دین میں کجی کو فروغ دے رہے ہیں۔ معتزلہ سے شروع ہونے والے بشریت نوازی کے جذبے کی مذمت کے پس منظر کے طور پر ان کے خیالات کو غیر ممالک سے درآمدشدہ قرار دیا گیا۔ صدیوں جاری رہنے والا یہ سلسلہ آج بھی موجود ہے۔ صرف اتنا ہے کہ پہلے کہا جاتا تھا کہ یونانی فلسفے نے راہ پائی ہے اور آج پورے یورپ کی مذمت کی جاتی ہے کہ یہ مستعار خیالات اور ماخوذ ثقافتی درآمد کا ماخذ ہے لیکن اصول وہی پرانا ہے۔

MashalBooks.org

پندرہ صدیوں تک سیاستدانوں نے دانشوروں کے افکار کی قطع و برید کے عمل میں ان کی زبان بندی کئے رکھی ۔ اپنے اس عمل میں دانشوروں کی بشریت نواز روایت کے امتزاجی عمل کو سیاست دان پلیدگی اور ملاوٹ کا نام دیتے رہے۔ حالانکہ یہی امتزاجی عمل تہذیب کی قوت محرکہ ہے یعنی تہذیب کی وہ صلاحیت اور قوت جس کے بغیر وہ نئے خیالات، تصورات اور بلند فکری کے کارہائے نمایاں کو جذب کر سکتی ہے اور نہ ہی استعمال۔ جابر اور مطلق العنان سیاستدانوں کے ہاتھوں تعقل اور بشریت نوازی کی روایات کا مسترد کیا جانا اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسی روایت سرے سے موجود نہیں تھی۔ بازو کا کٹ کر جسم سے الگ ہو جانا اور اس کا پیدائشی طور پر موجود نہ ہونا ایک سے معنی نہیں رکھتا۔ قطع اعضاء کے عمل سے گزرنے والے افراد کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قطع شدہ اعضاء افراد کے ذہنوں میں بہرحال موجود رہتے ہیں۔ تعقل ہماری ذات کا ایک ایسا حصہ ہے کہ جتنا دبایا جاتا ہے اتنی ہی شدت سے ہم اس کے اسیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بات آگے بڑھانے سے پہلے ہم باغیانہ روایت کا جائزہ لیں گے۔

باغیانہ روایت.....خارجی:

ایک مسلم امام سے زیادہ کمزور سیاسی رہنما کا تصور مشکل ہے۔ مثالی امام ایسا منکسرالمزاج شخص ہے جو خوف خدا سے لرزتا اور اپنے محکوموں سے ڈرتا ہے کہ مبادا کوئی غیرمنصفانہ فیصلہ سرزد ہونے سے جہنم مقدر نہ بن جائے۔ آپے سے باہر مومن سے کچھ بھی سرزد ہو جانا عین متوقع ہے اور نظریاتی طور پر ایک غیرعادل امام سے بغاوت مسلمان کے فرائض میں شامل ہے اور بعض فرقے تو اس کو فوراً قتل کر دینا عین واجب قرار دیتے تھے۔ بغاوت کی اس روایت کو مسلم معاشروں کی حد تک قدیم ترین اور اولین خیال کیا جاتا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد چند دہائیوں کے اندر اندر خارجیوں نے سوال اٹھایا کہ آیا کیا اس امام کی اطاعت لازم ہے جو آپ کے حقوق کی حفاظت نہیں کرتا؟ بالفاظ دیگر ان کا سوال یہ تھا کہ اندھی تقلید کرتے چلے جانا چاہیے یا اپنی قوت فکر کو استعمال کرنا چاہیے؟ خارجیوں کا جواب تھا کہ اس صورت میں اطاعت آپ پر فرض نہیں رہتی۔ آپ اطاعت سے باہر جا سکتے ہیں (خارج ہو سکتے ہیں)۔ اہل خوارج نے یہ لقب اپنے لئے خود چنا تھا

اور بعدازاں عدم اطمینان کی مظہر تمام تحریکوں سے چسپاں ہوکر رہ گیا۔ شہرستانی وضاحت کرتے ہیں کہ کوئی بھی شخص جو امت کے منتخب کردہ امام عادل کی اطاعت سے باہر جاتا ہے، خارجی کہلاتا ہے۔ خارجیوں کا نعرہ تھا، ''لاحکم الا اللہ'' (اقتدار کا سزاوار صرف اللہ ہے)۔ یہ نعرہ پہلی بار چوتھے خلیفہ یعنی عثمانؓ کے عہد خلافت میں لگایا گیا اور بالآخر (661ء) میں ان کے بھیجے ہوئے قاتلوں کے ہاتھوں آپ کی شہادت پر منتج ہوا۔ یہی نعرہ سینکڑوں اماموں اور مسلم رہنماؤں کی مذمت میں استعمال ہو چکا ہے جن میں سے آخری مصر کا انور السادات تھا۔ مسلمانوں میں سیاسی اضطراب کا اظہار رہنما کی مذمت کی صورت ہوتا ہے۔ بغاوت کی یہی روایت ہے جو اختلاف رائے کو دہشت گردی سے منسلک کرتی ہے۔

خارجیوں نے، جن سے مسلمان عامتہ الناس صدیوں خوفزدہ رہے، دہشت گردی کا استعمال بے قاعدہ حکومتوں کے خلاف ردعمل کے طور پر شروع کیا۔ چونکہ وہ امام علیؓ سے متفق نہیں تھے، انہوں نے ان کے قتل کا فیصلہ کر لیا۔ چالیس ہجری (660عیسوی) میں خارجیوں کے ایک گروہ نے مکہ میں ایک نشست کے دوران قاتلوں اور مقتولوں کا تعین کیا۔ حضرت علیؓ کے قتل کی ذمہ داری ابن ملجم کو سونپی گئی۔ اسے کوفہ جانے کی ہدایت کی گئی جہاں اسے اپنے ہدف کو نشانہ بنانا تھا۔ قتل مسجد میں کیا جانا تھا کیونکہ حضرت علیؓ نماز فجر کی امامت کو روزانہ وہاں جاتے تھے، جس گروہ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی اس میں ایک عورت قطامی بھی شامل تھی۔ تیرہ رمضان کو جمعہ کی رات (20 جنوری 661 عیسوی) یہ عورت مسجد کی دیوار کے ساتھ مچھر دانیوں میں استعمال ہونے والے جالی دار کپڑے تلے چھپ گئی۔ فجر کے وقت اس نے ریشم کی پٹیاں کاٹیں اور مردوں کے ماتھوں پر باندھ دیں۔ مردوں نے تلواریں لیں اور مسجد کے دروازے کا رخ کر کے بیٹھ گئے جہاں سے حضرت علیؓ موذن کی پہلی اذان کے ساتھ مسجد میں داخل ہوتے تھے۔ موذن اذان دے چکا تو باقی سب کام طے شدہ مرحلوں میں مکمل ہوگیا۔ حضرت علیؓ اپنے گھر سے نکلے اور باآواز بلند ''نماز کو پہنچو مسلمانو، نماز کی طرف آؤ'' پکارتے مسجد میں داخل ہوئے۔ ابن ملجم اور اس کے شریک سازشیوں نے حملہ کیا۔ ابن ملجم نے ان کے سر پر تلوار سے وار کیا۔ یوں تشدد اور اختلاف رائے کے ہم معنی ہونے کا آغاز ہوا۔ المسعودی کی بیان کردہ تفصیل سے ایک چھوٹا سا اقتباس سیاسی اسلام کے اس المیئے کا خلاصہ بیان کرتا ہے۔

MashalBooks.org

''قتل کی رات حضرت علیؓ نے جاگتے گزاری اور صدر دروازے سے اپنی خواب گاہ کے دروازے تک متواتر ٹہلتے رہے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے: ''خدا جانتا ہے میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور نہ مجھ پر کبھی جھوٹ بولنے کی تہمت لگائی گئی۔'' اگر یہ دلگداز چیخ المسعودی کے تخیل کی پیداوار ہے(کیونکہ المسعودی کی مبالغہ آرائی ڈھکی چھپی نہیں تھی) تو بھی امام کی کمزوری اور خدا خوفی کو مکمل طور پر بیان کرتی ہے جو ہمارے دور میں غائب ہو چکی ہے۔

خارجیوں کے بہت سے فرقوں کے نزدیک طوائف الملوک ایک حل خیال کی جاتی تھی یعنی ایک رہنما سے نجات حاصل کرنے کا قابل قبول طریقہ۔ وہ اس نظریے کی تبلیغ عبادت خیال کرتے تھے۔ خارجیوں کا یہ انتہا پسند طبقہ نجادت ابن عامر کا پیروکار تھا۔ ''نجادت اس امر پر متفق تھے کہ لوگوں کو درحقیقت کسی امام کی ضرورت نہیں، عدل و انصاف کو یقینی بنانے کے لئے فقط خود کو منظم بنا لینا چاہیے۔ نجادت ابن عامر کو حضرت محمد ﷺ کے وصال مبارک کے دس برس بعد 69 ہجری میں قتل کر دیا گیا۔ کسی رہنما کی مذمت امن کے نام پر اور ناانصافی (منکر) کو روکنے کے لئے کی جاتی تھی۔ آج بھی اسلام میں اختلاف رائے کے نعروں میں عدل اور منکر دو کلیدی الفاظ ہیں جس کی ''الاسلام السیاستہ'' کے مصنف اسماوی نے مذمت کی ہے۔ وہ اسے خارجی روایات کا شاخسانہ قرار دیتا ہے۔ وہ اسے اختلاف اور تنازع کے انجماد (تجمید) یا ہڈی بن جانے یعنی بے لچک ہو جانے سے تعبیر کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاملہ فقط رہنما کی ذات تک مرتکز ہو کر رہ جاتا ہے اور عامتہ الناس کو قوت فیصلہ سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ اسماوی کے خیال میں ''متشددانہ تخریب کی مدد سے عدل کے حصول کی کوشش مسئلے کی اصل کو منظر عام سے غائب کر دیتی ہے اور وہ اصل عامتہ الناس اور ان کی رائے ہے۔ اسماوی کے خیال میں حضرت محمد ﷺ کی رسالت (یعنی قرآن کریم کی صورت میں منکشف ہدایت) کا لب لباب یہ ہے کہ ''جابر کے خلاف جدوجہد تشدد کے بغیر ہونا چاہیے۔ یہ ناگزیر امر ہے کہ اس خیال کو تسلیم کر لیا جائے تو جدوجہد کی ذمہ داری عامتہ الناس پر آ جاتی ہے۔ باب ہفتم میں انفرادیت پر بات کرتے ہوئے ہمیں ایک بار پھر اس نکتے سے رجوع کا موقع ملے گا۔

امام کا قتل حضرت علیؓ کی خلافت سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ سے جس

عمل کا آغاز ہوا اسے سیاسی دہشت گردی کا نام دیا جانا چاہیے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ قتل ہونے والے پہلے خلیفہ وہ تھے جن کی وجہ شہرت عدل تھی۔ وہ اپنے فرائض انتہائی توجہ اور غور وفکر سے سرانجام دیتے اور رائے یعنی انفرادی قوت فیصلہ کو فیصلہ سازی کے منابع میں سے ایک تسلیم کرنے والوں میں سے تھے۔ اس لفظ کو بعدازاں تعقل کی روایت میں کلیدی حیثیت حاصل ہونا تھی۔ سیاسی مقتولین کی طویل فہرست میں حضرت عمرؓ کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اس طرح کی فہرست ابن حزم نے ''خلفاء میں سے وہ جو قتل ہوئے اور ان کے قتل کئے جانے کا طریقہ'' میں دی ہے۔ فہرست کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

1- خلیفہ عمرؓ بن عبدالخطاب جنہیں 23 ہجری (644 عیسوی) میں خنجر گھونپ دیا گیا۔ وہ حضرت محمد ﷺ کے بعد خلیفہ ثانی تھے۔

2- خلیفہ سوئم حضرت عثمانؓ جنہیں تلواروں سے شدید زخمی کر دیا گیا تھا، وہ تیسرے خلیفہ اور حضرت عمرؓ کے جانشیں تھے۔ انہیں 35 ہجری (656ء) میں شہید کیا گیا۔

3- خلیفہ مروان ابن الحکم جنہیں ان کی بیوی ام خالد نے گلا گھونٹ کر قتل کیا۔ بنوامیہ کے اس چوتھے خلیفہ کو 64 ہجری (683 عیسوی) میں قتل کیا گیا۔

4- عمر بن عبدالعزیز جنہیں ''کہا جاتا ہے کہ زہر دیا گیا'' آپ آٹھویں اموی خلیفہ تھے۔ آپ کا انتقال 101ھ (720ء) میں ہوا۔

5- الولید ابن یزید ____ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے۔

ابن حزم لکھتا ہے کہ کئی ایسے خلیفہ تھے جنہیں ایک سے زیادہ افراد نے بیک وقت تلواروں کے وار سے قتل کیا۔ بالفاظ دیگر وہ ایک گروہ کے غم و غصے کا شکار ہوئے اور ان کی موت ایک باقاعدہ رسم کا رنگ لئے ہوئے تھی۔ بعض معاملات قدرے عجیب نوعیت کے بھی تھے۔ ان میں سے ایک ہارون الرشید کے بھائی الہادی کا بھی ہے۔ وہ اپنے ایک درباری کے ساتھ سیر پر تھا کہ اس نے اپنے ہمراہی کو ایک تقریباً عمودی ڈھلوان پر سے لڑھکانے کا فیصلہ کیا۔ وہ درباری الہادی سے لپٹ گیا اور یوں دونوں موت کی آغوش میں پہنچ گئے۔ لیکن زیادہ تر معاملات میں امام قربانی کی سی رسوم کا ہدف بنے۔ اسلامی تاریخ میں قتال الملوک (قتال آئمہ) کا نفسی تجزیہ (جو تا حال نہیں ہوا) حزنیہ جذبات سے پُر ہوگا۔ رہنما کا قتل عموماً مردوں کا کام رہا ہے، لیکن وقتاً فوقتاً مروان ابن الحکم کی بیوی جیسی خواتین نے بھی

اس طرح کے سیاسی قتلوں میں حصہ لیا۔ لیکن انہوں نے تلواروں کی بجائے تکیوں یا زہروں سے کام لیا۔ البتہ بعض واقعات میں انہوں نے اس کام کیلئے حمام کو بطور قتل گاہ منتخب کیا۔(12)

باغیوں کا قائد کی جگہ اس امید میں سنبھالنا کہ وہ فرائض کی انجام دہی میں بہتر ثابت ہو سکتے ہیں ، ایک ایسا تخیل اور محرک تھا جس نے پندرہ صدیوں کے دوران سینکڑوں نہیں تو درجنوں فرقوں کو اس امنگ سے نوازا۔ جدید عسکری مزاج قوتیں جو تقدس کے نام پر اقتدار کی داعی ہیں وہی پرانا منظرنامہ دہرائے چلی جا رہی ہیں۔ روایتی محلاتی بغاوت حکمران اور باغیوں کے سربراہ کا باہمی معاملہ ہوتا تھا جبکہ عامتہ الناس کو عموماً ملوث نہیں کیا جاتا تھا۔ المسعودی نے ایک خلیفہ اور صوفی کے درمیان ہونے والا جو معاملہ دہرایا ہے وہ مسلم تخت کی ساختیاتی کمزوری کا عکاس ہے۔

المامون اور صوفی..... تمہیں یہ تخت کس نے دیا؟:

ساتواں عباسی خلیفہ المامون (198-218/813-833عیسوی) اپنے وقت کا طاقتور ترین حکمران تھا۔ اس کے دور حکومت کی شان و شوکت اور بوران کے ساتھ اس کی شادی نے بے شمار داستانوں میں رنگ بھرا ہے۔ اس کے باوجود مامون کے تابع فرمان عوام الناس میں سے ایک کی نظر میں وہ خلیفہ جس کی افواج سے دنیا لرزاں تھی، کسی بھی دوسرے انسان سے مختلف نہیں تھا، کیونکہ اسے حق حکومت امت نے نہیں دیا تھا۔ یہ ارفع خیال، جو بے شمار مسلمانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں پنپتا ہے، اس صوفی کے ذہن میں بھی آیا جو اپنی زندگی روحانی بالیدگی کے لئے وقف کر چکا تھا۔ اس نے خلیفہ سے پوچھنے کا ارادہ کر لیا کہ اس کا اپنے تخت کے متعلق کیا خیال ہے۔

''ایک دن خلیفہ اپنے مصاحبین کے درمیان گھرا بیٹھا تھا کہ اس کا حاجب علی ابن صالح نمودار ہوا اور خلیفہ سے کہنے لگا: ''سفید کھردرے کپڑے کے لباس میں ایک شخص محل کے دروازے پر کھڑا داخلے کی اجازت کا طالب ہے کہ بحث میں حصہ لے سکے۔ یحییٰ (جو اس واقعہ کا راوی ہے اور جو اس واقعے کے اچھی طرح یاد ہونے کا دعویدار بھی تھا) کا کہنا ہے میں فوراً سمجھ گیا کوئی صوفی ہوگا اور میں خلیفہ کو اشارہ کرنے والا تھا کہ اسے اندر نہ آنے دیا جائے۔ لیکن اس اثناء میں خلیفہ اسے اندر آنے کی اجازت دے چکا تھا۔

اندر آنے والے کا لبادہ کمربند میں اڑسا ہوا تھا اور اس نے جوتے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔ قالین کے سرے پر رک کر اس نے سلام کیا۔ خلیفہ نے سلام کا جواب دیا۔ اجنبی نے خلیفہ تک رسائی کی اجازت مانگی جو اسے دے دی گئی اور اسے بیٹھنے کو کہا گیا۔

وہ بیٹھ گیا تو خلیفہ سے کہنے لگا، ''مجھے اجازت ہے کہ میں آپ سے کلام کرسکوں۔''

''جو جانتے ہو، کہو۔'' المامون نے جواباً کہا، ''کیونکہ اللہ کو یہی پسند ہے۔''

پھر اس شخص نے پوچھا، ''یہ تخت جس پر تم بیٹھے ہو، کیا امت مسلمہ کی رضامندی سے تمہارا استحقاق بنایا بجائے اس کے اس جبر و تشدد کی بدولت جو تم نے اپنی قوت و جبروت سے ان پر روا رکھا۔''

ذہین اور باضمیر المامون نے نہایت جامع جواب دیا۔ اس جواب میں اپنے خلیفہ کے ساتھ اظہار خلوص کا حوصلہ رکھنے والے شخص کے لئے تمام تر احترام موجود تھا۔ خلیفہ کا جواب تھا کہ تخت پر اس کی موجودگی نہ تو عامتہ الناس کی رضامندی (اجتماع) کے باعث ہے اور نہ ہی جور و جبر کا نتیجہ- فقط یوں ہے کہ اسے یہ تخت ایک سلطان (غیر مذہبی حکمران) سے وراثتاً ملا اور اسے یہ تخت ایک معاہدے کے تحت جائز طور پر منتقل ہوا تھا۔ المامون کو درپیش مسئلہ یہ تھا کہ قرآن میں وراثتی اقتدار کہیں مذکور نہیں بلکہ اسلام میں اس کی واضح مخالفت موجود ہے۔ اس کی مزید وضاحت ہمیں قبل اسلام کے باجبروت حاکم کے تصور یعنی ''طاغیہ'' کے مطالعہ میں ملے گی۔

خلیفہ اور اس کے ملاقاتی کے باہمی سوال جواب کا یہ بیان یقیناً متاثر کن ہے، کیونکہ یہ نہ صرف اسلام کی عظیم جمالیات بلکہ اس کے سیاسی نظام کا بھی مظہر ہے۔ اصولاً کوئی تخت مستحکم نہیں اور کوئی بھی شخص، خواہ وہ کتنا ہی کم رتبہ ہے، ملک کے طاقتور ترین شخص پر سوال اٹھا سکتا ہے۔

مسلمانوں کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک بغاوت کا جو خارجیوں نے اختیار کیا اور وہ اس پر چلتے ہو تشدد اور قتل و غارت کو جا نکلے- دوسرا راستہ عقل کا تھا۔ معتزلہ سے شروع ہونے والے اس طریقہ میں استدلال کی فضیلت نہ صرف تسلیم کی گئی بلکہ اس پر زور بھی دیا گیا۔ معتزلہ نے سیاسی منظر میں دانشوری کا رنگ بھرا۔ غیر عادل امام کے خلاف تشدد اور بغاوت کی تبلیغ کرنے کی بجائے، خارجیوں کے برعکس، معتزلہ نے قرار دیا کہ ایک صاحب فکر

شخص حکومت کے راستے کی رکاوٹ بن سکتا ہے۔ آنے والے ادوار میں صدیوں دونوں طرز ہائے فکر باری باری سامنے آئے اور آمرانہ و مطلق العنان شخصی حکومتوں کے خلاف مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلمہ تھی۔ دور جدید میں پرزور طور پر خود کو حکومت کا اہل قرار دینے والے لوگوں نے متشددانہ اور باغیانہ راستہ اپنایا ہے۔ وہ تعقل کی روایت کو اپنے مسلم ورثے کا حصہ ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ اس لئے معتزلہ مختصر تعارفی خاکہ کھینچنا اور سمجھنا اتنا ضروری ہے۔

تعقل کی روایت: معتزلہ اور رائے:

معتزلہ اس مسئلہ کو فلسفیانہ سطح پر لے گئے۔ انہوں نے کچھ اس طرح کے سوالات اٹھائے کہ زمین پر ہمارے وجود کا مقصد کیا ہے؟ اور ہمیں نادر ترین الوہی عطیئے یعنی عقل کا استعمال کرنے میں کس حد تک جانا چاہیے؟ خدا کا ہمیں ذہین پیدا کرنا یقیناً کسی منصوبے کو آگے بڑھانے کا سامان ہے۔ تعقل پسند حزب اختلاف نے امام کے قتل کے بجائے تعقل کی فتح کا رستہ اپنایا تا کہ مطلق العنانیت کا سدباب کیا جا سکے۔ اچھی حکومت کی حامل امت کے سامنے آنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر اہل ایمان کو خدا کے قیمتی عطیے یعنی سوچنے اور تجزیہ کرنے کی انفرادی صلاحیت کا حامل خیال کیا جائے۔ سیاسی تھیٹر میں تعقل کے تعارف سے معتزلہ نے اہل اسلام کو مجبور کر دیا کہ وہ حاکم اور محکوم کے درمیان ایک نئی طرح کے تعلق پر غور کریں جس میں ہر اہل ایمان کو محل کے شانہ بہ شانہ سیاسی کردار ادا کرنے کا حق حاصل ہو۔ ان کے نزدیک سیاست محض امام اور باغیوں کے رہنما کے درمیان لڑی جانے والی دو فریقی جنگ نہیں تھی جس میں سے عامتہ الناس کو باہر اور لاتعلق خیال کیا جاتا تھا۔ سیاسی منظر میں ایک تیسرا عنصر داخل کیا گیا، وہ عنصر اس امر پر زور دیتا تھا کہ تمام مومنین قوت استدلال رکھتے ہیں۔ یہ دو متنازعہ رجحانات یعنی خارجی باغی اور معتزلہ فلسفی اسلام میں اوائل میں ہی داخل ہو گئے تھے اور پوری مسلم تاریخ میں مختلف ناموں سے فعال رہے۔ مختلف بلکہ متضاد طرز فکر کے باوجود، ان دو فرقوں میں ایک قدر مشترک تھی کہ دونوں کے خیال میں امام کو مزاجاً اور طرز حکومت میں دھیما اور نرم مزاج ہونا چاہیے اور اسے مطلق العنانی کی راہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

MashalBooks.org

لیکن امامت کے سیاسی نظریے اور سرکاری مسلم تاریخ میں امام ہمیشہ کمزور رہا۔نظری اعتبار سے امام کی طرف سے اطاعت کا تقاضا اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ امام شریعت کا پیروکار ہے.....شریعت جو خوشی، ہم آہنگی اور خوشحالی کی راہ ہے- قدیم عربی میں ''شارع'' کا مطلب ہے پانی کے منبع کی طرف سفر یعنی کہ ایسے عنصر کی طرف جو زندگی کا ضامن ہے اور توانائی کو ازسرنو بحال کرتا ہے۔(15) چونکہ انسان اور خدا کو متمیز رکھنا ہی اسلام کی بنیاد ہے چنانچہ مومن پر امام کی اطاعت اور خدا کی اطاعت مساوی سطح پر نہیں رکھی جا سکتی۔سنی (قدامت پسند) مکتب فکر میں امام معصوم عن الخطا نہیں یعنی اس سے خطا سرزد ہوسکتی ہے جبکہ شیعہ مسلک میں امام سے خطا سرزد نہیں ہوسکتی یعنی وہ معصوم عن الخطا ہے۔ ایک خمینی، ایک ایسا رہنما جو معصوم عن الخطاء ہے، سنی اسلام کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ چنانچہ اہل تشیع سے یہ عقیدہ اہل سنت کو برآمد نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ غالب سنی اکثریت کے علاقوں میں قائم حکومتیں اور تقدس پر مبنی حزب اختلاف کی جماعتیں اس طرح کے اختیارات کے خواب نہیں دیکھتیں۔ یقیناً وہ بھی امام خمینی کو حاصل غیر معمولی اختیارات کے خواب دیکھتی ہیں۔لیکن ان کے پاس کوئی ثقافتی ورثہ نہیں جس میں وہ اپنی اس خواہش کی جڑیں گاڑ سکیں۔ جبکہ اہل تشیع کو یہ سہولت میسر ہے۔ ابتداء ہی سے شیعہ امام کو حاصل اختیارات نیم فوق الفطرت ہیں جبکہ سنی اسلام اس حوالے سے تعقل پسند اور عملی رہا ہے۔کسی بشر سے غلطی سرزد ہونے کے احتمال کو ناممکن قرار دیا جانا ممکن نہیں۔

معتزلہ کی تعقل پسند روایت غالب رہی اور وہ بدعنوان بنوامیہ کی حکومت ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔اس کشمکش میں عقل کے غلبے پر اصرار معتزلہ کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ یہ امر کتنا بھی بعید از امکان نظر آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سیاسی فاتح استدلال و تعقل کے آتشیں گھوڑے پر سوار اقتدار میں آئے۔ معتزلہ نے اسلام کے شاندار ازمنہ وسطیٰ کو استدلال کا تحفہ دیا لیکن افسوس کہ عباسی بھی بہت جلد جور وستم اور سیاسی مطلق العنانی پر اتر آئے۔معتزلہ مردود اور تعقل و استدلال عاجز جلاوطن ٹھہرے اور مسلم دنیا ایک اوسط درجے کی تہذیب پر ختم ہونے والی ڈھلان پر لڑھکنے لگی اور پھر وہیں اس کی نشوونما ہوئی۔ یہی وہ ''اوسط'' درجے کی حالت ہے جو ہم پر ''مصدقہ'' کے طور پر مسلط کی جا چکی ہے۔

کیسی ستم ظریفی ہے کہ تعقل کے خلاف لڑنے والے سیاستدان متواتر کامیاب ہوتے

رہے اور بالآخر انسانی تاریخ کے نمایاں ترین مذاہب میں سے ایک کو اس کی روح سے محروم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اسلام میں ابتداء ہی سے بغاوت کا عنصر غالب رہا۔ جب دانشورانہ مخالفت کچل کر خاموش کروا دی گئی تو لامحالہ کامیابی بغاوت اور تشدد کے حصے میں آئی اور یہی عمل ہم آج بھی ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ منحرفین کا تشدد تھا جو خلیفہ کے جبر کے ساتھ متعامل ہوسکتا تھا۔ پوری مسلم تاریخ پر غالب یہ طرزِعمل عصر حاضر کے حقائق کی تفہیم میں معاونت کرسکتا ہے؛ ایک ایسے عہد کی وضاحت جہاں تشدد کے پرچار کو سیاسی زبان کے طور پر استعمال کرنے والا عنصر ہی کوئی قابل اعتبار اور قابل پیش گوئی چال چل سکتا ہے۔

معتزلہ دانشور فقط فلسفی، ریاضی دان، انجینئر اور ماہر فلکیات نہ تھے۔ ان میں صوفیاء بھی شامل تھے، جنہوں نے مذہبی کتب کے متنوں سے ہر وہ چیز ڈھونڈ نکالی تھی جس کی انہیں صاحب فکر اور ذمہ دار فرد کے نظریے کی ترویج میں ضرورت تھی۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ابتداء میں سائنسی تحقیقات صوفیانہ خیالات کی نشوونما کا لازمی جزو تھیں۔ وہ یوں کہ خدا کو خراج تحسین پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہی خیال کیا جاتا تھا کہ انسان اپنے دماغ کا بہتر استعمال کرے۔ مذہبی اداروں اور سائنسی تحقیقات کے درمیان ہونے والی کشمکش جو جدید عہد کے اوائل میں مسیحیت میں موجود تھی اور جس کی عالمگیر سطح پر معروف مثال گیلی لیو کے ساتھ ہونے والا رویہ ہے، معمول کے حالات میں اسلام میں کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن بحرانی ادوار میں اس طرزِعمل کے عکاس مصنوعی پھندے تیار کئے جاتے ہیں جن کی جدید ترین مثال دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دہائیوں میں طٰہٰ حسین جیسے عظیم مفکرین کی مذمت ہے۔

ابو زہرہ نے اسلام میں اس طرح کے رجحانات کی درجہ بندی کرتے ہوئے ان کی تین اقسام مقرر کی ہیں۔ سیاسی قسم (جس میں وہ خارجیوں کو رکھتا ہے)، قانونی قسم جس میں چاروں فقہی مکاتب فکر حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی شامل ہیں۔ تیسری قسم میں دانشور آتے ہیں جنہوں نے بجائے خود عقیدے کی ماہیت کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا دیا۔ انہوں نے انسانی مقدر، کائنات اور اس کے اسرار جیسے فلسفیانہ موضوعات کو اپنی تحقیقات میں جگہ دی۔ معتزلہ اس آخری گروہ میں شامل ہیں۔(16)

معتزلہ کے ہاں زیر بحث آنے والے مسائل میں سے ایک، جس میں عوام الناس نے

بھی دلچسپی لی، قدر کا مسئلہ تھا۔ قدر کے حوالے سے معتزلہ نے سوال اٹھایا کہ آیا ہم انسان اپنے عمل میں آزاد اور یوں اپنی قسمت کے ذمہ دار ہیں یا ہمارا مقدر خدا کی طرف سے طے شدہ ہے۔ معتزلہ کے ایک ذیلی فرقے قدریہ نے اسے اپنا مرکزی نقطہ قرار دیا۔ اس فرقے سے منسلک قدری کہلاتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ انسان اپنے اعمال کے فیصلے میں آزاد ہے اور اس سے اپنے ہر عمل .....اپنے ہر شر اور خیر کا ذمہ دار بھی ہے۔ اگر خدا نے انسان کا مقدر متعین کر دیا ہے تو پھر وہی زمین پر موجود شر کا ذمہ دار بھی ہے، یعنی یا تو انسان آزاد ہے یا پھر خدا شر کا ذمہ دار ہے، لیکن دوسرے حصے میں بیان شدہ قضیہ ناممکن ہے۔ ''اگر خدا نے شر کو پیدا کیا ہے تو وہ عادل نہیں ہوسکتا۔''(17)

معتزلہ کو احساس ہوگیا کہ وہ کتنے بھی فلسفیانہ ہوں، عملی سیاست سے دامن نہیں بچا سکتے۔ ایک شخص، جو باشعور اور ذمہ دار وجود ہے، مقتدرہ کی غیر مشروط اطاعت نہیں کر سکتا۔ ان شرائط میں سے اہم ترین صاحبان اقتدار کا عوام کا نمائندہ ہونا ہے۔ کوئی بھی صاحب اقتدار جو عوام میں سے نہیں آتا، ان کے ارادے اور رضا کا پابند نہیں ہوتا۔

''معتزلہ اور دوسرے فرقے قرار دیتے ہیں کہ امام کا مقام صرف ملت کے آزادانہ چناؤ سے ممکن ہوسکتا ہے۔ ان کے نزدیک خدا اور اس کے رسول نے کسی خاص شخص کو امامت کے عہدے سے سرفراز نہیں کیا اور مسلمانوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں کہ وہ خصوصی طور پر نامزد کردہ فرد کو ہی امامت کے عہدے سے سرفراز کریں۔ فقط امت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ہی کسی رکن کو اپنا نمائندہ منتخب کرے اور اسے انتظامی اختیارات تفویض کرے۔ (18)

معتزلہ کے سیاست میں داخلے نے ان کی ماہیت قلب کی اور اس مکتب فکر میں نئے تصورات داخل ہوئے۔ مثال کے طور پر اعتدال، یعنی دو انتہاؤں کی درمیانی راہ اختیار کرنے اور معاملہ کے تمام پہلوؤں کو بغور دیکھنے کا رجحان زور پکڑنے لگا۔ یہ بہت اہم مسئلہ تھا کیونکہ اس نے رواداری کا مسئلہ اٹھایا۔ ایک مسلمان جو گناہ کا مرتکب ہوا کس سلوک کا مستحق ہے؟ اس کی مذمت کی جائے یا اعتدال کا راستہ اختیار کیا جائے یعنی تحقیر و تحسین دونوں کے بین بین رہا جائے۔ اصولی موقف یہ وضع ہوا کہ کسی کے رویے کا بغور مطالعہ کئے بغیر اس کی مذمت نہیں ہونی چاہیے۔ تعقل کے احترام سے اعتدال کا فہم لینا ناگزیر تھا۔ چنانچہ معتزلہ کے

سابقہ رویے کی جگہ، جس میں اطاعت یا بغاوت میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا جاتا تھا، ایک نئے رویے نے لے لی جسے اطاعت بالمقابل تعقل کہا جا سکتا ہے، عباسیوں نے معتزلہ کے فلسفے کو ایک صدی تک سرکاری حکمت عملی کے طور پر اپنائے رکھا۔ اسے کشادہ ذہنی کا نام دیا جا سکتا ہے۔(19) کشادہ ذہنی کی یہ حکمت عملی تمام علوم پر محیط تھی۔ اس میں سائنسی علوم کے رسائل کی تصنیف و تالیف سے لے کر یونانی فلسفہ پر غور و فکر بھی شامل تھا جس کا معتدبہ حصہ عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا۔

یونانی معاشرتی علوم کے عربی ترجمے کا کام ایک سرکاری منصوبے کے طور پر شروع ہوا اور پوری نویں صدی میں جاری رہا۔ المامون کے عہد میں ایک عیسائی حنین ابن اسحاق (متوفی873ء) نے مترجمین کا ایک مدرسہ قائم کیا، بغداد اور پوری سلطنت سے اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار لوگ اس میں بھرتی کئے گئے۔ مغرب میں غلط العام خیال کے برعکس اس دارالترجمہ میں فقط یونانی ورثے کو عربی میں منتقل نہیں کیا گیا بلکہ قدیم ایران اور ہندوستان سے درآمدہ کتب کے بھی تراجم ہوئے۔ ان تہذیبوں کے فکری علمی کارناموں کے ترجمہ و تدوین کے بعد ان کی توسیع اور امتزاج کی تحریک شروع ہوئی۔ غیر ملکی علوم کی درآمد اور تراجم کے بعد طبع زاد افکار سے مزید نکھارا گیا اور انہیں وسعت دی گئی۔ یوں مسلمانوں کے اپنے منفرد مکتب فکر جنم لینے لگے۔ مسلم فکر پھلی پھولی جس کے علمبرداروں کو فلاسفہ کا نام دیا گیا۔ فلاسفہ ایک طرز فکر تھا جس کے استعمال کرنے والوں کو خواہ وہ معالج تھے یا ریاضی دان، بلا استثناء فلاسفہ کا نام دیا گیا- سب کے لئے استعمال ہونے والی اس محیط کل اصطلاح نے بعدازاں ان کی مذمت کا عمل آسان کر دیا۔ عباسیوں نے جابرانہ طرز حکومت اختیار کی تو یہ اصطلاح بکثرت استعمال ہوئی۔ عباسیوں نے اپنی طاعت کے تقاضوں کے لئے اہل الحدیث پر انحصار کیا جن کا خیال تھا کہ شریعت کی تشریح میں صرف وہی علوم استعمال ہونا چاہئیں جو عربی میں نازل ہوئے ہیں۔(20) صرف اسی محدود تشریح پر اصرار کو دربار کی حمایت حاصل تھی اور اس کا بڑا مقصد اطاعت کو یقینی بنانا تھا۔

فلاسفہ کی سرگرمی کو ''کلام'' (بحث) کا نام دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کے طرز فکر کی بنیاد دلائل کے منطقی طریقے سے اٹھائے جانے پر تھی۔ اور دوسرے یہ کہ نئے خیالات عالموں کے درمیان محدود رکھنے کی بجائے بازار میں پہنچا دیئے گئے تھے اور عوام

الناس میں بھی موضوع گفتگو بن گئے۔نویں صدی کے آغاز میں عباسی دربار کی سرپرستی میں معتزلہ نے سائنسی اور قیاسی علوم کے چمن کی آبیاری کی۔ سائنسی اور فلسفیانہ علوم کے تمام عظیم نام اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ریاضی دان اور ماہر فلکیات بابائے الجبرا الخوارزمی (متوفی 850)، الکندی (متوفی 873ء) جسے بیشتر اوقات فیلسوف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عظیم طبیب الرازی (متوفی 925ء) جسے اہل مغرب Rhazes کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ البیطانی (متوفی929ء) جو ٹرگنومیٹری کا بانی ہے اور ماہر مابعد الطبیعات الفارابی (متوفی950) جو المدینہ الفضیلہ (پاک باز شہر) کا مصنف ہے۔

لیکن عباسی جو تعقل کی شمع لئے اقتدار میں آئے اور جنہوں نے معتزلہ کے ارفع ترین دماغوں کو فعال و متحرک کیا کہ وہ نظریات کی اشاعت کریں، بہت جلد محلاتی سازشوں میں گھر گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ استدلال کی آزادی، ذاتی رائے اور نجی تقدم کو ''غیر ملکی''، ادارے قرار دے کر مذموم قرار دیا گیا۔ فلاسفہ ایک بار پھر ہدف بنے اور آزاد خیالوں کی مذمت میں انہیں کافر اور ملحد قرار دیا گیا۔عباسیوں نے اپنے جابرانہ طرز حکومت کے استحکام کے لئے علم کی اس روایت کے مفکرین بھرتی کئے جسے اطاعت کی روایت کہا جاسکتا ہے- یہ روایت جو شریعت کہلاتی ہے آج بھی فکری انتشار کی مدد سے حکمرانوں کی اندھی اطاعت کو مذہب کی تعظیم سے وابستہ کرتی اور، یوں، جمہوری کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ امام اور اس کے مقتدیوں ، یعنی پیروکاروں، کے مابین تعقل پر مبنی تعلق کے حق میں اٹھائی گئی آوازوں اور رہنماؤں پر کسی بھی طرح کی تنقید کو اسلام کے استرداد اور اس کے اصولوں اور مثالوں کی توہین کے مترادف خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شریعت کو عباسی محل کی ضروریات کے تابع کرنے کی کوشش میں اسے سوال اٹھائے جانے اور قیاس کی جہات سے محروم کر دیا گیا۔ امام ایک متشدد اور خوں آشام آمر مطلق بن گیا۔ نتیجتاً حزب اختلاف میں صرف خارجی رہ گئے جو اپنا وجود متواتر منواتے رہے۔

عباسیوں نے معتزلہ کو غیر ملکی میراث کا علمبردار قرار دے کر ان کی مذمت کی اور پھر مطلق العنان عباسی ایک ایسی امت سے اٹھنے والے افراد کے ہاتھوں قتل ہونے لگے جنہیں بڑے ظالمانہ انداز میں ذاتی رائے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ یونانی اور معتزلہ ایسے عناصر قرار پائے جنہیں مٹا دیا جانا لازم قرار پایا۔ آزاد خیال دانشوروں کی باقاعدہ منصوبہ

بندی کے تحت مذمت کی گئی، عامتہ الناس دانشورانہ بے حسی کا شکار ہوئے اور مسلم دنیا تیزی سے ایسی ڈھلان پر لڑھکنے لگی، جس کا اختتام ناقابل اصلاح انحطاط پر ہونا تھا۔ اس کے بعد سے اعضاء بریدہ اسلام میں مقتدرہ کو چیلنج کا صرف ایک طریقہ باقی بچا یعنی بغاوت۔

یہ محلات کا اپنے تعقلی پہلوؤں سے قطع شدہ وہی اسلام ہے جسے آج مسلم ورثہ کے نام پر ہمارے شعور میں ٹھونسا جا رہا ہے۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارے کے بعد جس اسلام کو ازسرنو فعال کیا گیا، وہی جلادوں اور شہزادوں کا اسلام ہے۔ ستر کی دہائی کے آغاز میں تیل کی دولت سے اس پروپیگنڈے کے لئے مالی وسائل مہیا ہونے لگے، جس میں اطاعت کی حوصلہ افزائی اور تفکر کی مذمت کی گئی تھی۔ اس طرح کی مالی معاونت سے جو فوری نتائج برآمد ہوئے ان میں ایک عین سعودی عرب کے قلب میں مسجد الحرام پر، نومبر 1979ء میں ابن محمد العتابی اور محمد ابن عبداللہ القحطانی کی زیر قیادت، بنیاد پرستوں کا قبضہ تھا۔ (21) ساتھ ہی ساتھ تیل سے دولت کی دستیابی نے نظریہ اطاعت کے حمایت یافتہ سرکاری اسلام اور عسکری اسلام کے درمیان تعلق اور بھی مضبوط کر دیا ہے۔ عسکریت پسند دراصل بے دخل باغی خارجیوں کے ردعمل کے وارث اور اطاعت الٰہی کے بھیس میں سرکاری جبر کی ناگزیر اولاد ہیں۔

مذکورہ بالا ملاپ کے بالمقابل عرب دانشور، جن میں سے زیادہ فلسفی ہیں، انسانی فکر کے تمام شعبوں میں کشادہ ذہنی کا دفاع کر رہے ہیں: انسانی فکر کے تمام پہلوؤں کا خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید ۔تعقل پسندی کے ساتھ ساتھ مغربی بشر نوازی کے علمبرداروں کو اپنانے کے دعوے کئے جا رہے ہیں جن میں سے مارکس خصوصاً قابل ذکر ہے۔ محمد عمارہ، حسین مروہ (جنہیں بیروت میں قتل کر دیا گیا) اور محمد الجبیر ی (جو آج کے ممتاز ترین مفکرین میں شمار ہوتے ہیں) عرب دنیا میں مقبول ترین گلوکاروں سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔ ان میں سے مراکش کا الجبیر غالباً سب سے زیادہ پڑھا جانے والا فلسفی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے کانفرنسوں اور غیر رسمی تبادلہ خیالات کے دوران استعمال ہونے والے حوالوں سے ہوا۔ اپنی کتاب ''ہم اور ہماری وراثت'' میں وہ پرزور طور پر ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے یونانی وراثت اہل مغرب کو فقط منتقل نہیں کی بلکہ اس میں توسیع و اضافہ بھی کیا۔(22) ''تکوین العقل العربی'' یعنی ''عرب افکار کی طرز تشکیل'' ان کا فکری شاہکار ہے۔ اس کتاب کا موضوع اطاعت پسند

اسلام اور دانشوروں کے استدلال کے مابین اختلاف ہے۔ انہوں نے کئی ملین عرب نوجوانوں کو جدیدیت کی طرف مائل کیا اور ان میں جمہوریت کی امنگ بیدار کی ہے۔(23) ان کی کتابوں کے مطالعہ سے نوجوانوں پر آشکار ہوا کہ ایسا اسلام بھی ہے جس کی رو سے کشادگی اور ذاتی رائے ہماری روایت کا لازمی جزو ہیں۔ مغرب نے ہمارے تمدن کے کشادگی کے اس پہلو کو ہمیشہ نظرانداز کیا ہے۔

الجبیر ی اوران جیسے دوسروں مفکرین کی تحریروں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا اور نہ ہی مغربی ٹیل ویژن نیٹ ورک نے ان کے انٹرویو نشر کئے۔اس کی ایک ہی وجہ نظر آتی ہے کہ الجبیر ی کسی بھی فرانسیسی یا جرمن فلسفی سے مختلف نظر نہیں آتے اور وہ انہیں کی طرح عزت نفس اور فکری آہنگ کی ضرورت پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ کبھی ان کے انٹرویو نہ کئے جانے اور انہیں ذرائع ابلاغ پر پیش نہ کرنے کی وجہ کہیں یہ تو نہیں کہ یہاں اس ندرت اور عجوبہ کی دستیابی کا امکان نہیں جس کی مدد سے اسلام کو خوفزدہ کر دینے والی قوت کے طور پر پیش کیا جا سکے، نسلی عصبیت کو ہوا دی جا سکے اور استردادی رویے کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ یہ امر یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں کہ جنونی اور انتہا پسند تحریکوں کے رہنماؤں کو بیشتر اوقات ٹی وی پر انٹرویو کے لئے مدعو کیا جاتا ہے جبکہ پوری کی پوری ترقی پسند تحریک نظرانداز کر دی جاتی ہے۔ یوں بین الاقوامی ذرائع ابلاغ بھی مقامی استبدادی حکمران طبقہ کا کردار دہراتے ہیں۔

نوآبادکاروں کے چلے جانے کے بعد قائم ہونے والی عرب حکومتوں نے تعقل دشمنی کا رویہ اختیار کیا۔ پچھلی کچھ دہائیوں سے تمام مطلق العنان حکمران ایک ہی خواب دیکھتے رہے کہ کسی طرح امام کی اطاعت اور خدا کی اطاعت کو مماثل قرار دے دیا جائے۔ یہ خواب ان حکمرانوں کا لائحہ عمل اور ان حکومتوں کا قانون بن گیا ہے جو خود کو تقدس پر مبنی خیال کرتی ہیں۔ تعقل پر تنقید کرنے والے حکمران کی، یعنی اسّی کی دہائی کی، مسلم دنیا انحطاط میں ڈوب گئی۔ خلیجی جنگ ہمارے اس عسکری، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی انحطاط کو ہمارے عالم شعور تک لے آئی۔ لیکن سی این این نے اسے ساری دنیا کے سامنے لاکھڑا کیا کہ یہ کیسے جزواً خواندہ مگر رائے سے محروم دنیا نظر آتی ہے۔

بارہویں صدی کے ایرانی عالم شہرستانی نے اپنی حیرت انگیز کتاب ''الملل والنحل'' کشفی مذاہب اور جعلی عقائد'' میں بڑا واضح طور پر بیان کیا ہے کہ کس طرح تعقل کو ایک طرف کرتے ہوئے اطاعت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کشفی مذاہب کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا۔ یوں طاعت اور کشفی مذاہب کو دو الگ حقیقتوں کے طور پر دیکھنے کا رواج ختم ہوا۔ باقی ہر چیز جعل سازی اور ایجاد بندہ قرار پائی۔ یوں اہل الحدیث فاتح اور راہ راست پر قرار پائے۔ ذاتی رائے کے اجزاء یعنی قیاس اور ستدلال جیسے تصورات فرقہ سازی کے آلات یعنی ''نحل'' قرار دے کر ہمیشہ کے لئے معطل کر دیئے گئے۔ لفظ نحلہ کا مطلب ''نقالی'' اور ''جعل سازی'' ہے۔ یوں آزادانہ رائے کو ہمیشہ کے لئے معطل کرتے ہوئے مجرمانہ سرگرمیوں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا، جو امت کے اتحاد کو تباہ کر سکتی ہے۔ یوں اسلام اپنے تعقلی طریق سے محروم ہوا۔ آج ہمیں اس چیز کو اسلامی ورثہ کے طور پر قبول کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جسے شہرستانی نے اپنی اصطلاحات میں یوں بیان کیا ہے کہ یا تو ہم اعتقاد اور اطاعت سے وابستہ رہیں یا پھر اپنی رائے وضع کرنے کا اختیار کریں۔ یہ سوال ہمیشہ اٹھایا جاتا رہا ہے لیکن بارہویں صدی کے بعد سے اس کا جوابی ردعمل تبدیل نہیں ہوا، جوابی ردعمل وہی ہے جسے جابرانہ طرز حکومت کا دفاع کرنے والے ہمیشہ سے اختیار کئے ہوئے ہیں کہ ذاتی رائے کا مطلب اسلام کو کمزور کرنا اور دشمن کے مقاصد کو پورا کرنا ہے۔

شہرستانی نے جہانِ آدم کو دو حصوں میں بانٹ کر اپنی طرف سے بات کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانوں کے دو گروہ ہیں، ایک وہ جو الوہی مذاہب میں سے کسی ایک پر ایمان رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو انفرادی یعنی ذاتی رائے کا رجحان رکھتے ہیں۔ ''کسی مذہب پر ایمان رکھنے یا ایسا دعویٰ کرنے والوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ یا تو وہ کوئی عقیدہ اختیار کر لیں یعنی پہلے سے موجود عقائد میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہو جائیں اور اسے اختیار کر لیں یا پھر اپنی رائے اختیار کریں یعنی اپنی متکبرانہ ذاتی رائے سے کوئی عقیدہ تراش لیں۔'' عمر ابن الخطاب کے وقت سے تمام مسلم خود آگاہ مردوں اور عورتوں کو ایک ہی قضیئے کا سامنا ہے کہ وہ اندھا ایمان لائیں یا پھر اپنی قوت فیصلہ کو بھی بروئے کار آنے دیں۔ شہرستانی کے نزدیک اس قضیہ کا حل بہت سادہ ہے۔ مسلمان وہ ہے جو ایمان لے آیا اور اس نے اطاعت اختیار کی۔ مذہب تابعداری اور حکم بجا لانے کا نام ہے- وہی مسلم اپنے مذہب

پر ہے جو تابعدار ہے۔ خود اپنی رائے کو مقدم جاننے والا تجدیدی ہے جو دین میں اضافہ اور اختراعات کرتا ہے۔(24)

شہرستانی کی کتاب ''الملل والنحل'' میں تمام اصطلاحات موجود ہیں، جنہیں آج مسلم دنیا کو متزلزل کر دینے ووالی جمہوریت کی بحث میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ فریقین یہی اصطلاحات استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی بحث چھ اصطلاحات کے گرد گھومتی ہے جو متضاد قطبین پر جمع ہیں۔ ایک قطب حکمران اور رہنما کی اطاعت اور اس سے وفاداری کا ہے جسے خدا پر ایمان اور اس کی اطاعت سے ملا دیا گیا ہے۔ اس قطب پر تین اصطلاحات یعنی دین، اعتقاد اور اطاعت یوں باہم گتھی ہیں کہ الگ نہیں کی جاسکتیں جبکہ دوسرے قطب پر موجود تین اصطلاحات انفرادی ذمہ داری کی توثیق کرتی ہیں۔ ان میں سے پہلی رائے دوسری احداث (ایجاد، اختراع، جدیدیت) اور تیسری ابدع (تبدیلی) ہے۔ اب غور طلب حقیقت یہ ہے کہ یہی دوسرا قطب ہے جسے صدیوں سے منفی اور کج رو قرار دے کر مذمت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اپنا اثبات اور ذاتی رائے پر یقین کا مطلب یہ ہے کہ آپ محل اور خلیفہ کی ذات میں مرتکز امت کی طاقت میں کمی کر رہے ہیں اور یوں دشمن کے منصوبے کی تکمیل میں معاونت کر رہے ہیں۔ ذاتی رائے کے اظہار سے گروہ کی کمزوری اور اپنے اہداف و مقاصد کے حصول میں دشمن کی معاونت کا تصور ایک ایسی جذباتی رو ہے جسے عرب دنیا میں ہر وہ شخص استعمال کرنا چاہتا ہے جو جمہوریت کا راستہ روکنے کا خواہش مند ہے۔

شہرستانی کے وقت سے جابرانہ حکومتوں کے وابستگان اور محل سے وفادار اہل سیاست نے مسلمان کی جو تعریف مقرر کر رکھی ہے، فقہا اسے آگے بڑھاتے رہے ہیں۔ اس تعریف کی رو سے رائے، احدث اور ''ابدع'' کو مذہب کی توہین اور دین سے اخراج کے مترادف خیال کیا جاتا رہا ہے۔ بشریت نواز ورثہ، جسے اہل یورپ نے جابرانہ حکومتوں کے خلاف جدوجہد میں اخذ اور محفوظ کیا اور جس نے سائنسی ترقی اور سیاسی عمل میں انفرادی حصہ داری کی روایات قائم کیں، اگر ہماری رسائی میں ہوتا تو ہمارا تعقل پسند ورثہ ہم سے نہ چھنتا۔ مسلم رہنماؤں نے آزاد خیالی کا فلسفہ پھیلانے کی کوشش کرنے والے دانشوروں کے خلاف ہر حربہ استعمال کیا۔ ماضی کے معتزلین کی طرح انیسویں اور بیسویں صدی میں بھی ان دانشوروں کو ہراساں کیا گیا۔ ان کی مذمت کی گئی اور انہیں مذہب کی توہین کا مرتکب قرار

دیا گیا۔ اعلان آزادی کے بعد ان کی تحریروں پر پابندی لگی اور انہیں قید و بند کا تجربہ ہوا لیکن ایک فرق بہرحال موجود رہا۔ حکمرانوں کے نزدیک معتزلہ وہ باغی تھے جنہوں نے دین میں یونانی افکار داخل کئے ۔ جدید دور حاضر کے دانشوروں کو مغرب کے کارندے اور غلام قرار دیا گیا۔ بیسویں صدی کی بشریت نوازی کو، جسے دوسری قوموں نے اختراع اور انفرادیت کی آبیاری قرار دیا، ہمارے ہاں غیرملکی اثر قرار دے کر ممنوع کر دیا گیا-ہمارے ہاں دقیانوسی افکار کو مستقبل کے لئے مثالیہ قرار دیا جاتا ہے جس کی حفاظت کا ہم سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔

MashalBooks.org

باب3

جمہوریت کا خوف

عربوں کے لئے جمہوریت اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے جتنا بڑا مسئلہ حالیہ صدیوں میں ہونے والی پیش رفت، خصوصاً رواداری بطور اصول اور طرز عمل، تک ان کی نارسائی ہے۔ رواداری سے میری مراد سیکولر انسان دوستی ہے جس کی بدولت مغرب میں مہذب معاشرے کی اٹھان ممکن ہوسکی ہے۔ مغرب میں انسان دوستی یا بشریت نوازی کے بنیادی تصورات جیسے حریت فکر، انفرادی خودمختاری، عمل کی آزادی کا حق ارو بردباری کی ترویج سیکولر مدرسوں کے ذریعے ممکن ہوسکی۔ سوائے چند اسلامی ممالک کے (جن میں سے ترکی خصوصیت سے قابل فکر ہے) کسی جدید مسلم ریاست نے خود کو سیکولر قرار نہیں دیا اور نہ ہی انفرادی پیش قدمی یا خود فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی ذمہ داری لی ہے بلکہ اس کے برعکس، انیسویں صدی کی قومیت پرست تحریکوں میں انفرادیت کو قدرے مبہم مقام حاصل رہا۔ چونکہ یہ تحریک مغرب کے خلاف تھی اور مکمل طور پر مغرب دشمنی پر مرکوز تھی، چنانچہ اپنی جڑیں ماضی کے کسی بھی اور دور کی نسبت اسلام میں دور تک گاڑے رکھنا اس کی مجبوری تھی۔ عسکری اور سامراجی مغرب کا مقابلہ کرنے کے لئے قوم پرستوں کے پاس ماضی میں پناہ لینے اور اسے بطور پشتہ استعمال کرنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ یوں کہئے کہ نوابادیاتی جبر کے بھوت کو دور رکھنے کے لئے انہیں اپنی روایات کو بطور ''ثقافتی حدود'' استعمال کرنا تھا۔ مسلم ماضی، جسے از سرنو فعال کیا گیا، تعقلی روایت میں نئی شناخت قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ درحقیقت قوم پرست ایسی صورت حال کے قیدی تھے جہاں جدیدیت کے انتخاب کی گنجائش موجود نہیں تھی۔ ان کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو وہ نوآبادکاروں کی بشریت نوازی کی وراثت اپنانے کا دعویٰ کرتے ہوئے

جدیدیت اختیار کر لیتے جس میں ان کے اپنے اتحاد میں دراڑ پڑنے کا اندیشہ موجود تھا (اس لئے کہ تعقلی رائے لامحالہ تعقل اور رائے یعنی انفرادی فکر کو جنم دے گی اور یوں فکری اختلاف کا امکان قوی ہو جائے گا)۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ نوآبادکاروں کے خلاف اتحاد کا جذبہ برقرار رکھیں اور اس مقصد کے لئے ماضی کے مشترکہ ورثے سے جڑے رہ کر اطاعت کی حمایت کریں اور مغربی اختراعات پر اپنے دروازے بند کر دیں۔

بدقسمتی سے قوم پرست سیاستدانوں نے یہ دوسرا راستہ اختیار کیا اور ان کا یہ عمل کم و بیش اختیاری تھا۔ مسلم اور مغربی دونوں تعقلی ورثوں کی روح آزادی اختلاف تھی۔ اتحاد بچانے کے لئے اسی کو قربان کر دیا گیا۔ رواں صدی کی بیس اور تیس کی دہائی کے سیاستدان اور مصلح یہ نہ دیکھ سکے کہ استدلال کا دروازہ بند کرنے کے عمل میں مسلمان خود کو ایسے بے دست و پا ہجوم میں بدل رہے ہیں جسے خلیج کی جنگ کے دوران پوری دنیا نے ٹی وی پر دیکھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آبادیات کے ختم ہونے پر بھی مسلم ریاستیں تعقل کے خلاف اپنی جنگ سے لاتعلق نہیں ہوئیں۔ انہوں نے روشن خیالی کے فلسفے کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور مغربی بشریت نوازی کو غیرملکی اور درآمدہ قرار دے کر اس پر پابندی عائد کر دی۔ اس کا مطالعہ کرنے والے دانشوروں کو دشمن کے آلہ کار اور قومی مفادات کے غدار قرار دیا گیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مغرب سے اسلحے کی بڑے پیمانے پر درآمد کو اپنا پختہ شعار بنالیا۔ عرب ممالک نے اپنی کل قومی پیداوار کا خاصا بڑا حصہ فوجی اخراجات کے لئے مختص کر دیا۔ فوجی اخراجات کا تناسب مغربی ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ اس عمل نے مغرب پر عربوں کے انحصار کو دوگنا کر دیا۔ اہل مغرب نے اسلحہ کی فروخت سے حاصل شدہ رقوم اپنی خلائی تحقیق اور صنعت میں صرف کی اور ان شعبوں میں ترقی کی رفتار تیز کی۔ عالمی مزدور تنظیم کے ایک جائزے کے مطابق مغربی ممالک میں اسلحہ سازی سے وابستہ افرادی قوت ہوائی اور خلائی جہازوں کے تحقیقی اداروں میں مرتکز ہے۔ بیلجیئم، فرانس، سویڈن، اٹلی، فن لینڈ اور یونان میں دفاعی محکموں کے لئے مختص بجٹ کا بالترتیب 33، 25، 47، 35 اور 35 فی صد دفاعی تحقیق پر خرچ ہو رہا ہے جبکہ امریکہ میں یہی شرح 40 فیصد ہے۔ (1) مغرب کی بالادستی میں اتنا حصہ اس کے فوجی ساز و سامان کا نہیں جتنا اس امر کا ہے

کہ اس کے فوجی اڈے درحقیقت لیبارٹریاں اور فوج دراصل سائنسدانوں اور انجینئروں کے دستے ہیں۔ مذکورہ بالا سروے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ دفاعی صنعت دوسرے شعبوں میں بھی روزگار فراہم کرتی ہے۔ ان ملحقہ شعبوں میں الیکٹرانکس اور ابلاغیات زیادہ اہم ہیں۔ فرانس، سویڈن، اٹلی اور امریکہ میں دفاعی شعبوں سے وابستہ افراد کا بالترتیب 20، 23، 26 اور 30 فی صد الیکٹرانکس اور ابلاغیات سے منسلک ہے۔

مغرب اپنی فوجی طاقت تحقیق سے اخذ کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک مفعول صارف بن کر رہ جاتے ہیں۔ عرب ممالک کی کمزوری کا منبع ہی اپنے دفاعی تحقیقی ذرائع کے انتظام کے بجائے تیار شدہ ہتھیاروں کی خریداری ہے۔ خودانحصاری کا رستہ اپنا کر کوئی بھی عرب ریاست دو معجزے دکھا سکتی ہے- ایک تو محققین اور انجینئروں کی ایک پوری فوج کو روزگار دیا جا سکتا ہے اور دوسرے مغرب پر دفاعی انحصار سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

بیسویں صدی کی اسی کی دہائی میں دنیا بھر میں فروخت ہونے والے اسلحے کا چالیس فی صد مشرق وسطیٰ نے خریدا۔ یوں اس نے تیار سامان کی خریداری پر وہ وسائل ضائع کر دیئے جو بیروزگاری کے خاتمے میں استعمال ہو سکتے تھے۔

1980ء سے 1983ء تک کے درمیانی عرصے میں سوائے مشرق وسطیٰ اور لاطینی امریکہ کے دنیا بھر میں اسلحہ کی خریداری کے رجحان میں کمی ہوئی۔ مشرق وسطیٰ اسلحے کے سب سے بڑے گاہک کا کردار ادا کرتا رہا۔ 1983ء میں اسلحہ کی عالمی منڈی کی کل فروخت کا چالیس فی صد اور ترقی پذیر ممالک کو فروخت ہونے والے اسلحہ کا 55 فی صد خریدا۔ (2)

1983ء میں دنیا بھر میں اسلحہ کی سب سے بڑی خریداری چار عرب ممالک عراق، سعودی عرب، لیبیا اور مصر نے کی۔ ان ممالک کے سربراہ اس امر کو بھول جاتے ہیں کہ قوت کی مظہر اشیاء کی پرستش کا زمانہ گزر چکا اور تیار شدہ فوجی ساز وسامان کی درآمد سے انحصار کم ہونے کی بجائے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ سعودی عرب کے ایک بہت بڑے فوجی منصوبے پر، جسے امریکیوں نے ''شاہ خالد ملٹری سٹی'' کا نام دیا، تقریباً چھ بلین ڈالر خرچ ہوئے- لیکن اس ناقابل یقین حد تک بڑی سرمایہ کاری کے باوجود خلیج کی جنگ چھڑی تو سعودی عرب خود اپنے دفاع کے قابل نہیں تھا اور اسے امریکی معاونت طلب کرنا ناگزیر نظر آنے لگا۔ خلیج کی

جنگ نے نہ صرف سعودی عرب بلکہ دوسرے تمام عرب ممالک کے متعلق واضح کر دیا کہ وہ اپنے دفاع کے لئے کس حد تک دوسروں کے مرہون منت ہیں۔ اسلحہ کی اس طرح خریداری نے عربوں کی سائنسی اور دانشورانہ ذہانت کی راہیں مسدود کر دی ہیں۔ اس مقصد کے لئے لازم عنصر یعنی عامتہ الناس میں تعلیم کی کمیابی نے ایک اثر یہ ڈالا ہے کہ جمہوری تمدن کا حصول ناممکن بنا دیا ہے۔

عرب دنیا میں بیروزگاری کا تعلق اس بڑے پیمانے پر اسلحے کی درآمد سے بھی ہے۔ اس طرح کی درآمد پر وسائل خرچ ہوئے چلے جاتے ہیں لیکن کسی طرح کا زیریں ڈھانچہ وجود میں نہیں آتا ہے۔ میں اسلحہ کی خریداری پر زیادہ زور اس لئے دے رہی ہوں کہ عورت ہونے کے ناطے میری خیال میں جو سوالات فوری طور پر عوام کے سامنے اٹھائے جانا ضروری ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آیا واقعی ہمیں خود کو اتنے غیر پیداواری اور احمقانہ طریقہ سے مسلح کرنے کی ضرورت ہے؟ یہ بہتر نہیں کہ ہم جاپان کی مثال پر عمل کریں جس نے اسلحہ کی بجائے سائنسی تحقیق پر مبنی قوت کا انتخاب کیا؟ جدید یورپ کی طاقت سرکاری سکولوں کے ذریعے انسانیت نوازی کی اشاعت میں ہے، جس تک ہم عرب ممالک کے باشندوں کی کبھی رسائی نہیں ہوئی۔

ریاستی عدم تعاون اور مصلحین کا ڈھلمل رویہ:

امریکی ماہر سماجیات جیمز ڈیولیسن ہنٹر کی تعریف پر پورا اترنے والی سیکولر بشریت نوازی امریکی سرکاری تعلیمی اداروں میں دی جانے والی تعلیم کا لازمی جزو ہے۔ ''سرکاری سکولوں کا نصاب اس طرح کا بنایا گیا ہے کہ اس میں انسان کی انفرادی شخصیت کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ شخصی احساسات اور شخصی ضروریات و اقدار کے موضوعی سطح پر اخذ کئے جانے کی ضرورت کی عکاسی ہوتی ہے اور ان میں سے کسی کا بھی روایتی مذہبیت پر انحصار نہیں ہوتا۔''(5)

امریکی سیکولر بشریت نوازی بجائے خود مذہب کے اس درجہ خلاف نہیں تھی بلکہ اس کا مرکزی ہدف مذہب میں ریاستی مداخلت اور خصوصاً ریاست کی طرف سے مذہب کو مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے خدشے کا سدباب تھا۔ اس طرز فکر کی کامیابی اس حقیقت

سے عیاں ہے کہ امریکہ انتہائی مذہبی ریاستوں میں شمار ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ چرچ ابھی تک باقی ہیں بلکہ ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

امریکہ میں پروٹیسٹنٹ عقیدے کے لوگ مذہبی تمدن پر غالب اور ہر جگہ نظر آتے ہیں لیکن دوسرے فرقے اور مذاہب بھی موجود ہیں۔ ''امریکی آبادی میں 28فی صد کیتھولک عیسائی، 2.5فی صد یہودی اور 1.6فی صد مورمن عیسائی ہیں۔ ان میں سے مورمن فرقہ کی تعداد میں دوسروں کی نسبت زیادہ تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ زیادہ اہم اور قابل غور حقیقت یہ ہے کہ یہودی مسیحی روایت سے باہر بھی کثرت ادیان دیکھنے کو ملتی ہے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی تعداد مورمن عیسائیوں کے تقریباً برابر اور اسقفی عیسائیوں (Episcopalians) سے زیادہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندو اور بدھ مت کے پیروکاروں کی تعداد میں بھی قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔(6)

رواداری اور فکری حریت کی پرچارک سیکولر بشریت نوازی کسی طرح بھی مذہب پر حملہ نہیں بلکہ یہ مذہبی پرچار میں حکومتی مشینری، وسائل اور اداروں کے استعمال کی روک تھام ہے اور کوئی بھی مذہب اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

نوآبادیاتی تجربے سے گزرنے والے یعنی غیر مغربی ممالک تاریخ کے اس دور سے نہیں گزرے جو سائنسی جذبے کی تشکیل کے لئے ناگزیر ہے- یہ تاریخ کا وہ دور ہے جب مغرب میں ریاست اوراس کے ادارے رواداری اور فرد کی تکریم وتحریم کے خیالات کی ترویج کے لئے کام کر رہے تھے جبکہ دوسری طرف نوآبادیاتی حکومتیں بے حس اور تمدنی اعتبار سے نہایت محدود تھیں۔ ان کی جگہ لینے والی قومی حکومتیں بھی علمی جذبے اور انفرادی پیش قدمی کے خلاف اتنے ہی معاندانہ اور دشمنانہ رویے کی حامل تھیں۔ یوں تیسری دنیا گذشتہ صدیوں میں بشرنوازی کے دونوں پہلوؤں میں ہونے والی ترقی سے کٹی رہی۔ بشرنوازی کے فروغ کا ایک پہلو سائنسی تھا جو سائنسی سرگرمیوں اور دریافت و اختراع کی حوصلہ افزائی میں حکومتی وسائل کے فروغ پر مشتمل تھا۔ دوسرا پہلو سیاسی تھا جس نے جمہوریت کے قیام، مقتدرہ کے انتخاب میں شہریوں کی بذریعہ ووٹ شرکت کی حوصلہ افزائی اور سیاسی فیصلہ سازی کے عمل میں ان کی شرکت کو یقینی بنایا۔ تیسری دنیا اس عمل سے نہیں گزری اور نتیجے کے طور پر ایک بحران کی گرفت میں آ گئی اور تاحال اس کے چنگل میں گرفتار ہے۔ جدید عرب

ریاستوں میں یہ صورت حال بعض اوقات پھٹ پڑنے والی عدم رواداری اور ملکی رہنماؤں اور زمانہ حال کو مسترد کئے جانے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بعض حالات میں اس کا اظہار بے اختیار اور لاچار طبقے سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی اس خواہش کی صورت ہوتا ہے کہ عرب دنیا چھوڑ کر یورپ جا بسیں۔ ایسے حالات بھی ہوتے ہیں کہ یہی حقیقت دانشوروں کی خود اپنے ملک سے بیزاری کا روپ اختیار کر جاتی ہے جسے ہشام جائیت نے کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

''ایسی ریاست سے متعلق ہونا جو مستقبل کے حوالے سے ہر طرح کے عزائم اور طرز فکر سے عاری ہو نہایت تذلیل کن ہے- ایسی ریاست جو جابر نہیں تو مطلق العنان ضرور ہے' ایسی ریاست جہاں نہ تو سائنس ہے اور نہ ہی تعقل، حسن حیات اور حقیقی تمدن۔ ایسی ریاست مجھے پسماندہ رکھتی ہے اور جب مجھے اس دیہی، غیر شہری سماج میں جاہل اور بے خبر حکمرانوں کا محکوم رہنے کی ذلت بھی اٹھانا پڑتی ہے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ بطور دانشور مجھے اپنا آپ نیوراتی لگنے لگتا ہے۔ یہ بشری تقاضوں کے عین مطابق اور جائز ہے کہ میں اپنی کیفیت دوسرے لوگوں تک منتقل کروں اور لوگوں کی بغاوت بتاتی ہے کہ یہ بے قراری اور بے کیفی فقط ایک دانشورانہ بنت نہیں ہے۔''

اس انداز میں سوچنے والے لاکھوں نہیں تو ہزاروں بہرحال ہوں گے، جن کی نمائندگی جائیت کر رہا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ تیسری دنیا کے بیشتر باسیوں کی طرح عربوں کے پاس بھی جدید پیش رفت تک رسائی کا کوئی باقاعدہ وسیلہ موجود نہیں۔ اس پیش رفت کی جڑیں روشن خیالی کے ورثے میں ہیں اور روشن خیالی ایسا نظریاتی انقلاب ہے جس نے ازمنہ وسطیٰ اور دور اصلاح پسندی کی قلعی کھولی اور سیاسی مقتدرہ کے جاگیردارانہ بہروپ اور اخلاقی مقتدرہ کے مذہبی بھیس کو واضح کیا۔ (6)

لیکن عرب دنیا میں بے اصول حکومتوں کو جائز قرار دینے اور ان پر کسی نظریے کا نقاب چڑھا دینے کی ازمنہ وسطیٰ کی روایت تا حال موجود ہے۔

''مسلمانوں نے جدت کو ماضی سے انقطاع کی صورت میں کبھی نہیں سوچا بلکہ وہ اسے ماضی سے نئے انداز کے رشتوں کی استواری کے طور پر لیتے ہیں۔ وہ

جدت کے مظہر پر ترقی کی بجائے احیاء کی اصطلاح میں غور وفکر کرتے ہیں جو اپنے حتمی نتائج میں دراصل جادو یا اساطیر کی راہ ہے۔ بیشتر اوقات مسلمانوں، مسلم سیاسی اور مذہبی مفکرین کا طرز فکر ان اصولوں کے عین متضاد ہوتا ہے جو آزادی فکر کی درست تفہیم سے جنم لیتے ہیں۔''

آج ہم سابقہ نوآبادیات پر مشتمل عرب دنیا میں بیٹھے اس پر طاری جمہوریت کے خوف کی بات کرتے ہیں تو ہم ایسے ذہنی سانچے کے اندر رہتے ہوئے بات کرتے ہیں جس کی صورت پذیری اجزاء کی کمی، انقطاعات اور تعطلات سے مرکب ہے۔ اس لئے لوگوں کو جدت کا تجربہ اس کے بنیادی اصولوں کی تفہیم کے بغیر ہوتا ہے اور فکری آزادی کو خارجی بغاوت اور انتشار کے ہم معنی خیال کر لیا جاتا ہے جو ایک طرح کی شیطنیت ہے۔ ریاست ہمیں پروپیگنڈے کا ہدف بنانے کے لئے ریاستی تعلیمی ادارے استعمال کرتی ہے۔ لیکن، صدر ریگن کی تجویز کے برعکس، اس کا حل سرکاری تعلیمی اداروں کی جگہ نجی تعلیمی ادارے کھولنا نہیں ہے۔ عرب دنیا تعلیم میں نجی شعبے کی معاونت پر انحصار نہیں کر سکتی۔ نجی شعبہ کارکنوں کے حقوق تسلیم نہیں کرتا اور کارکنوں کی تنظیموں اور سماجی تحفظ کی ذمہ دار مقننہ کی عدم موجودگی میں اپنے منافع میں انہیں حصہ دار بنانے کو تیار نہیں۔ تاحال عرب دنیا کا نجی شعبہ سماجی اہمیت کے حامل منصوبوں میں کوئی حصہ نہیں لیتا اور یوں بھی ہمارے تمدن میں نجی تعلیم نہایت محدود کردار ادا کرتی ہے۔ آنے والی دہائیوں میں ریاست اور اس کے تعلیمی ادارے جمہوری تمدن و اقدار کی اشاعت و استقرار اور شہریوں میں بردباری اور تحمل کی تعلیم کا واحد ذریعہ رہیں گے۔

مراکشی فلسفی علی املیل نے ''عرب اصلاح پسندی'' (10) کی بنیادوں میں موجود فکری ابہام کی نشان دہی کی ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہونے والی قوم پرست تحریکوں نے ماضی سے رشتہ توڑے بغیر مسلم تمدن کو جدید بنانے کی کوشش کی ہے.....اس ماضی سے جو آمرانہ جبر اور تقدس تلے دبا ہوا تھا۔ ان تحریکوں نے مغربی جمہوریت اور جدیدیت کے ''آئین''، ''پارلیمنٹ'' اور ''عام حق رائے دہی'' جیسے اداروں کو متعارف کرایا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ عوام کو ان اداروں کی فلسفیانہ بنیادوں یعنی انفرادی خودمختار اور رائے کی آزادی جیسے ناگزیر تصورات سے روشناس کرانے

میں ناکام رہے۔ بہت سے قومی رہنما اپنی اصل میں مذہبی رہنما تھے جنہیں عسکری مزاج رہنماؤں نے تحریک میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا اور یوں انہیں اپنا مافی الضمیر فوجی اصطلاحات میں بیان کرنا پڑا۔ یہ امر بھی لازماً پیش نظر رکھنا ہوگا کہ تیسری دنیا کے اور کئی ممالک طرح، پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں عرب دنیا میں بھی فوجی ایوان اقتدار میں داخل ہوگئے۔ یہ مسئلہ بھی کبھی فلسفیانہ سطح پر موضوع بحث نہیں بن سکا۔ املیل کے الفاظ میں، ''فلسفی کسی شمار و قطار میں نہ تھا، اسے کبھی دعوت نہ دی گئی کہ وہ اصلاحی خیالات کے داعی کا کردار ادا کر سکے۔ یہ کردار فقہا یعنی مذہبی ماہرین کے سپرد کر دیا گیا۔

کئی مصلحین نے بلا تاخیر آئین کے تصور کو شریعت یعنی الوہی قوانین سے جوڑنا شروع کر دیا۔ اپنی مطلق العنانی کی توسیع و تقویت کے لئے جواز کے متلاشی سیاستدانوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور مسئلے کو مزید الجھا دیا۔ الوہی قوانین اور آئین کے الگ الگ ہونے پر اصرار کرنے والوں کو کافر، دینی شعار کی توہین کے مرتکب، نوآبادکاروں کے حلیف اور دشمنوں کے آلہ کار قرار دیا۔

طٰہٰ حسین ہمارے عہد میں تعقلی روایات کے عظیم ترین علمبرداروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا انتقال 1972ء میں ہوا۔ انہیں دوران حیات ''رومی و یونانی افکار کے گمراہ کن استعمال، فرانسیسی افکار کے پرچارک حلیف اور، بعدازاں، امریکی افکار کی اشاعتی خدمات بجالانے پر (12) مذمت کا نشانہ بنایا اور ہراساں کیا گیا۔ انوارالجندی نے طٰہٰ حسین کے محاکمہ کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے ان پر ایک کتاب لکھی جو چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں طٰہٰ حسین کو کافر قرار دیا گیا۔ حضرت محمد ﷺ کی حیات مبارکہ پر لکھی گئی تابندہ ترین تحریروں میں سے ایک (جس سے میرا تعارف پرائمری تعلیم کے دوران ہوا)(13) کے مصنف کو الجندی کی کتاب کے سرورق پر عدالت کے کٹہرے میں دکھایا گیا۔ بیسویں صدی کے اواخر میں عرب دنیا میں رواداری کے فقدان کی وجہ یہی ہے کہ غالباً الجندی اور اس جیسے دوسرے لوگوں کو بنیادی تعلیم کے دوران کبھی نہیں سکھایا گیا کہ کسی مہذب معاشرے میں محض اختلاف رائے محاکمہ کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ کتابوں کی ایسی تمام دکانوں پر جو ورثہ پر تخصیص کا دعویٰ رکھتی ہیں، الجندی کی یہ کتاب دستیاب ہے اور الجزائر یا کاسا بلانکا میں کوئی بھی شخص اسے محض چند درہم کے عوض حاصل کر سکتا ہے۔ لگتا ہے وزارت اطلاعات کے افسران کو، جنہیں

خطرناک کتابیں سنسر کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس کتاب نے کوئی جھٹکا نہیں دیا۔ غالباً وہ عدم رواداری کو خطرناک خیال نہیں کرتے۔

پارلیمنٹ اور آئین درآمد کر لئے گئے لیکن عوام پر ان کی روح واضح کی گئی اور نہ ہی عیاں ہونے دی گئی۔ نتیجتاً عوام نے اس تصور پر غور وفکر ہی نہیں کیا جسے اب گناہ کا رنگ دیا جا رہا ہے۔ ہمارے عہد کی عرب دنیا میں حریت فکر کو انتشار پھیلانے کی آزادی کے طور پر لیا جا رہا ہے۔

قومیت پرست تحریک کے اصلاح پسند بازو کے فکری نمائندہ رفعت التحتاوی نے پارلیمانی نظام کی بنیاد یعنی بشر نوازی کی تحریک کے ایک بنیادی اصول کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذہب کی آزادی دراصل عقیدے اور رائے کی آزادی ہے۔ ''شرط صرف یہ ہے کہ اسلام کو نہ چھوڑا جائے۔'' (14) ایک جدید مسلم ریاست کی خاکہ کشی میں معاونت کرنے والے دوسرے مصلحین کی طرح وہ بھی پارلیمنٹ اور آئین کے خواہاں تھے جس کے ساتھ حریت فکر ایک جزو لازم کے طور پر وابستہ ہو۔ برداشت اور بردباری پر التحتاوی کے خیالات پرائمری اور سیکنڈری سطح پر پڑھائے گئے اور آج بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ التحتاوی ان مثالی ہستیوں میں سے ہیں، جنہوں نے نوجوان عرب نسل پر نئے ذہنی افق وا کئے۔ جدیدیت کے فروغ کی سعی کرنے والوں میں التحتاوی ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ہم عملی زندگی کا آغاز اس شعور کے ساتھ کرتے ہیں کہ آزادی رائے کی بھی حدود ہیں جن کی سختی سے نگرانی کی جاتی ہے۔ ان ''حدود'' سے کسی صورت تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم میں سے کئی، جو اس نظام تعلیم کے باعث تذبذب کا شکار ہیں، اس صدی اور دوسروں کی رائے کے احترام کے معنی سمجھنے میں ناکام رہے تو کچھ زیادہ ناقابل فہم امر نہیں ہے۔ عربوں کی اکثریت، جو تاحال ناخواندہ ہے، اس تذبذب سے محفوظ ہے۔ انہوں نے التحتاوی کو پڑھتا ہے اور نہ کبھی رواداری پر کچھ سنا ہے۔

چند اہل مغرب کو حیرت ہوتی ہے کہ آج یونیورسٹیوں میں سائنسی علوم کے شعبہ جات اور تکنیکی و سائنسی علوم کے ادارے بنیاد پرستوں کی نسل کشی کے مراکز بن چکے ہیں۔ یہی وہ ادارے ہیں جہاں بنیاد پرستوں کو بھرتی بھی کیا جاتا ہے۔(16) ایسے معاشروں میں سائنسدانوں کی تربیت کیسے ہوسکتی ہے جہاں فکری آزادی کو اسلامی تشخص سے متصادم مانتے

ہوئے مسترد کر دیا جاتا ہے اور پھر زیریں سائنسی ڈھانچہ بھی ناپید ہے جو صرف بنیادی سائنسوں پر تحقیق سے صورت پذیر ہوسکتا ہے۔

سائنس دانوں پر مشتمل اپنی ایک طاقتو رافرادی قوت پیدا کرنے کی بجائے عرب ممالک بنی بنائی اشیاء، خصوصاً سامان حرب کی درآمد کو ترجیح دیتے ہیں۔ دراصل صاحب اقتدار طبقے کو خدشہ ہے کہ کہیں باشعور افرادی قوت داخلی سطح پر ان کے اقتدار کے لئے خطرہ نہ بن جائے۔ اس لئے ہم بھاری درآمدات کرتے ہیں اور خوشحال طبقے سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کی ایک بڑی تعداد باہر بھیجتے ہیں۔ باہر جانے کی استطاعت نہ رکھنے والوں کو اس نیم سائنسی ماحول میں خود رو جھاڑ جھنکاڑ کی طرح چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جو شکل چاہیں اختیار کریں۔ تجربہ گاہوں کی ناقابل بیان کم مائیگی اور تحقیقاتی سہولتوں کے فقدان کے حامل سائنسی شعبہ جات میں (17) بنیاد پرستوں کے وجود میں آنے اور بڑھتے چلے جانے کو قابل اعتناء مسئلہ نہیں گردانا جاتا۔

جدیدیت کی فتح کے اس دور میں عرب ریاستوں (خواہ وہ امارات کی سی سرکاری طور پر اسلامی ہوں یا شام اور الجزائر کی طرح سیکولر) نے ہمیں گذشتہ تین صدیوں کے عالمی ورثے سے محروم کر رکھا ہے اوراس کے ساتھ ساتھ مذہبی تدریسی اداروں کی تعلیمات نے خود ہمارے اپنے ورثے کی شکل بھی بگاڑ دی ہے۔ ہم ایک بار پھر جمہوریت کے خوف کی طرف رجوع کرتے ہوئے اسے کھوجتے ہیں۔

خوف سے وابستہ ابہام: امیر اور اس کا شوفر:

لفظ ''خوف'' کئی طرح کے احساسات کا احاطہ کرتا ہے۔ کسی پرانے حمام کے فرش پر سے پھسلنے کا خوف اٹھتے ہوئے طوفان کی دہشت کا سانہیں اور بلاشبہ کسی جمعہ علی الصبح گرفتار ہونے اور اسی دوپہر یا پچھلی رات سپرد قلم کی گئی کسی تحریر کے حوالے سے توہین دین کا الزام لگ جانے کی دہشت بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔

یہی کثیر پہلو معنویت ہے، جس میں سے خوف میں پوشیدہ ابہام جنم لیتا ہے۔ اسی طرح کا ابہام جمہوریت کی اصطلاح میں بھی پوشیدہ ہے۔ یہ اصطلاح آزادیوں اور مراعات کے ایک متاثر کن طویل سلسلے کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں کئی افعال کی اجازت اور ٹیکس ادا کرنے

کی پابندیاں بھی شامل ہیں۔ سور کا گوشت کھانے، شراب پینے اور ممنوعہ تحریریں پڑھنے کا حق، محبت میں مبتلا ہونے کا حق، افلاطونی محبت تک محدود رہنے یا معاملہ اس سے آگے بڑھانے کا حق، اپنے ساتھی سے باقاعدہ شادی کرنے یا نہ کرنے کا حق، بچے پیدا کرنے یا نہ کرنے کا حق، قانون میں مقررہ کم از کم مزدوری کے مطالبے کا حق اور یہ مطالبہ پورا نہ ہونے کی ناانصافی کے خلاف یونین سے رجوع کا حق، وزیراعظم منتخب کرنے کا حق اور پھر عوامی خزانے سے چلنے والے سرکاری ٹیلی ویژن پر وزیراعظم کو ضرورت سے زیادہ نمایاں کرنے پر احتجاج کا حق سب جمہوریت میں شامل ہیں۔

جمہوریت کی خوف سے وابستگی یقیناً ابہام کو کئی گنا بڑھاتی اور عدم تیقن میں اضافہ کرتی ہے اور یہ امر تب خاص طور پر حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے جب ہمیں ادراک ہو کہ کسی ملک، مثلاً کویت، کے امیر کو لاحق خوف اپنی نوعیت میں اس کی بیوی اور بیٹیوں کو لاحق خوف سے مختلف ہے۔ امیر کا شوفر.....جو فرض کریں فلسطینی ہے.....اور طرح کے خوف میں مبتلا ہے اور اس کا خوف امیر کے پاکستانی، شمالی افریقی اور فلپینی گھریلو ملازمین کے خوف سے مختلف ہے۔ ایک ہی لمحے ہر کسی کا اپنا خوف ہے اور وہ اسے اپنے حالات کے مطابق مختلف نام دیتا ہے۔ عجیب وغریب لیکن ہر جگہ موجود جمہوریت الف لیلوی عفریت کی سی ہے۔ کسی بالغ کے سامنے یہ ترغیب دیتی دوشیزہ کے روپ میں آ سکتی ہے اور اسی لمحے سنسر کے کسی ذمہ دار افسر کے لئے یہ اڑنے والے اژدہے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ خوف کی اشکال کی اس درجہ بندی سے ہمارا مقصد محض جمہوریت کی قدرے بہتر تفہیم کی کوشش نہیں بلکہ ہمیں ان لگی بندھی شکلوں سے ذرا آگے نکل کر موجودہ ابہام کو دور کرنا ہے۔

کیا جمہوریت گاڑی یا ٹیلی فون سے زیادہ غیر ملکی ہے

عرب جمہوریت پر کوئی ڈیڑھ سو سال سے بحث کر رہے ہیں۔ اس سے وابستہ قضیہ یہ ہے کہ عربوں کے ہاں جمہوریت بھی ٹیلی فون، بجلی اور کاروں کی طرح فرانسیسی اور انگریز افواج کے ساتھ آئی ہے۔ جمہوریت کے لئے ہمارے پاس عربی زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ ہم یونانی لفظ دیموقریطیہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ غیر ملکی ہونے کے ناطے یونانی ورثہ ممنوع قرار دیا چکا ہے جمہوریت پر بات کرتے ہوئے دو

عرب یہی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔لیکن ہمارے پاس کار اور ٹیلی فون کے لئے بھی کوئی نام موجود نہیں ہے۔ ہم ان کے لئے بھی غیر ملکی نام ہی استعمال کرتے ہیں اور ذرائع ابلاغ سے بھی ایسی کوئی اطلاعات نہیں ملیں کہ مسلم سرزمین پر ''کار'' یا ''ٹیلی فون'' کے خلاف کوئی پر جوش مزاحمت سامنے آئی ہو۔کار کے لئے لغت میں لفظ ''سیارہ'' موجود ہے تا کہ ہم غیر ملکی لفظ استعمال کرنے کی مجبوری سے بچ سکیں، لیکن میں نے رباط میں کسی کو یہ لفظ استعمال کرتے نہیں سنا۔ لفظ ''ٹیلی فون'' پر بھی یہی حقیقت صادق آتی ہے۔ ایک عربی مترادف اصطلاح ''ہاتف'' موجود ہے۔لیکن مزدور، کسان اور عام نوجوان اسے ''تلی فون'' کہتے ہیں۔لغات میں تو ٹیلی ویژن کا مترادف بھی موجود ہے لیکن ہر کوئی ''تلی ویزین'' خریدنے پر مصر ہے۔ ان الفاظ کی مغائرت اور اجنبیت اپنی جگہ لیکن یہ الفاظ جن اشیاء کی اشارت ہیں وہ بے تحاشا خریدی اور استعمال کی جاتی ہیں۔ پوری اسلامی دنیا میں کسی بھی جگہ کسی ایک شخص نے بھی ان عجوبہ روزگار اور ناگزیر چھوٹی چھوٹی چیزوں کے استعمال میں مزاحمت نہیں کی۔ مخالف تحریکیں بھی، خواہ وہ کوئی بھی مقصد لے کر اٹھیں، اپنے پراپیگنڈے کیلئے انہیں وسیع پیمانے پر استعمال کرتی ہیں۔ان کے غیر ملکی ہونے کے حوالے سے کبھی کوئی سیاسی بحث نہیں چلی۔ اور کسی سیاسی، خصوصاً کسی سنجیدہ بنیاد پرست، جماعت نے ہمیں پیغام نہیں دیا کہ اسلام یا ٹیلی فون میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں لیکن جمہوریت کا معاملہ ہو تو رویہ الٹ جاتا ہے۔ آج کل جو بحثیں سرگرمی اور جوش و خروش سے جاری ہیں ان میں بنیاد پرست موقف اختیار کرتے ہیں کہ کوئی شخص یا تو جمہوریت پسند ہو سکتا ہے یا پھر مسلمان.....اس لئے کہ اسلامی تمدن میں جمہوریت کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ سعودی عرب جیسی مسلم حکومتیں جو اپنے لائحہ عمل کا جواز اسلام سے اخذ کرتی ہیں، جمہوریت کے لئے آواز بلند کرنے والوں کو کافر اور بے دین کہتی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دوسرے عرب ممالک میں آئین کے مبنی بر جمہوریت ہونے پر تنقید حزب اختلاف کی طرف سے اٹھتی ہے۔ مثال کے طور پر الجزائر اور تیونس کے سربراہان مملکت اور بنیاد پرست حزب اختلاف کے درمیان یہی امر متنازعہ بنا ہوا ہے۔

چنانچہ مسلم سیاسی شطرنج میں جمہوریت صرف اس وجہ سے تنازعہ اور کشمکش کا محور نہیں کہ یہ غیر ملکی ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ کار اور ٹیلی فون کے برعکس مسلمان جمہوریت کو اپنے مفادات سے ہم آہنگ نہیں پاتے یا پھر جمہوریت کے مخالفین کو اس میں کچھ ایسا نظر آتا ہے

جو ان کے مفاد میں نہیں۔

اس صورت حال میں یہاں ایک نہایت موزوں سوال اٹھتا ہے کہ آخر عامتہ الناس اس مسحورکن جمہوریت کو کیا خیال کرتے ہیں؟ ''یہ عفریت کیا ہے؟'' خالہ عزیزہ کلاسک عربی میں نشر ہونے والی ساڑھے آٹھ بجے کی خبروں کے بعد بڑبڑاتی ہیں۔ کوئی یہ کھل کر کیوں نہیں بتاتا کہ ''دیموقریطیہ'' کیا ہے؟ کوئی ملک ہے؟ کوئی عفریت ہے، کوئی جانور یا کوئی جزیرہ ہے؟'' پھر وہ وضو کے لئے اٹھ جاتی ہیں تا کہ قبلہ رو ہوکر عشاء کی نماز ادا کرسکیں۔ قطع نظر اس کے کہ جمہوریت کو کون کس طرح دیکھتا ہے اور اس کے لئے کونسی عینک استعمال کرتا ہے بلاامتیاز جنس، طبقہ اور آمدن ہر مسلمان فوراً تخمینہ لگا لیتا ہے کہ اس کے استعمال سے اسے کون کون سے فائدے اور کتنا افادہ ہوگا۔ انہی مفادات کے حصول کی خاطر اہل ایمان روزانہ باہم دست و گریباں ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ اشیاء زیادہ تر غیرملکی کمپنیاں تیار کرتی ہیں جنہیں مسلمانوں کے مفاد کی رتی برابر پروانہیں لیکن ان کی یہ بے حسی ان اشیاء سے حظ اور استفادہ کرنے والے مسلمانوں کو کسی اضطراب سے دوچار نہیں کرتی جبکہ جمہوریت کے ساتھ یہ معاملہ نہیں۔ لوگوں کے کچھ گروہ ایسے ہیں جن کے مفادات جمہوریت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں یا وہ ایسا خیال کرتے ہیں۔ خصوصاً وہ لوگ جنہیں غیرملکی زبانوں پر عبور ہونے کے باعث مغرب کے حالات وتمدن سے آگہی حاصل ہے (وہ بینک کریڈٹ، سوشل سکیورٹی اور باتنخواہ چھٹی کے ممکن الحصول ہونے کو بھی اپنی اس اہلیت کی برکات میں شامل کرتے ہیں)۔ اس گروہ میں شہروں کے باسی بورژوا طبقے کے مرد و زن شامل ہیں جو عموماً مالیات اور کاروبار جیسے شعبوں سے وابستہ ہیں۔ یہی حال یونیورسٹی پروفیسروں، فن کاروں اور دانشوروں کا بھی ہے۔ یہ سب کسی نہ کسی طور علم کی تخلیق اور اس کے استعمال سے وابستہ ہیں۔ کم از کم اس حوالے سے جدید اور روایتی دونوں علوم کے ماہرین ایک سا طرزفکر رکھتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو دیموقریطیہ کو اپنے مفادات کے لئے خطرہ خیال کرتے ہیں۔ جمہوریت کے خلاف ان کی شدت جذبات کو دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ یہ جمہوریت کو اپنی بقاء کے لئے یقینی خطرہ خیال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِن لوگوں کا مذکورہ بالا طبقے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کے مفادات بھی مذکورہ بالا طبقے کے مثبت مقاصد سے متصادم ہیں۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ ان کا جمہوریت کا ادراک اتنا مسخ ہو کہ اس کے شخصی اور سیاسی تقدم جیسے نتائج انہیں

اپنے لئے خطرہ محسوس ہوتے ہوں؟ کیا ایسا بھی ہے کہ ہمارے معاشروں کا لاوارث ترین طبقہ خود اپنے ایسے لوگوں سے خطرہ محسوس کرتا ہے جنہوں نے اپنی ایک شناخت بنا لی ہے اور کسی اور سلسلہ تعلقات کی کڑی بن گئے ہیں۔ خصوصاً وہ جو بہت طاقتور ہیں اور بین الاقوامی پیمانے پر مال بناتے ہیں۔

لیکن ایک حیران کن امر یہ بھی ہے کہ جو حقیقت فرد پر صادق آتی ہے، حکومتوں کے لئے بھی درست ہے۔ اسلام کی ضرورت کچھ حکومتوں کو زیادہ ہے۔ انہیں دوسری حکومتوں کے مقابلے میں اپنی شناخت کسی مذہب کے حوالے سے کروانے کی زیادہ ضرورت ہے۔ حکومتیں دو قسم کی ہیں: وہ جو جمہوریت کو مذہب سے متصارم قرار دے کر مسترد کر دیتی ہیں اور وہ جو اسے اختیار کرتی ہیں۔ بہرحال حکومت کسی بھی طرح کی ہو، سب ٹیلی فون اور موٹر کاریں استعمال کرتی ہیں اور عوامی خزانہ ایسی چیزوں پر لٹاتی ہیں جن کی عوام کو کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسلحہ بھی انہی اشیاء میں شامل ہے، جس کی قیمت سن کر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ روپے کا دوسرا مصرف ایسے آلات اور انتظامات ہیں جن کی مدد سے ہماری نگرانی کی جا سکے۔ لیکن اگر حتمی تجزیہ پیش نظر رکھا جائے تو یہ سب جزئیات ہیں۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ تمام عرب ممالک کو نگرانی کے الیکٹرانی ذرائع اور ان سے وابستہ ذرائع ابلاغ کے نظام اپنی دست قدرت میں رکھنے کا شوق ہے، لیکن اس کے باوجود ان میں سے کچھ اپنی حکومتوں کو جائز قرار دینے کے لئے ان کا مذہب پر مبنی سمجھا جانا ضروری خیال کرتے ہیں جبکہ کچھ ممالک جمہوریت سے چمٹے ہوئے ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ سعودی عرب کو، جس نے صدر کارٹر اور ریگن کے عہد حکومت میں امریکی فوجی الیکٹرانکس کے شاہکار ایویکس (AVACS) طیاروں کے حصول میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے رکھا، تونس کے مقابلے میں مذہب سے منسلک رہنے کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے؟ عرب دنیا میں مذہب کے لئے گونجتی اس پکار کے پس پردہ کیا ہے؟ اس ضرورت کا اظہار کرنے والے کے لئے یہ طلب کیا معنی رکھتا ہے.....وہ شخص جو قاہرہ یا الجزائر کے پس ماندہ دیہی علاقوں کا غریب طالب علم بھی ہو سکتا ہے اور تیل کا شہزادہ بھی جو ناگزیر طور پر پینٹاگون سے جڑا ہوا ہے۔ ایک بات بہرحال یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ نوے کی دہائی میں اسلام کے لئے بلند ہونے والی آواز کے مقاصد اور ضروریات اتنے غیر متعین بھی نہیں

ہیں۔ ان ضروریات کو نہ تو محض ماضی یا قدامت پرستی قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی محض روحانی ضروریات اس کے پیش نظر ہیں۔

جہاں تک حکومتوں کا تعلق ہے تو کچھ ایسی ہیں کہ جو اپنے مفادات کے بہتر تحفظ کی ضمانت اسی امر میں سمجھتی ہیں کہ اپنے وجود کے جائز ہونے کی بنیاد جمہوریت کے علاوہ کسی دوسری تمدنی اور علامتی زمین میں گاڑیں۔ زیادہ تر معاملات میں تقدس، ماضی اور اسلاف پرستی کو زیادہ زرخیز زمین خیال کیا جاتا ہے۔ اس درجہ بندی میں آنے والے حکومتی گروہوں میں سعودی عرب کی بادشاہت ، امام خمینی یا ان کے جانشینوں کا ایران، ضیاء الحق کی فوجی حکومت کا پاکستان اور سوڈان شامل ہیں جو اپنے عوام کو شریعت کے نام پر خوفزدہ رکھتے ہیں۔

جو کچھ مسلمان حکومتوں کے لئے سچ ہے، مسلم حزب اختلاف پر بھی صادق آتا ہے۔ بنیاد پرست حزب اختلاف کی جماعتوں میں سے زیادہ تر آزادی اور ترقی کے لئے اپنی جدوجہد کی جڑیں ماضی میں گاڑتی اورمغرب اور اس کی جمہوریت کو مسترد کرتی ہیں۔ حزب اختلاف کی کچھ قوتیں ایسی بھی ہیں جو مغربی جمہوریت کو اپنے لئے خطرہ محسوس نہیں کرتی ہیں اور انہیں اس کی وجہ سے اپنی عرب یا مسلم شناخت خطرے میں نظر نہیں آتی ہے۔

ایک ریاست جو جمہوری ہے یا جمہوری ہونے کا عزم رکھتی ہے، کسی کے لئے کیونکر باعث اضطراب ہوسکتی ہے۔ یہ ریاست جو طاقتور عرب اور اسلامی تشخص پر استوار ہوگی، بڑی جرات سے تاریخ کے فطری بہاؤ یعنی جدیدیت کے ساتھ گامزن ہوگی، لیکن مستقبل میں اس کے پیش نظر کچھ دوسرے اہداف کا حصول ہوگا جن میں سے کچھ آج ہمارے علم میں ہیں اور کچھ کا ادراک ہمیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہوگا-(18)

دنیا اور اس کے نظریات قبول کرنے پر آمادہ ایسی عرب ریاست جسے حالیہ صدیوں کی سائنسی ترقی میں اشتراک عمل کے ورثے کی قوت میسر ہو، موجودہ ریاستوں کی نسبت ہمارے عرب اور اسلامی تشخص کی بہتر حفاظت کر سکے گی۔ خلیجی جنگوں نے اچھی طرح واضح کردیا ہے کہ عوام اور ان کے معاملات سے لاتعلق عرب ریاستیں جو تعقل اور جمہوری اشتراک دونوں خوفزدہ ہیں، اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت نہیں کرسکتیں۔

خلیج کی جنگ کے باعث جذباتی حرکیات اور لوگوں کے احساس عدم تحفظ کے حوالے

سے چند نہایت چشم کشا انکشافات ہوئے ہیں۔ سعودی اور کویتی افسر دوسرے عربوں، خصوصاً فلسطینیوں سے خوفزدہ تھے اور خود کو امریکیوں کے درمیان زیادہ محفوظ تصور کرتے تھے۔ خلیج کی جنگ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ تیل کی دولت سے حصول تلذذ کا موقعہ ملتے ہی عرب نوجوان ترک وطن کر کے مغربی ممالک میں جا بسنے پر کم از کم غور ضرور کریں گے جہاں ان کے ڈالر خود کار طریقے سے پہلے سے جمع ہیں۔ عرب دنیا میں امیر اور غریب کے مابین نفرت نہ سہی، عدم اعتماد خفتہ سطح پر موجود تھا۔ جنگ نے اس بداعتمادی کو شدت ضرور دی ہے۔ اس اضطراب میں آنے والی شدت کی جڑیں اقتصادی محرومی اور غیر مساوی مواقع میں ہیں۔ یہ مذہبی استحصالی اس اضطراب کو دو طرح سے استعمال کرتا ہے: ایک زبان احتجاج اور بغاوت کی ہے اور دوسری طبقہ محرومین کو آلہ کار بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔

مذہب اور محرومی کے امتزاج نے بحیرہ روم کے پورے خطے کو بارود کے ڈھیر پر لا کھڑا کیا ہے۔ اگر ہم سب قومیتوں کو فرد کی سطح پر فعال نہیں کرتے، اس صورت حال کے تجزیے میں سرگرم نہیں ہوتے اور اس سے پیدا ہونے والی تلخی اور انسانی تذلیل پر مرہم رکھنے کی کوشش نہیں کرتے تو ہمیں اس کے ہنگامے تلے کچلے جانے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ یہ ایسی بے چینی ہے جو عامتہ الناس اور دانشور دونوں کو متاثر کرتی ہے۔ نوجوانوں میں اس کا نتیجہ مذمت ذات کی صورت نکلتا ہے اور بہترین تعلیم کے حامل سے لے کر محروم ترین پر مشتمل یہ طبقہ بڑے پیمانے پر یورپ کو ہجرت کر جاتا ہے.....ایسے مغرب کو جس نے اس بڑھتے ہوئے رجحان کے ردعمل میں اپنی دروازے بند کر لئے ہیں اور عربوں سے ویزوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔ جنگ خلیج کے دوران یورپ کا اعلان تھا کہ مشرق وسطیٰ کا تیل اس کی اقتصادیات کے لئے ناگزیر ہے، لیکن اب عربوں سے یورپ میں داخلے کی کڑی شرائط پوری کرنے کا مطالبہ ظاہر کرتا ہے کہ عربوں کا مغرب پر کوئی حق نہیں۔ بے روزگار نوجوانوں سے لے کر امیر ترین صنعت کاروں تک بیشتر کے نزدیک تعطیلات یورپ میں گزارنا ایک سہانے سپنے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں سے بہت سے عملی قدم بھی اٹھاتے ہیں۔ یورپ جانے کی مجنونانہ کوششیں کرتے ہیں لیکن درکار ویزے کے باعث بیشتر اوقات ناکام رہتے ہیں۔ ہماری قوم جو مکمل روزگار اور سیاسی ذمہ داری کی مسلسل ناآسودہ خواہش کے ہاتھوں شدید مایوسی کا شکار ہے، ایک بہت بڑے ہجوم کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے جس کے ہر

فرد کی ایک نظر آنکھ ٹی وی اور دوسری پاسپورٹ پر لگی ہے اور بحران وہ کہانی ہے جو ہر جگہ سننے کو ملتی ہے۔

عظیم محرومی: بحران اور زیاں:

پاکستان ہو مصر یا الجزائر، جب بھی کسی مسلم ملک میں جاتی ہوں، بطور ماہر سماجیات میرا اولیں پالا لوگوں میں موجود تلخی سے پڑتا ہے جو بالخصوص دانشوروں، نوجوان طبقے اور کسانوں میں ہر کہیں بلا استثناء پائی جاتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تلخی شدید خواہش کے سامنے مسلسل رکاوٹ سے پیدا ہوتی ہے، خرچ کرنے کی ناآسودہ خواہش سے وجود میں آتی ہے.....ملبوسات، روزمرہ کی اشیائے صرف اور تعیش و ضرورت کے مشینی ذرائع پر صرف کرنے کی عدم صلاحیت.....لیکن ساتھ ہی ساتھ کتابوں اور اچھی فلموں تک نارسائی بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ اور کارکردگی کے اظہار کے اظہار کے مواقع نہ ملنا بھی اسی قسم کے نتائج کو جنم دیتا ہے، کیونکہ اسی سے زندگی کو معنی ملتے ہیں اور فرد اپنے ماحول اور زمانے سے مفاہمت کی اہلیت حاصل کرتا ہے۔ مجھے کسی مغربی ملک میں ضائع شدہ اہلیت بروئے کار نہ آنے، دستیاب مواقع کی عدم مساوات یا کارحیات میں درپیش رکاوٹوں کے ردعمل میں اتنی شدید تلخی دیکھنے کو نہیں ملی۔ مثال کے طور پر مجھے سب سے زیادہ حیرت امریکہ میں ہوتی ہے کہ کس طرح اوسط درجے کی ذہانت اور اہلیت کے حامل لوگ بھی قدرت کی طرف سے عطا کردہ محدود صلاحیتوں کے اظہار کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ ملک میں ذہانت کا زیاں ناقابل برداشت ہے۔ نچلے اقتصادی طبقے کے لڑکوں لڑکیوں کو سنیں تو یہ احساس اور بھی تکلیف دہ ہوجاتا ہے۔ ''زندگی برباد ہوگئی'' کا حزنیہ ہر جگہ سننے کو ملتا ہے۔ زیاں کا یہ احساس جو ہمارے لوگ اپنے گرد لئے گھسٹتے پھرتے ہیں، مجھے یورپ میں کہیں دیکھنے کو نہیں ملا۔ جب یہ سسکی اور کراہ سننے کو نہ ملے تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی بیرون ملک ہوں۔ میں نے مغربی ممالک میں لوگوں کو جہد حیات، اوپر اٹھنے اور پھلنے پھولنے کے عمل میں نسبتاً معیاری رستوں پر چلتے پایا ہے۔

اگر مسلمانوں اور خصوصاً نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو، جنہیں بے روزگاری اور سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں اسلام اور جمہوریت کے مابین کشمکش جیسے مسائل

لاحق ہیں، سمجھنا ہے تو ہمیں ضائع شدہ اہلیت وصلاحیت پر اس ماتم کو لازماً زیرغور لانا ہوگا۔ اسلام اور جمہوریت کے درمیان برپا کشمکش میں شمولیت دراصل اس صدی کی ثقافت اور قوت بخش ہنر سے استفادے کے لئے بلند ہونے والی آواز ہے۔ اب مجھ سے سوال کیا جائے گا کہ بے روزگاری کا شکار ایک نوجوان جمہوریت کی مخالفت کرتے ہوئے دنیا میں آگے بڑھنے کی جدوجہد میں مذہب کو اپنی بنیاد کیوں کر بنا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ مذہب ذرائع روزگار تو پیدا نہیں کرتا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ناانصافیوں اور سماجی ناہمواریوں پر غور وفکر کا ایک راستہ ضرور فراہم کرتا ہے۔

مینا کو ٹریڈ یونین کی سمجھ نہیں لیکن وہ ناانصافی کو پہچانتی ہے

مینا ایک مراکشی قالین باف خاتون کارکن ہے، جس کی کلائی دوران کار فیکٹری میں ٹوٹ گئی۔ اس کا جو انٹرویو میں نے ہسپتال میں لیا، اس جیسے لوگوں کی جمہوری ثقافتی اور لسانی مجبوریوں کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔ باوجود دس سال تک کام کرنے کے اس حادثے کے بعد اسے مزدوری سے فارغ کر دیا گیا اور فیکٹری نے اسے کسی بھی طرح کی طبی معاونت یا زر تلافی دینے سے انکار کر دیا۔ رباط کے ہسپتال میں اس کے ساتھ ملاقات کے دوران میں نے اسے لیبر انسپکٹر سے رجوع کرنے پر مائل کرنا چاہا تو اس نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ کہنے لگی،'' سنو فاطمہ! مجھے بے وقوف سمجھتی ہو کہ تم تعلیم یافتہ اور میں ان پڑھ ہوں۔ لیبر انسپکٹر کے پاس جانے کا مشورہ ایسے دیتی ہو گویا مجھے اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ میں بتائے دیتی ہوں کہ میرا پرسان حال اللہ ہے، وہی میری یونین اور لیبر انسپکٹر ہے۔''

اپنی حالت پر غم و غصے سے اس کا گلا اندھ گیا۔ بڑی حیا سے اپنے سر پر اوڑھا ہوا رومال اس نے نوچ اتارا اور فرش پر پھینک دیا۔ یہ شدید احتجاج کا روایتی طریقہ ہے۔ اس نے کمرے کے چھوٹے سے روشن دان سے نظر آتے آسمان پر نگاہیں جمائیں اور دہائی دینے لگی۔''اللہ، تجھے اس ظلم کی خبر ہے۔ میری تمنا ہے کہ اس فیکٹری کو بھسم کر دے اور اس کے مالک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اے خدا میری سنتا ہے؟ کہتے ہیں تو مظلوم کی سنتا ہے۔ مجھے بلاؤں کے اس ملک میں تیری ضرورت ہے۔''

اس دوران میں نرسیں دوڑتی ہوئی کمرے میں آئیں اور مجھ سے کہا کہ آپ یہاں سے

چلی جائیں، لیکن مینا چلائی۔ ''انہیں رہنے دو۔ ہمیں اکیلا چھوڑ دو۔ میں اپنا دل چیر کر دکھا رہی ہوں۔ مجھے چلا لینے دو۔ مجھے چپ رہنے کو مت کہو، ورنہ میں تمہیں بھی یونین اور فیکٹری مالک کے ساتھ شامل کر لوں گی۔'' دروازہ آہستگی سے بند ہوگیا۔ جب کوئی اس قدر رنج و الم میں آسمان کو پکارتا ہے تو سب خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔

مینا اپنے دل کی بات کہتی رہی، ''فاطمہ، اب ساری تفصیلات غور سے سنو جن سے تم اب تک بے خبر ہو۔ میں نے دس سال لیبر کارڈ کے بغیر کام کیا۔ بغیر کسی معاہدے کے، میرا نام کبھی کسی پیرول پر نہیں آیا۔ مجھے صبح فیکٹری میں کام کے لئے روزانہ اجرت پر لیا جاتا، گویا میرا پہلا دن ہو۔ پہلے سال میں اس معاملے پر بات کرنے عائشہ کے ساتھ یونین کے دفتر گئی۔ دوران کار لوہے کی ایک لاٹھ ہم پر گر پڑی تھی۔ عائشہ مجھ سے عمر میں بڑی اور زیادہ تجربہ کار ہے۔ یونین نے ہمیں لیبر انسپکٹر کے پاس بھجوا دیا۔ جانتی ہو اس لیبر انسپکٹر نے کیا کیا؟ بجائے ہمارے دفاع کے اس نے مالک کی طرف داری کی اور تمام معاملہ اسے بتا دیا۔ دوسرے دن مالک نے ہمیں بلا لیا، ''گشتیو! تو تم لیبر انسپکٹر کے پاس گئی تھیں؟ مجھے دھوکا دیا اور معاملہ باہر لے گئیں اگر تم میرے پاس آتیں اور طریقے سے کہتیں تو میں تمہیں دوا وغیرہ خرید دیتا۔ ناشکری چڑیلیں! جاؤ تمہاری چھٹی۔'' اگلے چھ ماہ تک ہمیں کوئی کام نہیں ملا۔ علاقے میں موجود تمام فیکٹریوں کو ہمارے نام بھجوا دیئے گئے تھے۔

ناآسودہ خواہشوں بھری زندگی گزارنے والوں کے برعکس مینا مقدر پرست نہیں۔ مقدر پرست غصے میں پھٹتا ہے اور نہ ہی مالک کو مطعون ٹھہراتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام انا کی بقاء میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جب مالک، یونین اور لیبر انسپکٹر سب سے حقوق کے حصول میں ناکامی اور دل برداشتگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو خدا کو اپنا محافظ ماننے کا عمل غالباً کوئی فوری تبدیلی نہیں لا سکتا۔ لیکن اس دوران برخواست شدہ اور استحصال کے شکار کارکن اس عظیم محل میں جا سکتے ہیں، جس کے در ہمیشہ وا رہتے ہیں: ہمارے ثقافتی ورثے کے محل میں۔ مینا کو ملازمت سے جواب ملا، حقوق سے محروم کی گئی اور بغیر کسی زرتلافی کے، لیکن اپنی انسانیت پر سے اس کا یقین ختم نہیں ہوا۔ وہ آسمان اور اس کے مالک سے بات کر سکتی تھی۔ مذہب مینا جیسے لوگوں کو اپنی تکلیف کو غصے اور غصے کو انتقام میں بدلنے کا ایک طریقہ دیتا ہے۔

MashalBooks.org

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارا سامنا روایتی علامتی ورثے کی حدود سے ہوتا ہے۔ اس ورثے کے اندر رہتے ہوئے مینا اس دنیا کا ادراک بھی نہیں کر سکتی جہاں اسے طبی تحفظ اور سوشل سکیورٹی کا حق حاصل ہو۔ ان چیزوں کے وقوع پذیر ہونے کے لئے لازم ہے کہ مسلم حکومت کا سربراہ، امام حکومتی وسائل کے ایک حصے کی جدید اداروں میں سرمایہ کاری کرے تا کہ مینا جیسے شہریوں کو ان کے حقوق کی فراہمی یقینی بنائی جا سکے- اس کے علاوہ امام کو نجی شعبے کو بھی پابند کرنا ہوگا کہ وہ کارکنوں کے حقوق کی فراہمی میں حکومت سے تعاون کریں۔ عرب صنعت کار مارکیٹوں میں مسابقت کا عمل جاری رکھے ہوئے ہے تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ غیر ''منضبط سرمایہ دارانہ'' ڈھانچے میں کام کر رہا ہے جو اپنے کارکنوں کو ان کے حقوق سے کم و بیش محروم رکھے ہوئے ہے اور انہیں کسی طرح کا کوئی تحفظ فراہم نہیں کرتا۔ عرب کاروباری طبقے کو جمہوریت سے خدشہ ہے کہ مبادا ان کے کارکن ذمہ دار شہریوں میں منقلب ہوکر اپنے حقوق نہ مانگنے لگیں۔ تیل کے شہزادوں کی طرح وہ بھی جمہوریت روکنے کے عمل میں دنیا کے ہر مذہب کی ترویج میں سرمایہ کاری کو تیار ہو جائیں گے۔ مراکش میں یونیورسٹی گریجویٹس میں بیروزگاری کی نسبتاً بلند شرح کی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فیکٹری مالکان سے برداشت نہیں ہوتا کہ ان کے ہاں ایسے کارکن بھی موجود ہوں جنہیں یونیورسٹی کیمپس کی احتجاجی سیاست کا تجربہ ہو۔1987ء میں ٹیکسٹائل انڈسٹری پر ہونے والی تحقیقات سے پتہ چلا کہ روایتی جلابہ میں ملبوس عورت کے لئے ملازمت حاصل کرنا زیادہ آسان ہے جبکہ جین اور ٹی شرٹ پہننے کی صورت میں گھنٹوں انتظار کروانے کے بعد آپ کو جواب دیا جائے گا کہ'' آپ اس ملازمت کے لئے موزوں نہیں ہیں۔'' مینا کو جدید جمہوری طرز کار کا کوئی اندازہ نہیں جو فیکٹری کو جلائے بغیر بھی اسے بدل سکتا ہے۔ اس کی چیخ و پکار اور الفاظ کا انتخاب بتاتا ہے کہ صرف جمہوری بغاوت کی روایت زندہ ہے۔ مالک کو چیلنج کرنا ہی واحد دستیاب اور، افسوس کہ، آخری چارہ کار ہے۔''(21)

دنیا کا ایک حصہ اپنے پروگرام اور حوالوں کے لئے اپنے علامتی تہذیبی ورثے پر انحصار کرتا ہے اور یہ ورثہ بھی روایتی ہے۔ چونکہ ہم سے ایک ایسی دنیا میں زندہ رہنے کا تقاضا کیا جاتا ہے جو پہلے کسی بھی دور سے زیادہ پر ہجوم اور باہم منسلک ہے چنانچہ ہمیں اس پروگرام سے شناسا ہونا چاہیے خواہ وہ شناسائی سطحی ہی کیوں نہ ہو۔ اسلام کو سیاسی، مالی اور انتظامی

مصلحتوں کے لئے استعمال کرنے کا عمل اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن اسلامی روایت آج بھی قوت اور توانائی سے بھرپور ہے۔ اس میں اہل ایمان کو امید کی جھلک نظر آتی ہے، کیونکہ اسلام انہیں دو بنیادی چیزیں یعنی شناخت کا احساس اور جدوجہد کے لئے درکار قوت فراہم کرتا ہے۔

مسلمان آج غیر مسلم سیٹلائٹ کی نگرانی میں ہیں جو بوقت ضرورت، جیسا کہ خلیجی جنگ سے ثابت بھی ہو چکا ہے، ٹھیک ٹھیک نشانے لگانے میں بھی معاونت کرتا ہے۔ دنیا میں لاکھوں انسانوں نے اپنے آبائی ورثے سے قطع تعلق کرتے ہوئے اسلام کو بطور اپنے ثقافتی ورثے کے اپنایا۔ اب اسلام کو ان کی شناخت کے طور پر بروئے کار آنے کا چیلنج درپیش ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کو جدید علم کے میدان میں بھی داخل ہونا ہے۔ ان دو امور کے پیش نظر ہمارے لئے دو بنیادی دستاویزوں کا مطالعہ لازمی ہو چکا ہے، ایک اقوام متحدہ کا چارٹر اور دوسرا قرآن۔

MashalBooks.org

باب 4

اقوام متحدہ کا چارٹر یعنی تاسیسی منشور

جب ہم اسلام اور جمہوریت کے درمیان تنازعہ کی بات کرتے ہیں تو درحقیت ہمارا موضوع ایک ایسا تنازعہ ہے جو نہایت واضح طور پر قانونی نوعیت کا ہے۔ اگر اسلام کے لئے بنیادی حوالہ قرآن ہے تو جمہوریت کے لئے اتنا ہی موثر حوالہ اقوام متحدہ کا تاسیسی منشور یا چارٹر ہے جس کی اولین حیثیت ایک قانون اعلیٰ کی ہے۔

مسلم ریاستوں کی اکثریت نے اس میثاق پر دستخط کئے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے وہ خود کو متضاد قوانین کے تسلط میں پاتے ہیں۔ ایک قانون شہریوں کو فکری آزادی کی ضمانت دیتا ہے جبکہ، مروجہ تشریحات کے مطابق، شریعت کو اطاعت پر مبنی قرار دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کو، جو اوائل عمر سے ہی قرآن سے آگاہ ہوتے ہیں، اقوام متحدہ کا چارٹر یا میثاق پڑھنے کا موقع کبھی نہیں ملتا اور نہ ہی وہ اس کے کلیدی تصورات سے شناسا ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم مسلمانوں میں سے بیشتر کے لئے یہ چارٹر بچپن میں سنی بلاؤں کی کہانیوں کا سا ہے: ایسی بلاؤں کا صرف سنا جاتا ہے انہیں کسی نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا ہوتا- چارٹر کی یہ بلا ہمارے ساحلوں پر بڑے چپ چپیتے اور پراسرار انداز میں ڈپلوموں میں لپٹی اتری اور پھر، حرم سرا کی لونڈی کی طرح، کبھی باہر نکلنے میں کامیاب نہ ہو پائی۔ بلاؤں کی طرح یہ عمر اور پابندیاں بڑھنے کے ساتھ ساتھ زیادہ دہشت انگیز اور خوفناک ہوتی چلی گئی۔ آگے بڑھنے سے پہلے مجھے اس بلا کو متعارف کروانا ہے۔

MashalBooks.org

شمال کی بلا، ہجوز

میں چالیس کے عشرے کے اواخر میں فیض شہر کے چند آخری حرموں میں سے ایک میں پیدا ہوئی۔ اس کے فوراً بعد ہی اس قدیمی، معزز ادارے کی دیواروں میں جدت کی قوت نے دراڑیں ڈالنا شروع کر دی تھیں۔ میرا بچپن خاصا خوشگوار کہا جا سکتا ہے۔ بہت بڑے روایتی صحن والا گھر جس پر سفید اور سیاہ پتھر کا فرش لگا تھا جہاں ہمارا شٹاپو کا کھیل ہمیشہ جاری رہتا۔ صحن کے چار کونوں پر چکنی مٹی کی جالی سے آراستہ سیڑھیاں جادوئی ستونوں کی طرح اوپر اٹھتیں اور اس وقت کے فیض کی بلند ترین چھت پر جا نکلتیں۔ ہم عمر کزن، لڑکے اور لڑکیاں دونوں، ہمہ وقت کھیلتے اور ایک دوسرے کے پیچھے کو دکڑے لگاتے۔ لیکن بڑوں کیلئے یہ سب کچھ بہت بڑی ہڑبونگ تھی۔ مرنیسی خاندان میں دوپہر کا آرام بھی لازم تھا۔ مہمان دوپہر کے کھانے سے پہلے رخصت کی اجازت چاہتے۔ ہماری ماؤں کو چلا چلا کر ہمیں خاموش کروانا پڑتا کہ ہم ان کی بات سن سکیں۔ حتیٰ کہ ایک دن طلطوآن سے ایک خالہ وارد ہوئیں۔ شمال کا یہ شہر اندلس سے نکالے جانے والے مسلمانوں کا مرکز تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک خوفناک داستان بھی لائیں جو غالباً انہوں نے اپنے ہسپانوی بزرگوں سے ہوگی۔ یہ کہانی لَلّا ہجوزہ کی تھی۔

ہجوزہ کی آمد سال میں ایک بار ہوتی۔ اس روز عام تعطیل ہوتی اور لوگ ایک خصوصی تقریباتی کھانا گاڑھے دودھ سے تیار کرتے۔ ہجوزہ سیڑھیوں کے دھندلکے میں چھپ جاتی اور شور کرنے والے بچوں پر نظر رکھتی۔ اگر بچے اپنی ماں کی بروقت مداخلت پر خاص دعا نہ پڑھتے تو ہجوزہ انہیں چیر پھاڑ دیتی۔ اس موقع پر ہمارے گھر کی عظیم عمارت پر خاموشی چھا جاتی اور بچے دو گروہوں میں بٹ جاتے (جس طرح آج عرب جمہوریت کے سوال پر بٹے ہوئے ہیں)۔ ایک گروہ میں وہ بچے ہوتے جو ہجوزہ کا سامنا کرنا چاہتے اور دوسرے میں وہ جن کے جبڑے خوف سے اکڑ جاتے۔ ظاہر ہے کہ میں دوسرے گروہ میں تھی۔ دن کی روشنی میں بھی میں اپنی ماں کا کفتان تھامے بغیر سیڑھیوں میں نہ جاتی۔ اس کے برعکس نڈر گروہ، جس کی قیادت میرے کزن احمد کے ہاتھ میں تھی، ہجوزہ سے سامنا کرنے کو تیار رہتا۔ علی الصبح ہم سب کو ہجوزہ کے سیڑھیوں پر قابض ہونے سے پہلے، اپنی مقررہ چوکیوں پر موجود رہنا

ہوتا۔ غلیل سے مسلح ہم اسے نیچا دکھانے کو چوکس ہو جاتے۔ اگر وہ سامنے آ جاتی تو حق راہداری پر لازماً گفت وشنید ہوتی۔

ہجوزہ کی کہانی ہمارے بچپن کے ایک خاصے لمبے عرصے پر چھائی رہی۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ ہم نے بلوغت میں قدم رکھا اور ہمیں پتہ چلا کہ ہمارا بچپن جدوجہد آزادی سے کس درجہ مطابقت رکھتا تھا۔ ہم سب نوعمر لڑکے لڑکیوں نے گھروں سے قدم نکالا اور نعرے لگانے لگے، ''حصول آزادی تک ہماری جنگ جاری رہے گی'' اور خوف اڑن چھو ہوگئے۔

اس چارٹر پر 26 جون 1945ء کو سان فرانسسکو میں دستخط کئے گئے۔ اقوام متحدہ کے اولین اراکین میں ایران، ترکی، لبنان، مصر، شام اور سعودی عرب جیسے مسلم ممالک بھی شامل تھے۔

باقی ممالک نے فوراً دستخط کرنے کی غرض سے اپنے وفود بھیجے۔ اس کے جلد بعد اقوام متحدہ نے رکنیت کے خواہش مند ممالک پر شرط عائد کر دی کہ انہیں ایسی دستاویزات پر بھی قبولیت کے دستخط کرنا ہوں گے، جنکی رو سے اس کے چارٹر کو دستخط کنندگان کے قومی آئینوں پر بھی برتری حاصل ہوگی۔ زیادہ تر مسلم مملک، جو حال ہی میں سے آزاد ہوئے تھے اور جلد از جلد اپنے سابق آقاؤں کے پہلو بہ پہلو برابری کی سطح پر بیٹھنا چاہتے تھے، اس مقصد کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھے۔ ان ممالک نے 21 نومبر 1947ء کی جنرل اسمبلی کی قرارداد 116 ضرور پڑھی ہوگی جس کی رو سے،

> ''کوئی بھی ملک جو اقوام متحدہ کی رکنیت کا خواہش مند ہے، سیکرٹری جنرل کو ایک درخواست پیش کرے گا۔ اس درخواست کے ساتھ اس امر کا اقرارنامہ باضابطہ صورت میں موجود ہوگا کہ وہ چارٹر میں شامل ذمہ داریاں پوری کرنے کا پابند ہے۔ درخواست منظور ہو جانے کی صورت میں رکنیت اسی تاریخ سے موثر ہو جائے گی، جس تاریخ کو جنرل اسمبلی درخواست پر اپنا فیصلہ کرتی ہے۔''

یوں دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلم سرزمین پر ایسی حکومتیں قائم ہوئیں جو کاغذ پر پارلیمانی جمہوریتیں تھیں۔ ان حکومتوں نے مختلف قوانین متعارف کروائے جن کا مقصد خود کو اس نظام سے متمیز رکھنا تھا جس میں ذاتی رائے اور تعقل کی ممانعت تھی۔ اس حوالے سے انسانی حقوق کے عالمی اعلان کی دفعہ خصوصاً دھماکہ خیز ہے، جس کے مطابق،

MashalBooks.org

''ہر کسی کو افکار، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق ہوگا۔ اس حق میں اپنے انتخاب کے مذہب یا عقیدے کو اختیار کرنے کی آزادی بھی شامل ہے خواہ یہ حق بطور فرد استعمال کیا جائے یا دوسرے افراد کے ہمراہ گروہ کی صورت میں اور سرعام کیا جائے یا نجی طور پر۔''

جنرل اسمبلی نے 10 دسمبر 1948ء کو انسانی حقوق کے عالمگیر اعلان کی منظوری دی، جس کی رو سے، ''تمام اقوام اور افراد کے لئے اہداف کے ایک مشترکہ معیار'' کو حریت فکر اور مذہب اور ریاست کے درمیان تعلق پر بحث و مباحثے کا نقطہ آغاز بننا چاہیے تھا۔ اگر اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کرنے والے اولین ممالک میں شامل سعودی عرب نے 1948ء کے بعد اپنے تعلیمی اداروں اور پروپیگنڈا کے وسیع جال اور بینکنگ نیٹ ورک کو لوگوں پر یہ واضح کرنے کے لئے استعمال کیا ہوتا کہ آرٹیکل 18 کی ریاست ''ملحد'' افسروں پر لٹھ بازی کا شکار نہیں ہوگی بلکہ وہ فقط اپنے کارندوں کو مذہب کی مخصوص تشریح کے لئے عوامی سرمایہ ضائع کرانے سے روکے گی، تو شائد آج اسلامی دنیا کی شکل بہت مختلف ہوتی۔

اس چارٹر اور دوسرے بین الاقوامی کنونشنوں پر دستخط کرنے والے ممالک کے پاس یہی ممکنہ راستے تھے۔ ان کے پاس نئے قوانین کے نفاذ کا یہ سنہری موقع تھا اور انہیں چاہیے تھا کہ اسے ہاتھ سے نہ جانے دیتے- اقتدار کی ماہیت پر بھرپور عوامی بحث کا دروازہ کھولتے اور لوگوں پر واضح کرتے کہ عوامی شرکت پر مبنی جمہوریت کس طرح چلتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ان قوانین کو رکھیلوں کی طرح چھپا لیتے، جس کا وجود امام اور اطاعت کے داعی کے لئے باعث ندامت ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے دوسرے رستے کا انتخاب کیا گیا۔ ان قوانین کا ''حجاب'' کے پیچھے چھپا کر رکھا جانا ایک مقصد اور لائحہ عمل بن گیا۔ آرٹیکل 18 کی وضاحت اور عوام کو اس سے روشناس کروانے کے لئے ذرائع ابلاغ اور لاکھوں اساتذہ کو متحرک کئے جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ سیکولر ریاست کی فلسفیانہ بنیادوں کی وضاحت کی جاتی ۔ مزید برآں حکومتی اداروں اور مشینری کو اطاعت یعنی حکمران کی اندھی تقلید کے پروپیگنڈے کے لئے برتا جانا ممنوع قرار پاتا-

اگر عرب دنیا نے جمہوریت کی راہ اختیار کی ہوتی تو ہمیں اس صدی میں ہونے والے معجزوں میں سے ایک کا مشاہدہ نہ ہوتا اور وہ ''معجزہ'' یہ ہے کہ عرب صدور کی مدت

صدارت بادشاہوں کی سی طویل ہوتی ہے۔مشرقی وسطیٰ کا شمار دنیا کے چند علاقوں میں ہوتا ہے جہاں تاحیات صدارت ممکن ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر تیونس کے حبیب بورقیبہ پر دباؤ نہ ڈالا جاتا تو وہ اپنے عہدے سے مستعفی نہ ہوتے۔ یہی معاملہ شام کے حافظ الاسد کا تھا جنہوں نے ابھی اپنے چوتھے دور صدارت کا اعلان کیا ہے۔صدر اسد کی طرح صدر حسنی مبارک کا طویل دور صدارت بھی جمہوری نظام میں معمول کی کاروائی نہیں ہے کیونکہ صدر کا انتخاب بالکل عوام کی بے لگام صوابدید پر ہوتا ہے۔عرب دنیا کے صدور کے غیر معمولی طویل دور صدارت کی صرف دو ممکنہ وجوہات ہوسکتی ہیں، یا تو ان کی پشت پر مافوق البشر قوتوں (جادو یا برکت) کا دست کرم ہے یا پھر وہ نہایت ادنیٰ درجے کی حرکات، جیسے انتخابی دھاندلی وغیرہ میں ملوث ہیں۔ ماضی کے ایک قوم پرست رہنما کی حیثیت سے ہم سب حبیب بورقیبہ کی تحسین وتوصیف کرتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر انہوں نے حکومتی وسائل بطور مجاہد اکبر اپنی تشہیر میں استعمال نہ کئے ہوتے تو یقیناً ان کا عہد صدارت اتنا طویل نہ ہوتا۔ یہ جو میں نے صدر بورقیبہ کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تونس ان چند عرب ریاستوں میں سے ایک ہے جنہوں نے خود کو جدید قرار دیا ہے۔یعنی مراکش کے برعکس جہاں روایت سے تعلق نہایت مضبوط اور شدید ہے۔

جدید طرز زندگی ہم سے سیکولر ریاست کے مسئلے کو زیر بحث لانے کا متقاضی ہے جبکہ ریاست اس مسئلے کو عوام الناس میں موضوع بحث نہیں بنانا چاہتی۔ اس ریاستی طرز عمل اور مطلق العنانی کے درمیان ایک تعلق موجود ہے جسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہمیں سیاسی نظام کی میکانیات کو سمجھنا ہوگا۔صدر بورقیبہ کی حکومت نے ذرائع ابلاغ اور تعلیمی اداروں پر اجارہ داری قائم کر لی تاکہ شہریوں کو جدت پسندی کی ترغیب اور روایت پرستی سے گریز کی تعلیم دی جاسکے لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں جدت کی روح یعنی فکری آزادی اور فیصلہ سازی میں شمولیت سے محروم رکھا گیا۔حکومت جمہوریت کے گن گاتی لیکن تیونس کے شہریوں کو یہ پوچھنے کا حق نہ دیا گیا کہ ان کے ٹیکس سے جمع ہونے والی رقم کہاں خرچ ہوتی ہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ تیونس جیسی بزعم خود روشن خیال اور الجزائر جیسی سوشلسٹ کہلانے والی عرب جمہوریتوں نے عوام میں فکری انتشار پیدا کیا اور یوں اس بنیاد پرستی کو شہ ملی جو اب خطرہ بن گئی ہے۔

بنیاد پرستوں کی دلیل ہے کہ اگر اسلام ریاست سے الگ کر دیا گیا تو لوگوں کا خدا پر سے ایمان ختم ہو جائے گا اور محمد رسول اللہ ﷺ کی یاد لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائے گی اور چونکہ ہم پر صابن سے لے کر فلموں تک ہر چیز کی بمباری اشتہاروں کی صورت بذریعہ سیٹلائٹ کی جا رہی ہے اس لئے ریاست کو لازماً اسلام کا دفاع کرنا ہوگا۔ اس طرح کا استدلال اسلام کی توہین ہے کیونکہ اِس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کی بقا اسے عوام پر آمرانہ طریقوں سے مسلط کرنے میں ہے جو لوگوں کو شراب پینے اور ماہ صیام کے روزے نہ رکھنے پر سزا دے۔ اس دلیل کی رو سے تو اسلام کے پاس ایک جدید شہری کے لئے کچھ نہیں ہے اور وہ ریاست کی نظر چوکتے ہی اسے ترک کر دے گا۔ اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ ایسا نہیں ہے اور اسلام کے پاس ایک جدید شہری کے لئے بہت کچھ ہے۔ مسیحیت اور یہودیت کی طرح ایک سیکولر ریاست میں اسلام نہ صرف اپنا وجود برقرار رکھے گا بلکہ خوب پھلے پھولے گا۔ حکومتی جبر سے الگ ہونے کے بعد اسلام ایک نئی روحانیت حاصل کرے گا۔ میرے مشاہدے کے مطابق امریکہ، فرانس اور جرمنی میں مسیحیت اور یہودیت کی جڑیں بہت مضبوط اور لوگوں کے دلوں میں بہت گہری ہیں۔ ان ممالک میں سیکولر ریاستوں نے مذہب کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ ریاست کی طرف سے مذہب کے استحصال کو ختم کر دیا ہے۔ یہ بنیادی تبدیلی تین صدیوں پر محیط جدوجہد اور کئی انقلابوں کے بعد آ پائی ہے اور عوام نے اس کی تفہیم کے بعد اسے قبول کر لیا ہے۔ آزادی کے بعد مسلم ریاستوں نے پروپیگنڈے اور تعلیم عامہ کے شعبوں پر اجارہ جاری قائم کر لی، لیکن اس نیٹ ورک کو سیکولر ریاست کا جدید خیال متعارف کروانے میں استعمال نہیں کیا۔ حالانکہ آرٹیکل 18 اسی مطالبے کو نہایت قابل فہم انداز میں پیش کرتا ہے۔ آرٹیکل 18 نہایت غیر مبہم انداز میں عقیدے کی آزادی کے حق کی توثیق کرتا ہے اور یوں ریاست کے اس حق کو براہ راست چیلنج کرتا ہے کہ وہ شہریوں پر بالجبر یا بزور کوئی عقیدہ مسلط کرے۔ یوں یہ آرٹیکل رواداری کے اصول کی پاسداری کو یقینی بناتا ہے۔ تاہم اقوام متحدہ کے چارٹر اور نصف صدی تک ڈھیروں کے حساب سے میثاقوں پر دستخط کرنے والے مسلم رہنماؤں میں رواداری نہ ہونے کے برابر ہے۔ انہوں نے نہ صرف اسلام کی اپنی آمرانہ تشریح اور چارٹر کے درمیان پائی جانے والی کش مکش کو چھپانے کی کوشش کی ہے بلکہ اپنے قومی بجٹوں کو چارٹر سے انحراف اور اس میں مضمر حریت فکر کے اصول کو

خلاف اسلام قرار دینے میں صرف کیا ہے اور یوں شہریوں کو جمہوری عمل میں مسلسل اور باقاعدہ شرکت سے روک کر اس دفعہ کے قواعد وضوابط سے آشنا ہونے میں رکاوٹ ڈالی ہے۔

تحفظات کا ڈھونگ

مسلم ریاستوں نے چارٹر میں کئی طرح کی تبدیلیوں اور اس کے خلاف مختلف تحفظات کے ذریعے اس امر کو یقینی بنانے کی کوشش کی ہے کہ عوام پر آزادی کے سانس کا ہر روزن بند کر دیا جائے اور انہیں مساوات کا معمولی سا تجربہ بھی نہ ہونے پائے۔ ''عورتوں کے خلاف ہر قسم کے امتیازات کے خاتمہ کا میثاق'' "Elimination of All Forms of Discrimination against Women" (8دسمبر1979ء) پر مصری سفارتکاروں نے 16جولائی1980ء کو دستخط کئے اور اس کے بعد جمہوریہ مصر نے اس میثاق کی دفعہ سولہ میں جو تبدیلیاں کیں اس پر ایک عرب عورت صرف ہنس ہی سکتی ہے۔ تحفظات کے نام پر ان معزز افسروں کی دوہرے معیارات کی حامل گفتگو سنیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ لوگ اقوام متحدہ کو ایک تصنع اور ریاکاری کیوں خیال کرتے ہیں۔ اس کے مہیا کردہ تحفظ کا مطالعہ کیا بتاتا ہے؟ فقط اتنا کہ آرٹیکل سولہ جس مساوات کو یقینی بناتا ہے، ''شریعت'' کے خلاف کسی طرح کا تعصب نہیں رکھتا بشرطیکہ اس کی تشریح میں ''منصفانہ توازن'' کی ضمانت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ وضاحت و صراحت کی یہی کمی ہے جو جدید عرب کی خاصیت ہے اور اسی کے نتیجے میں اس خلفشار اور بنیاد پرستانہ تشدد نے جنم لیا ہے جس سے ہم آج دوچار ہیں۔

عربوں کو جو روگ لاحق ہے اور جسے شرمناک خیال کرتے ہوئے وہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں، اس کی علامات دراصل اس متن سے آشکار ہے۔ گہری سطح پر دیکھا جائے تو مساوات سے انکار ہی اصل روگ ہے۔ لیکن سفارتکاری سطح پر وحشی اور پسماندہ کہلائے بغیر وہ اس کا اقرار نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف اگر وہ یہ بیان دیتے ہیں کہ شریعت مساوات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی تو انہیں شریعت اور چارٹر میں سے کسی ایک کے انتخاب کا مشکل مرحلہ درپیش ہوگا اور اقوام متحدہ کے اصولوں کو مشتبہ قرار دینا پڑے گا اور اقوام متحدہ میں صرف انہی ممالک کے وفود بیٹھ سکتے ہیں جنہوں نے اس کے میثاقوں پر دستخط کے ذریعے

اقرار کیا ہوگا کہ ان کے سیاسی نظاموں کی بنیاد مساوات اور آزادی پر ہوگی۔ وہ کونسا قانونی سقم ہے کہ معہ اپنی ''ترامیم'' اور ''تحفظات'' کے عرب ممالک دو معجزے دکھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں: وہ اقوام متحدہ کے تمام میثاقوں یعنی کنونشنوں پر دستخط کے بعد نشست حاصل کرتے ہیں جبکہ ان کے افسروں ان متنوں کو یوں برتتے ہیں کہ ان کی تشریح کے مطابق اصولوں کی تحدیدی حیثیت.....یعنی مساوات اور آزادی.....ختم ہو جاتی ہے۔

اسی عمل سے ہمارے سربراہان مملکت کے رچائے لطیف ڈرامے میں مذہب کے کردار کا تعین ہو جاتا ہے۔ انہیں نیویارک میں اقوام متحدہ کے سامنے وہ چہرہ پیش کرنا ہوتا ہے جو جدت کا آئینہ دار ہے جبکہ ملک میں ہمیں دہشت زدہ رکھنے کو وہ ایک عباسی خلیفہ کا نقاب پہن لیتے ہیں۔ ''تحریفات'' اور ''تحفظات'' باہم ضرب کھا کر ایسے تمام قانونی متنوں کی شناخت مسخ کر دیتے ہیں جو ''اطاعت'' سے متصادم ہیں یا رائے کی توثیق کرتے ہیں۔ (2) عرب ممالک کے لئے اقوام متحدہ، مع اپنے چارٹر اور تمام تر میثاقوں کے، منافقت اور حصول مقاصد کے لیئے اصولوں کی شکل بگاڑنے کا اکھاڑہ ہے۔ (3) افسوس یہ ہے کہ جنگ خلیج نے، جس میں چارٹر کے شریفانہ، عالمگیر اور ذمہ داری کے ارفع و اعلیٰ اصولوں کو جس طرح طاقت کے استعمال کا جواز بنایا، بھی اس رائے کو تقویت دی۔ حقیقت یہی ہے کہ عرب ریاستوں نے اپنے ذرائع ابلاغ اور تعلیمی ذرائع کو کبھی اپنے شہریوں میں چارٹر کے اصولوں اور انقلابی مشمولات کی آگہی بیدار کرنے کیلئے استعمال نہیں کیا۔

ٹی وی اسلام

چارٹر کے اصول عرب شعور میں کبھی جڑ نہ پکڑ سکیں گے۔ آج حزب اختلاف کے رہنما اپنے اضطراب اور عدم اطمینان کا اظہار ''ظلم'' اور ''عدل'' جیسی مقدس اصطلاحات میں کرتے ہیں اور بے روزگاری کے ہاتھوں پریشان نوجوان نسل کو مساجد میں بلا کر جمہوریت اور چارٹر کے غیر ملکی ہونے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر نے کبھی ریڈیو یا ٹی وی پر کسی کوسان فرانسسکو سے اٹھنے والے اس قانون اور منشور کی وضاحت کرتے نہیں سنا۔ اسّی کی دہائی میں، جب اسلام کے چیلنج نے شدت اختیار کی، عرب ٹی وی سکرین اور ریڈیو پر سرکاری خطیبوں اور اماموں کے تیار کردہ مذہبی پروگرام اور امریکی فلمیں چھا گئیں۔ 1987ء

میں مصری ٹی وی کی کل 56,455 گھنٹوں کی نشریات میں سے 18.6 فی صد مذہبی اور صرف 14.7 فی صد ثقافتی پروگراموں کے لئے مخصوص تھیں۔ دوسری طرف اسرائیل میں اسی دورانیئے کی 34,281 گھنٹے کی طویل نشریات کا 0.8 فی صد مذہبی اور 8.9 فی صد ثقافتی پروگراموں کو دیا گیا جبکہ اسرائیلی معاشرت میں مذہب بنیادی کردار کا حامل ہے۔ 1985ء میں سوشلسٹ الجزائر میں ریڈیو پر مذہبی پروگراموں کو دیا گیا وقت (1,434 گھنٹے) ثقافتی پروگراموں کے لئے وقف وقت (867 گھنٹے) سے تقریباً دوگنا تھا۔ کل نشریاتی وقت یعنی 19,981 گھنٹے کا باقی ماندہ حصہ کھیلوں اور تفریحی پروگراموں کو دیا گیا، لیکن سعودی عرب وہ ملک ہے جسے اپنے باشندوں کے ایمان کی فکر سب سے زیادہ ہے۔ اس کے 36,865 گھنٹے طویل سالانہ دورانیئے کا 30 فیصد مذہبی پروگراموں کے لئے مخصوص ہے۔ کیتھولک اٹلی بھی، جسے ویٹی کن سٹی میں پوپ کی معصومیت کی حفاظت کا شرف حاصل ہے، مذہبی پروگراموں کو اتنا وقت نہیں دیتا۔ اٹلی اپنے وقت کا 37 فیصد ثقافتی پروگراموں کو دیتا ہے۔

عرب ریاستوں میں ہمیں ان پروگراموں میں بھی جنہیں یونیسکو کے اعداد و شمار میں تعلیمی شمار کیا جاتا ہے، کبھی اقوام متحدہ کے چارٹر سے تفصیلاً روشناس نہیں کروایا گیا۔ یعنی فرانسسکو سے اٹھنے والے اس پروگرام سے جسے ہماری ثقافتی وحدت کے لئے خطرہ قرار دیا جاتا ہے۔ ہمیں درپیش خطرے کی وضاحت کے لئے ٹی وی مناسب ترین ذریعہ ہوسکتا تھا۔ لیکن عرب لیڈر اقوام متحدہ کے چارٹر کو غیر ملکی قرار دے کر ٹی وی پر ممنوع قرار نہیں دے سکتے تھے۔ یہی عرب ٹیلی ویژن ہمیں ہالی ووڈ کی فلمیں دکھاتا ہے۔ (اگرچہ غالب رجحان ایسی فلمیں دکھانے کا ہے جن پر زیادہ خرچ نہ اٹھے جیسے خاموش اور ہالی ووڈ کے کلاسیک عہد کی پیداوار)۔

امریکی فلموں کی سب سے بڑی صارف تیل سے مالا مال ریاستیں ہیں۔ مصر کی اپنی فلمی صنعت بھی موجود ہے لیکن یہ 38.7 فی صد فلمیں امریکہ سے درآمد کرتا ہے۔ یونیسکو کے مطابق سوشلسٹ الجزائر میں زیرنمائش فلموں کا ساٹھ فی صد مغرب سے درآمد کیا جاتا ہے۔ اعداد و شمار کا جائزہ بتاتا ہے کہ جو مغرب اہل الجزائر کو مسحور کے کئے ہوئے ہے، روس بہرحال نہیں ہے۔ درآمد ہونے والی فلموں کا ایک تہائی امریکہ سے آتا ہے۔ چنانچہ عرب کے ایک عام شہری کے تخیل پر امریکہ چھایا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ وہ عرب رہنما بھی جنہوں نے ''چالو سوشلسٹ نظام'' کو اپنانے کا دعویٰ کیا ہے; سوشلزم کے اصولوں پر گفتگو کی کچھ زیادہ

اجازت نہیں دیتے، انہیں خدشہ ہے کہ لوگ بھٹک کر کہیں ''پرولتاریہ کی آمریت'' جیسی چھوٹی چھوٹی فضولیات میں نہ الجھ جائیں یا ایک دانشور کی استحقاقی توقیر پر نہ سوچنے لگیں۔

ریڈیو اور ٹی وی پر پیش کئے جانے والے سوشلزم کا مطالعہ تاحال نہیں کیا جا سکا۔ بصورت دیگر ہمیں ہنسنے کو کافی مواد مل جاتا، جس کی ہمیں شدت سے ضرورت ہے۔

عرب ممالک جنہوں نے جدت کے سوشلسٹ انداز کو اختیار کیا، عراق اور شام ہیں۔ میرے خیال میں ان ممالک میں بھی افسروں کو ٹی وی کو اس نہج پر لانے میں کچھ خاص محنت نہیں کرنا پڑی ہوگی کہ پاپا مارکس کو ایک جابر خلیفہ کے روپ میں پیش کیا جا سکے۔ مارکس کو دمشق (امویوں کے اولین دارالخلافہ) اور بغداد (عباسیوں کے دارالخلافہ) میں ایک عفریت کے طور پر پیش کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ جب آمریت کے کلیدی عنصر کو تقدس کا رنگ دے کر قابل تعظیم ٹھہرایا گیا تو خلفاء کی یاد کو حیات نو بخشنا اور انہیں ایک نئی زندگی دینا کچھ زیادہ مشکل کام نہ رہا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ میں اسّی کی دہائی میں کئی عرب ممالک کو تعذیب و ہلاکت کا مرکز ٹھہرایا گیا۔ (5) عرب دانشور اور اہل فکر طبقے کو خاموش کروانے اور انہیں عوام الناس کے دائرہ سماعت سے باہر رکھنے کا اہتمام کیا گیا.....جبکہ ان میں سے زیادہ سرگرم افراد کو جبراً یا رضامندی سے لندن اور پیرس جلاوطن کر دیا گیا۔ (6) جہاں تک پرولتاریہ کا تعلق ہے تو ان نیم بے روزگاروں سے بھرے قصبے یقیناً بارود کا ڈھیر ثابت ہوتے اور اہل خوارج کی یاد تازہ کر دیتے لیکن انہیں کبھی سوشلزم کے مفہوم سے آگاہ ہی نہیں کیا گیا۔ فٹ بال میچ اور مذہبی پروگراموں کے بیچ پستے اس طبقے کی جھلک کبھی کبھار دیکھنے کو ملتی ہے۔

انسانی حقوق اور اس جیسے دوسرے میثاقوں اور ان کی تعبیر وتشریح کے عربی تراجم، عرب دارالحکومتوں میں ان کی اشاعت اور چند درہم کے عوض عام دستیابی کے لئے ہمیں اسّی کی دہائی کے اواخر تک کا انتظار کرنا پڑا جب یہ سب کہیں غیر سرکاری انجمنوں کی سعی کے باعث ممکن ہو سکا۔ خواندہ لوگ ان کتابچوں پر پل پڑے تاکہ حریت فکر (فکر کی آزادی) اور حریت الرائے (رائے کی آزادی) کے معانی جان سکیں اور دیکھیں کہ اقوام متحدہ کا منشور انہیں تعذیب کے خلاف کیسے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ (7) بائیں بازو کے دانشوروں اور فرد کے حقوق کے لئے سراپا احتجاج طالب علموں کی سعی کے باعث ممکن ہو سکا کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل

کی ضخیم دستاویزات کے عربی تراجم دستیاب ہونے لگے۔ قید سے رہائی یا مقدمہ کے بعد جرمانہ بھگت کر جب یہ سیاسی رہنما دوبارہ اپنی سرگرمیوں کا آغاز کرتے تو یہی لوگ اس امر کو یقینی بناتے کہ مذکورہ بالا دستاویزات سے پورے پورے پیراگراف بائیں بازو کے پریس میں چھاپیں۔

آندرے گلکسمین (Andre Glucksmann) ان دانشوروں میں سے ہے جو یورپی رائے کو متاثر کرتے ہیں۔ اس نے مسلم بنیاد پرستی کی تکسیر کرتے ہوئے اسے محض لوگوں کی ''جدید ریاست کی مشکلات'' سمجھنے میں ناکامی اور مغرب کو کھلنے والی اشتعال انگیز کھڑکی یعنی اسرائیل کی توڑ پھوڑ تک محدود کر دیا ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جس قدر لاعلمی وہ مسلمانوں سے منسوب کرتا ہے، گلکسمین کی مسلمانوں کے متعلق لاعلمی اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ اسے متکبرانہ یقین ہے کہ صرف اسے حقیقت تک رسائی حاصل ہے اور باقی ہر شخص حقیقت شناسی کی صلاحیت سے نسلاً محروم چلا آ رہا ہے۔ مزید برآں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بنیاد پرستی کو صرف اندر سے کچلا جا سکتا ہے۔ جب وہ یہ دعویٰ کرتا ہے تو دراصل وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ لوگ بغیر کسی مزاحمت کے بنیاد پرست مطلق العنانی کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ یوں وہ بطور مغربی خود پر کوئی بھی الزام لینے کو تیار نہیں۔ (8) مسلم عامتہ الناس عدم رواداری اور مطلق العنانی کے خلاف ہر روز جنگ کرتے ہیں۔ گلکسمین کا تبصرہ اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے کہ مسلمان باخبر رہنے کی کوشش نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ امر اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹیں بہت مختصر ہوتی ہیں اور ان میں فی ملک چند صفحات سے زیادہ مختص نہیں کئے جاتے۔ فقط 1989ء کی رپورٹ ورق گردانی کر لیں۔ اس کے صفحہ 282 پر درج ہے کہ عراق میں سیاسی قیدیوں پر اکثر تشدد کیا جاتا ہے۔ بہت سے افراد کے ''لاپتہ'' ہونے کی خبریں ملی اور سینکڑوں افراد پر مقدمے چلائے گئے ہیں۔ اب صفحہ 274 دیکھیئے۔ یہاں 1988ء میں سعودی عرب میں بادشاہت کے مفروضہ مخالفین کی رپورٹ دی گئی ہے۔ ان واقعات کا خصوصاً مشرقی صوبہ جات میں وقوع پذیر ہونا بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کئی حاجیوں کی گرفتاری کا ذکر بھی ہے۔ مقدمہ چلائے جانے کے بعد چھبیس افراد کی موت اور قطع اعضاء کی سزا پر عمل درآمد مذکور ہے۔ اس پر یہ کہنا کہ عوام مزاحمت نہیں کرتے ، ایک پیچیدہ صورت حال کو گمراہ کن طور پر سادہ انداز میں دیکھنے کی

کوشش اور حقیقی تصویر کو دھندلانے کے مترادف ہے۔ جب بنیاد پرستی کی اصطلاح بے دریغ استعمال ہو رہی ہو تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ ان کا دو متمیز گروہوں میں منقسم ہونا پیش نظر رکھا جائے۔ ایک حکومتی بنیاد پرستی یعنی وہ حکومتی تمدن جو جمہوری تعلیم کی راہ میں رکاوٹ ہے اور دوسری حزب اختلاف کی بنیاد پرستی- اور سب سے ضروری امر یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک ہی صف میں نہ رکھا جائے۔ اس طرح ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تمام مسلمان اہل یورپ کے متعلق ایک سا طرز فکر رکھتے ہیں حالانکہ اس حوالے سے مسلمان تین طبقات میں بانٹے جا سکتے ہیں: حکمران طبقہ، دانشور اور عوام الناس- ان میں سے ہر طبقے کے اپنے مفادات ہیں اور وہ ان کا اظہار سیاسی امکانات سے بھری فضا میں کرتا ہے جو اسے یکساں طور پر خطرناک اور مفلوج کن راستوں میں سے کسی ایک کو اپنانے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک راہ پر اسے عقیدے اور الحاد میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جبکہ دوسرے راستے پر اطاعت کے بالمقابل آزادی ہے۔

صدارت کو امامت میں بدلنے کا عمل.....رئیس الجمہوریہ

مسلمانوں میں سب سے کم ذہنی خلفشار کا شکار وہ لوگ ہیں جن کی ریاستوں کے سربراہوں نے اپنے روایتی خطاب برقرار رکھے ہیں۔ مدنیات یعنی سوکس جیسے مضامین سے عدم واقفیت کے عالم میں انہیں ''پریذیڈنٹ'' کی جگہ ''رئیس'' قبول کرنے میں الٹی سیدھی چھلانگیں نہیں لگانا پڑتیں اور وہ مسلمان جو میری طرح سلطنت میں رہتے ہیں سب سے کم مشکل میں ہیں۔ لفظ مَلِکْ (بادشاہ) کوئی مشکل کھڑی نہیں کرتا کیونکہ یہ نیا نہیں ہے۔ یہ لفظ قرآن اور از منہ وسطیٰ کی لغات میں بھی موجود ہے۔ ہمارے پاس ملک (ارضی حکومت) کے معاملات، رسوم، نوعیت اور اس کے تقاضوں پر الگ الگ رسائل موجود ہیں۔ تاہم رئیس الجمہوریہ (President of Republic) اس روایت کا حصہ نہیں ہے۔ قرآن اور قدیم لغات میں یہ ترکیب موجود نہیں۔ ''لسان العرب'' میں ''رئیس'' اور ''جمہوریہ'' کے الفاظ الگ الگ موجود ہیں لیکن ان کا کوئی باہمی تعلق نہیں۔ انہیں ملانے کی صورت میں نتیجہ ایک ملغوبے کی صورت نکلتا ہے جس میں نہ تو متراں (فرانسیسی صدر) اپنی شناخت کر سکتا ہے اور نہ بش (امریکی صدر) خود کو پہچان پائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرکب ''رئیس جمہوریہ'' کسی بھی

دوسرے عہدے سے زیادہ عباسی عہد کے امام کے لئے موزوں رہے گا۔

لفظ جمہوریہ(Republic) ایسے طرز حکومت کے لئے استعمال ہوتا ہے، جس میں اختیار کسی فرد کے ہاتھ میں نہیں اور ریاست کی سربراہی (صدارت) بھی موروثی نہیں۔ قرآن میں یہ لفظ موجود نہیں اگرچہ حزب (جماعت) اور حق (راستی) کے الفاظ موجود ہیں۔

''لسان العرب'' کی رو سے لفظ ''جمہوریہ'' ''الجمہور'' سے مشتق ہے اور اس کا مطلب ہے لوگوں کی اکثریت۔ لیکن یہ لوگوں میں سے ممتاز ترین کے لئے بھی مستعمل ہے۔ اگرچہ مرکزی خیال بہرحال گروہ بندی اور اکٹھ کا ہے۔ ''لسان العرب'' کا مصنف ابن منظور واضح کرتا ہے کہ ''جمہرہ'' کا مطلب ''اکٹھے ہونا'' ہے۔ وہ کئی ایک مثالیں فراہم کرتا ہے جن سے لفظ جمہوریت کے معیاری معنی متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مثالوں ہی میں وہ اسی مادے سے مشتق ایک عربی لفظ دیتا ہے جس کا تعلق غول سے ہے جبکہ لاطینی لفظRepublic رہنما کے اختیارات کی ماہیت کی تعریف کرتا ہے اور یوں اس لفظ میں نجی اور سرکاری کے درمیان فرق پر دیا گیا زور مضمر ہے۔ لغت میں اس لفظ کی تفہیم میں معاونت کے لئے جو مثالیں دی گئی ہیں ان میں سے ایک ''جمہوریہ وائن'' ہے جو زیادہ نشہ کر دے، اسے جمہوریہ کہا جاتا ہے کیونکہ اسے ''زیادہ تر لوگ'' استعمال کرتے ہیں۔ ہم اس حتمی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جمہوریہ میں ایک خاص طرح کا اتفاق رائے ملتا ہے یعنی کہ اجتماعیت میں وحدت ملتی ہے; لیکن یہ لفظ رہنما کے اختیارات کی نوعیت پر کچھ نہیں کہتا ہے۔

اور لفظ پریذیڈنٹ کا عربی میں ترجمہ کس طرح کیا جاتا ہے؟ صدارت کرنا (To Preside) دراصل لاطینی لفظ(Presidere) سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے، ''نشست اقتدار پر قبضہ (جیسے کسی اسمبلی وغیرہ میں).....بطور چیف آفیسر ہدایات دینا، قابو رکھنا، کاروائی میں انضباط لانا (ویبسٹر تھرڈ انٹرنیشنل ڈکشنری)۔ تاہم لاطینی سے اخذ شدہ یہ لفظ جب عربی میں جاتا ہے تو ''صدر جمہوریہ'' کی بجائے ''رئیس الجمہوریہ'' بن جاتا ہے۔ لیکن ایک لسانی نظام سے دوسرے میں منقلب ہوتے ہوئے عہدے کا مرتبہ اور وظیفہ یوں بدلتا ہے کہ ناقابل شناخت ہو جاتا ہے۔ ''رئیس'' یعنی سر باقی سارے جسم پر قابو رکھتا ہے۔ دماغ سے ضروری اشارہ روانہ نہ ہو تو چھنگلیا تک نہیں ہل سکتی- لاطینی سے عربی میں تقلیب کے دوران اجتماع کا تصور غائب ہو جاتا ہے۔ ڈرامائی انداز میں اس کی جگہ سب سے اونچا مقام

یعنی سر لے لیتا ہے۔ مذکورہ بالا بحث کے مطابق صدارت کا لاطینی مفہوم مکانیت کا ہے اور اس میں اختیارات کا استعمال رخ میں افقی ہے۔ اس کا رخ اسمبلی کے سامنے سے پیچھے کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن جب یہی تصور عربی میں جاتا ہے تو ایک جسمانی سکیم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں رہنما اور رہنمائی کرنے والے کے درمیان عمودی تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس صورت میں صدارت سر کو منتقل ہوتی ہے جبکہ جسم کے باقی ماندہ اجزاء بلاسوچے سمجھے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

''لسان العرب'' کی رو سے رئیس ہر چیز کا بلند ترین مقام ہوتا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں سب سے زیادہ ،اٹھارہ بار، انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لغت کی رو سے لفظ راسہ کا مطلب ''کسی کو سر پر چوٹ لگانا'' ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو ''رہنما اور ''زیر رہنمائی'' میں پرامن تعامل کا کوئی تعلق موجود نہیں ہے۔ ابن منظور اس امر کو یقینی بنانا چاہتا ہے کہ ہم پر واضح ہو جائے کہ ''راسہ'' کا مطلب لوگوں کو حکم دینا ہے اور رئیس ''عوام کا سردار ہے۔'' اس امکان کے پیش نظر کہ کہیں ہم رہنما کے ساتھ تعلق میں مضمر جبر کے معنوں پر گرفت نہ کر پائیں، وہ مزید لکھتا ہے، ''ارتعسرا'' کا اصل مطلب کسی کی گردن پکڑ کر اس کا سر زمین کی طرف کرنا ہے۔

چنانچہ جب کوئی عرب ''رئیس الجمہوریہ'' کا لفظ ادا کرتا ہے تو اس کے ذہن میں اسمبلی نہیں ہوتی جہاں رئیس ان کے رو برو بیٹھا ہے جو ان کی سنتا اور انہیں بحث و مباحثہ کی اجازت دیتا ہے۔ جب میں بطور ایک عرب خاتون لفظ رئیس الجمہوریہ ادا کرتی ہوں تو جسم پر دھرا سر میرے تصور میں آ جاتا ہے اور پھر میں کوشش کرتی ہوں کہ خود کو حسب استطاعت اس جسمانی تصویر میں بہترین مقام پر رکھ سکوں۔ لیکن یہ کوشش مجھے بے اختیار قرار دیتے ہوئے میری مذمت کرتی ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ بائیں پاؤں کے انگوٹھے یا ایسے ہی کسی دور افتادہ فراموش کردہ گوشے میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ جاؤں۔

بلاشبہ انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ مشرق وسطیٰ کی ذہنی ساختوں سے ڈرامائی انقطاع ہے۔ فلسفہ روشن خیالی سے پھوٹنے والے اس کے تصورات جابرانہ حکومت کے حامل معاشروں میں بھی پنپ کر اجتماعی اور انفرادی ادراک کو بدل سکتے تھے، لیکن اس کے لیئے لازمی شرط تھی کہ تعلیم اور شہریت کی تربیت کے ذریعے تبدیلی کا ایک باقاعدہ پروگرام چلایا

جاتا۔ اس طرح کی تعلیم انسانی رویے میں بہت گہری سطح پر تبدیلیاں لاسکتی تھی بشرطیکہ یہ پروگرام بیک وقت دو سطحوں پر شروع کیا اور چلایا جاتا۔ مسلسل تربیت اور حقیقی شرکت یعنی فیصلہ سازی کے جمہوری انتظامات میں ووٹ اور نمائندگی کے ذریعے مسلسل تربیت اور حقیقی شرکت ___ عباسیوں کے دور سے عربی زبان کو سخت قابو میں رکھا گیا تاکہ یہ اپنے زمانہ خلافت کے مزاج سے انحراف نہ کر سکے۔ عربی زبان میں اقتدار اور اس کا استعمال جو شکل اختیار کر چکا ہے، اس میں دقیقہ رس تبدیلیاں ناگزیر ہیں، بصورت دیگر یہ جمہوریت کی بنیاد یعنی تکثیر کے ہر حوالے کو نگلتی چلی جائے گی۔ ہم مسلمانوں کے پاس ایسا معاشرہ موجود نہیں جو جدید شہریت کے خواص کا حامل ہو۔ ایسا معاشرہ مسلم عامتہ الناس کو جدید بشریت نوازی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ ہمیں ایسے معاشرے کی کمی کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن یعنی اسلام کے اساسی متن سے رجوع کرنا ہے۔ ہم اگلے ابواب میں دیکھیں گے کہ جدید مسلم نوجوان اپنی خفتہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے، انہیں حقیقت کا روپ دینے اور باوقار طور پر زندہ رہنے کی ترنگ میں قدیم تصورات کو اپنے عدم تحفظ کا ترجمان کیوں خیال کر رہے ہیں۔ تحریر شدہ اسلام یعنی رسالتہ ایک وسیع قلمرو ہے جس میں امید کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ لیکن اگر اس امید افزاء گیت کو سننا ہے تو ہمیں ٹی وی کی مسجد سے دور رہنا ہوگا جس پر تنخواہ دار امام کا اجارہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں ارتکاز ذات کے عمل سے گزرنا ہوگا جیسے طویل عرصے پہلے ہمارے صوفی اجداد گزرے تھے اور یوں ہمیں وہ ''سیمرغ'' خود اپنی ذات کی گہرائیوں میں تلاش کرنا ہوگا، کیونکہ یہی ایک جگہ ہے جہاں یہ سما سکتا ہے۔

MashalBooks.org

باب5

قرآن حکیم

قرآن114 سورتوں پر مشتمل ہے جن کی طوالت یکساں نہیں۔ یہ ایک سو چودہ سورتیں چند آیات سے لے کر کئی صفحات پر محیط ہیں۔ امام ابن کثیر کے مطابق قرآن میں چھ ہزار (6000) آیات،77,439 الفاظ اور حروف کی تعداد321,180 سے کم نہیں۔(1) قرآن عربی زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا۔ فرشتہ جبرائیلؑ نے درمیانی واسطے کا کام کیا۔(2)

پیغمبرؐ اسلام چالیس برس کے تھے جب خدا نے انہیں ان کے منصب اور کار منصبی سے آگاہ کیا۔ پہلی بار جبرئیلؑ آپ کے پاس ہفتے کے روز، دوسری بار اتوار کے روز اور تیسری بار پیر کے روز آئے اور آپ پر منکشف کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت یعنی وحی کے لئے منتخب کیا ہے۔ یہ واقعہ610 عیسوی میں مکہ کے قریب ایک غار میں پیش آیا جہاں آپ اکثر غور وفکر کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ اولین نازل شدہ آیات اس حکم پر مشتمل تھیں کہ سیکھو اور بے خبری کی حالت سے نکل آؤ۔

(سورہ96، آیات 1 تا5)

یہ پیغام تیئس برس،610ء سے632ء یعنی آپ کے سال وصال تک نازل ہوتا رہا۔(4) آخری سورہ آپ کے وصال سے نو دن قبل تک نازل ہوتی رہی۔ لیکن آپ نے تبلیغ کا آغاز فوراً نہیں کر دیا، کیونکہ آپ کا شہر آپ سے معاندانہ رویہ رکھتا تھا۔ آپ نے اللہ کی طرف سے سونپا گیا فریضہ تین برس تک اپنے تک محدود رکھا۔ کہیں613ء میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ کھلے عام تبلیغ کا آغاز کریں۔ اگلے دس برس آپ نے مکہ میں تبلیغ

MashalBooks.org

جاری رکھی حتیٰ کہ 622ء میں شہروالوں کی دشمنی اس حد تک جا پہنچی کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں۔ تب آپ نے ہجرت کر کے مدینہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ (6) ہجرت کے وقت آپؐ کی عمر ترپن برس تھی۔ ہجرت کے سال کو اسلامی تقویم کا پہلا سال قرار دیا گیا۔ یعنی اسلامی تقویم کا آغاز مکہ چھوڑنے اور مدینہ کو ہجرت سے ہوتا ہے۔ السیوطیؒ کے مطابق ہجرت کے وقت تک جناب رسولؐ پر اسیؔ کے لگ بھگ سورتیں نازل ہوئی تھیں، جنہیں مکی کہا جاتا ہے۔ باقی چونتیس سورتیں مدینہ میں قیام کے دس سال کے دوران نازل ہوئیں اور انہیں مدنی سورتیں کہا جاتا ہے۔ (7) سورتوں کے مقام نزول پر کسی قدر اختلاف موجود ہے۔ مثلاً ابن کثیر کے مطابق مکی سورتوں کی تعداد 89 اور مدنی کی 25 ہے۔ (8)

کچھ ذرائع کے مطابق قرآن کی تحریری ترتیب کا فیصلہ آپؐ کے وصال کے فوراً بعد ہوا جبکہ بعض دوسرے ذرائع کے مطابق حضرت محمد ﷺ کے دوران حیات ہی میں یہ کام چھ اصحاب کر چکے تھے۔ محققین کے ایک اور گروہ کے مطابق تدوین قرآن حضرت عمرؓ کے عہد میں ہوئی، جس کا آغاز 13 ہجری (636ء) میں ہوا۔ اتنا بہرحال یقینی ہے کہ امت نے زبانی کلام کو تحریری شکل دینے کی اہمیت کا اندازہ بہت اوائل میں لگا لیا تھا حالانکہ ایسے اصحابہ کرامؓ بھی موجود تھے جنہیں غیر معمولی طور پر تیز قوت حافظہ سے نوازا گیا تھا۔ جو مصحف قرآنی آج ہمارے پاس موجود ہے تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت (35-23)/(55-644)ء میں مدون کیا گیا (10) قرآن کا یہ روپ تمام مسلمانوں، سنی اور شیعہ دونوں کے لئے، قابل قبول ہے۔ تمام مسلمان اسے مقدس کتاب مانتے ہیں جو لافانی ہے اور خود اللہ تعالیٰ کے الفاظ پر مشتمل ہے جن سے اللہ نے انسان کو مشرف کیا اور یوں انہیں سلامتی کا رستہ دکھایا جو دنیاوی خوشحالی اور آخرت میں جنت کا ضامن ہے۔ اس کے متن کی طاقت کی وجوہات میں سے ایک اس کا غیر متنازعہ طور پر مقبول ہونا ہے۔ اس کتاب کو مسلمانوں نے نسل در نسل اور حرف بہ حرف پندرہ صدیوں تک آگے منتقل کیا ہے۔

خارجیوں میں سے ایک انتہا پسند فرقہ نے بارہویں سورہ ''یوسف'' کو قرآن کے مشمولات میں سے ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ عشق و محبت کی کہانی قرآن میں شامل نہیں ہو سکتی۔ (11) اس فرقے کو عجیب و غریب اور انتہائی غیر ذمہ دار خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اپنے

MashalBooks.org

بانی عجردی کے نام کی رعایت سے اس فرقے میں شامل لوگوں کو عجروی کہا جاتا تھا۔ عجروی نے نہایت عجیب وغریب موقف اختیار کئے۔ مثلا ان کا خیال تھا کہ ہر انسان جو پیدائشی مسلمان نہیں لازماً جہنم میں جائے گا۔ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہونے والے لوگ بھی امت میں شمار نہیں کئے جاسکتے تاوقتیکہ وہ باقاعدہ دعوت پر اسلام قبول نہ کرلیں۔(12) عجرویوں کے متعلق نرم سے نرم الفاظ استعمال کئے جائیں تو کہا جائے گا کہ وہ قدرے عجیب وغریب تھے۔ قرآن کی ایک بھی آیت، چہ جائیکہ ایک پوری سورت کو مسترد کرنے والا کتاب مقدس کو تو بے اعتبار کیا کرے گا، خود اپنی وقعت وتوقیر کھو بیٹھے گا۔ مسلمانوں کے اس رویے سے مسلم ذہنیت میں اس صحیفہ کی اہمیت اور ماضی اور حال دونوں میں، اس کے پیغام کی قوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ہمیں قرآن کو مسلم علامات کے منبع اور متخیلہ کے گہوارہ کے طور پر دیکھنا اور اس حوالے سے اس کے کردار کا جائزہ لینا ہے تو بغور دیکھنا ہوگا کہ یہ نسل درنسل آگے کیسے منتقل کیا جاتا رہا ہے اور ایک صاحب ایمان کے بچپن میں اس کا کیا مقام ہوتا ہے اور کتابت اور تلاوت کے دوران قرآن کس طرح اس کے رگ و ریشے میں سمو دیا جاتا ہے۔

قرآن کی تعلیم

مجھے بچپن میں قرآن کو چھونے کا حق حاصل نہیں تھا۔ یہ اعزاز فقط لِلاّ فقیہہ کے پاس تھا جو ہمیں قرآن پڑھاتی تھی۔ سکول کے پہلے تین سالوں میں اس نے مجھے چکنی مٹی سے پُتی لکڑی کی تختی پر قرآنی آیات لکھنا سکھائیں۔ جمعہ کی صبح ہر بچے کو تختی ملتی جس پر پہلے سے آیات لکھی ہوتیں۔ ہم ایک خاص شہد رنگ روشنائی سماغ سے حروف کے ساتھ ساتھ قلم چلاتے۔ ہم نے لکھنا اسی طرح سیکھا۔ جمعہ اسی کام میں صرف ہو جاتا۔ میرے جیسے جو ہر چیز خصوصاً اپنا چہرہ، سماغ سے بھر دیتے۔ ہلکے پھلکے مزاح کا نشانہ بنتے۔ ''اگر اللہ تم پر کرم کرے تو جس روز تمہیں سماغ برتنا آ جائے گی، لکھنا سیکھ جاؤ گی اور صفائی بھی۔'' دن کے آخر میں تختیاں دیوار کے سہارے کھڑی کر دی جاتیں۔ لکھی ہوئی سطح دیوار کی طرف ہوتی۔ ہفتے کی صبح تختیاں خشک اور لکھائی پھر نکھر چکی ہوتی۔ ہم اس پر بہت فخر محسوس کرتے کیونکہ یہ بھولنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا کہ اس پر تو چٹاخ پڑے ہوئے تھے۔

ہمیں، جو سب سے چھوٹے تھے، اگلی قطار میں بٹھایا جاتا تاکہ نگرانی میں رہیں اور خصوصی توجہ حاصل کرسکیں کہ کونسا بچہ کس وقت سوگیا ہے یا پھر کب شرمیلی سرگوشی ''بیت الخلاء'' سنائی دیتی ہے۔ جوں جوں بچے بڑے ہوتے جاتے انہیں فقیہہ سے دور بیٹھنے کی اجازت ملنے لگتی۔ درست ہے کہ جب آپ بہت چھوٹے ہوتے ہیں تو تمام سرگوشیاں اور دلچسپ شور آپ کی پشت پر ہوتا ہے، لیکن آپ خود کو محفوظ خیال کرتے ہیں۔ ہفتے کی صبح سب بچے تختیاں سنبھالے اپنی جگہ اپنے اپنے نمدوں یا گدیوں پر بیٹھ جاتے۔ فقیہہ کی ہدایت کے مطابق ہم پر اسرار تقوش از سرنو دہرانے لگتے جنہیں ہم نے ایک روز پہلے لکیرا ہوتا۔ ہم عنایت بھرے الفاظ دہراتے اور ہماری نگاہیں استانی کی انگلیوں کے اشارے پر ہوتیں، جن سے وہ اپنے قریب ترین تختی والی کو ہدایات دے رہی ہوتی۔ بعدازاں جب اس کی توجہ اپنی بڑی عمر کی شاگردوں کی طرف ہوتی تو وہ ہمیں بھول جاتی۔ پھر وہ اپنی بیٹیوں کو دوپہر کا کھانا تیار کرنے کی ہدات دینے لگتی۔ ہم اپنا دوپہر کا کھانا ساتھ لاتے یا کھانے گھر چلے جاتے۔ اس کا انحصار اس بات پر تھا کہ کس کا گھر کتنی دور ہے۔

بچے عموماً اپنی پڑوس کی فقیہہ کے ہاں جاتے تھے بشرطیکہ فقیہہ اور بچوں کے والدین کے درمیان کوئی قابل ذکر تنازعہ نہ ہوتا۔ ایک بار فقیہہ نے میرے کزن عزیز کو مارا۔ وہ بہت مغرور تھا۔ اس نے گھر میں وہ فساد برپا کیا کہ تمام مرنیسی بچے (ہم دس تھے) ایک دوسری فقیہہ کے ہاں جانے لگے، جو ہمارے گھر سے چند کلومیٹر دور رہتی تھی۔ یوں ہمیں پڑھائی سے پہلے اور بعد میں چند گھنٹے شہر میں گھومنے کا موقع مل جاتا۔ ہفتے سے بدھ تک، جو تلاوت کا دن تھا، ہم اپنا سبق دہراتے۔ اس دن منظر پر ایک اور شخص بافقیہہ (بابا فقیہہ) یعنی فقیہہ کا خاوند نمودار ہوتا۔ ہم سے تختیاں لے لی جاتیں اور ان پر لکھے گئے جملوں کی تلاوت کا کہا جاتا۔ جس شاگرد کو آیات یاد نہ ہوتیں یا پڑھنے میں غلطی کرتا اسے بافقیہہ کی گھرکیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ''تین آیتیں اور پورا ہفتہ اور تم ابھی تک اٹکتے ہو۔ اس چھوٹے سے سر میں چھ ہزار آیات کس طرح سما پاؤ گے؟ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس کھوپڑی میں کچھ ہے بھی یا نہیں؟۔'' جو بچے کوئی غلطی نہ کرتے انہیں ڈھیروں دعائیں ملتیں۔ ان بچوں کو مذہبی تقریبوں یا سکول میں کسی اہم شخصیت کی آمد پر تلاوت کے لئے چن لیا جاتا۔ سیکھنے میں تیزی دکھانے والے بچے کو نابغہ خیال کیا جاتا وہ بعدازاں دوسرے میدانوں میں

بھی ممتاز رہتا۔ میری یادداشت بہت اچھی لیکن آواز تیکھی نہیں تھی۔ اسی لئے تقریبات اور اجتماعات کے دوران مجھے پہلی قطار سے نکال کر دوسری میں بھجوا دیا جاتا۔ بعد کی ساری زندگی میرا معمول رہا کہ اپنی جماعتوں اور سیمیناروں کے دوران طالب علموں کی نشستیں تبدیل کرتی رہتی تاکہ ان میں جمود پیدا نہ ہونے پائے اور مایوسی سے بچے رہیں۔

بچہ تین برس کی عمر میں مدرسہ جانا شروع کرتا ہے اور چھ برس کا ہوتے ہوتے لکھنے اور سماغ کے استعمال پر قادر ہوجاتا ہے۔ اسے صفائی ستھرائی کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی یادداشت بہت اچھی ہو چکی ہوتی ہے۔ تقریباً پانچ برس کی عمر میں آپ کو پہلا تحفہ ملتا ہے جو اس امر کی علامت ہے کہ اب آپ ایک اہم شخص ہیں۔ یہ تحفہ ایک چھوٹا سا، عمدہ رسم الخط میں لکھا اور سنہرے نقوش سے مزین قرآن پاک ہوتا ہے۔ میرے باپ نے مجھے میرا یہ تحفہ ایک جمعہ کی صبح کو دیا۔ لیکن بیس منٹ بعد جب میری ایک کزن مجھے باہر کھیلنے کو بلانے آئی تو واپس لے لیا، جب کھیل چکو تو دوبارہ لے سکتی ہو۔ میں اسے اوپر کھڑکی کے کارنس پر رکھ رہا ہوں۔ اٹھانے کو تمہیں فقط سٹول پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ اسے کبھی فرش پر نہ گرنے دینا اور نہ کبھی ہاتھ منہ دھوئے بغیر چھونا، اگر دوران مطالعہ کوئی کھیلنے کو بلائے تو جو صفحہ پڑھ رہی ہو اس ریشمی ڈوری سے نشان زد کرو، بڑی احتیاط سے بند کرو اور سٹول پر کھڑے ہوکر کتاب اللہ کو اس کی جگہ پر رکھ دو'' پوری اسلامی دنیا میں اہل ایمان قرآن کی اہمیت نسل بعد نسل دلوں پر نقش کرتے چلے آئے ہیں۔ شمالی افریقہ یا عرب میں ہونے والی کانفرنسوں یا سیمیناروں میں مجھے بیشتر اوقات پتہ چل جاتا ہے کہ شرکاء میں سے کون قرآنی مدرسے کے تجربے سے گزرا ہے۔ انہیں ٹیلی فون نمبر لکھے بغیر یاد رہتے ہیں۔ اجلاس کے دوران بہت کم ہوتا ہے کہ انہیں یادداشتیں لکھنے کی ضرورت پڑتی ہو اور ان میں سالوں پہلے ہونے والی گفتگو حرف بہ حرف دہرانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

میں نے چالیس کی دہائی میں جس طرح کے قرآنی مدرسے میں پڑھا عین اسی طرح کا تھا، جیسا میرے دادا نے دیکھا اور مجھ سے بیان کیا تھا۔ ان کے دادا نے انہیں اپنے مدرسے کا جو احوال سنایا وہ بھی سرمو مختلف نہیں تھا اور قرآنی مدرسوں کا یہ احوال ازمنہ وسطیٰ کی کتب میں ملنے والے ماحول سے کس طرح مختلف نہیں۔ آج کل یہ مدارس قدرے جدید ہو چکے ہیں۔ ایک تختہ سیاہ اور رجسٹر حاضری کا اضافہ ہو چکا ہے، جو فقیہہ کی تحویل میں ہوتا

ہے۔جدت اپنی جگہ لیکن طرز تدریس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ چونکہ آلات تدریس کی تعداد کم از کم رکھی جاتی ہے اور ایک ہی استاد اسی ایک کمرے میں مختلف مدارج کے بچوں کی نگرانی اور تدریس کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ یہ مدرسے چلانے میں سب سے کم خرچ ہیں۔ سوائے ان چند لمحوں میں جب استاد کو کسی کام سے کھسکنا پڑتا ہے، بچوں کو سارا دن زیرنگرانی رکھا جاتا ہے- وہ اپنی جگہ کسی بڑی عمر کے طالب علم کو کھڑا کر جاتا ہے۔ ان مدرسوں کے تاحال قائم رہنے کی وجوہات میں سے غالبًا ایک یہ ہے کہ آج بھی کم آمدن والے والدین کے لئے اپنے بچوں کو باقاعدہ سکول بھیجنے اور تعلیم دلانے کا یہی واحد ذریعہ ہیں۔

لیکن ایک بہت بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے بچوں میں مکمل علیحدگی ہو چکی ہے۔ میرے زمانے میں مختلف مدارس کے مابین انتخاب کرتے ہوئے والدین کے پیش نظر فقط گھر سے قربت واحد ترجیحی معیار ہوتا تھا، ورنہ غریب اور امیر دونوں ایک ہی طرح کے مدارس اور ماحول میں تعلیم پاتے تھے۔ آج امیر بچوں کے والدین انگریزی طرز کے کنڈر گارٹن یا فرانسیسی طرز کے ''میٹرنلز'' میں جاتے ہیں جہاں وہ لکھنے پڑھنے کی ابتدا "Snow white" اور "Alice In Wonderland" سے کرتے ہیں یا بہت تھوڑے سے پیریڈ عربی زبان اور مذہبی تعلیم کے لئے ہوتے ہیں، لیکن لاکھوں کی تعداد میں بچے آج بھی قرآنی مدرسوں سے زندگی کا آغاز کرتے ہیں، کیونکہ یہ ان کے لئے واحد دستیاب ڈے کیئر سینٹر ہیں۔ مثلاً مراکش میں حکومتی مالی امداد سے چلنے والے ڈے کیئر سینٹر آبادی کے اعتبار سے نہ ہونے کے برابر ہیں اور یہ حال اس ملک کا ہے جہاں آبادی میں اضافے کی شرح تین فی صد سالانہ ہے۔ بچے کو ڈے کیئر سینٹر میں داخل کروانے کا خرچ دو سو ڈالر ماہوار ہے جہاں سے بچے کو دوپہر کے کھانے کے لئے گھر لے جانے اور وہاں سے واپس لا کر چھوڑنے کی ذمہ داری والدین کے سر ہے۔ ایک سے زیادہ بچوں کے حامل خاندان کو نجی ڈے کیئر سینٹر کس بھاؤ پڑے گا جہاں کم از کم قانونی مزدوری صرف ڈیڑھ سو ڈالر ماہانہ ہے جبکہ دوسری طرف ہمسائے میں موجود قرآنی مدرسہ میں یہی خرچ کم ہو کر تین ڈالر ماہانہ سے زیادہ نہیں رہ جاتا اور گھریلو ملازمائیں، فیکٹری کارکن، خواتین اور دستکاری کی صنعتوں سے وابستہ خواتین اپنے بچے علی الصبح یہاں چھوڑ جاتی ہیں اور کام سے واپس گھر

جاتے انہیں ساتھ لے جاتی ہیں۔

علم کی غیر مساوی تقسیم

میرے خیال میں مذکورہ بالا دو اقسام کے تعلیمی اداروں میں فراہم کی جانی والی تعلیم کا فرق آج کی عرب دنیا کو طبقات میں تقسیم کرتا اور ان میں معاندانہ فرق کو بڑھاتا ہے۔

امراء کے بچے ابتداء ہی سے جدید اور روایتی دونوں علوم سے بہرہ ور کئے جاتے ہیں جبکہ غریب والدین کے بچوں کو اوائل عمر میں جدید تعلیم خصوصاً ریاضی اور جدید تعلیمی کھیلوں سے دور رکھا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ روایتی مدارس کے کئی مرد اور خواتین اساتذہ جنہیں تدریس کو جدید بنانے کی ضرورت کا احساس ہے، بچوں سے ریاضی کی کتب اور کچھ کھیلیں خریدنے کا کہتے ہیں۔ لیکن ان کی زیادہ تر تعداد مطلوبہ تدریسی مہارت سے عاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدرسوں میں سات برس کی عمر تک رہنے والا بچہ (جو سرکاری مدارس میں تعلیم کے لئے آخری حد ہے) رسمی تعلیم کا آغاز کرتا ہے تو وہ ایسی معذوری کا شکار ہو چکا ہوتا ہے جس پر بعد میں قابو پانا مشکل ہوجاتا ہے۔ جدید سائنس اور غیر ملکی زبانوں کے معاملے میں یہ حقیقت اور بھی سنگین صورت اختیار کر جاتی ہے اور یہی وہ مضامین ہیں جنہیں مغربی انداز کے سکولوں میں ترجیح دی جاتی ہے۔ والدین کی آمدن اور سماجی طبقاتی رتبے کا فرق مسلم بچوں کی تمدنی کائنات میں طبقاتی امتیاز کے فروغ کا سبب بنا اور بچپن میں جدید تعلیم تک رسائی نہ پانے والوں میں غیر ملکیوں سے خوف اور مغرب کو مسترد کر دینے کے رویے نے جنم لیا اور پھر ملازمتوں تک عدم رسائی بھی جدید علوم تک عدم دسترس کا براہ راست نتیجہ تھا۔(3)

اور پھر یہ دیکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ہم اپنی اصل یا شناخت کو محفوظ رکھنے میں جتنے پیٹرو ڈالر خرچ کرتے ہیں، سب کا مقصد روایتی علم کا فروغ ہے۔ یورپ میں زندگی گزارنے والی مسلم کمیونٹی اپنی شناخت کی بقاء پر جتنی سرمایہ کاری کرتی ہے، زیادہ تر قرآنی مدارس کے قیام پر صرف ہو جاتی ہے۔ جبکہ یورپ کی مسابقت بھری محنت کی منڈی میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے لازم ہے کہ شمالی افریقی نوجوان نسل دونوں علوم کے امتزاج تک کماحقہ رسائی رکھتی ہو۔'' دوسرے منصوبوں کے ساتھ ساتھ اسلامی ترقیاتی بینک نے

پیرس کے جنوبی مضافات ایوری میں ایک نہایت خوبصورت اور قیمتی ثقافتی مرکز کے قیام کے لئے مالی معاونت فراہم کی ہے۔ اس علاقے میں ستر ہزار مسلمان مقیم ہیں۔ یہاں عورتوں اور مردوں کے لئے نماز کی ادائیگی کے لئے الگ الگ ہال، ایک کتب خانہ، ایک قرانی مدرسہ اورایک خوبصورت مسجد موجود ہے۔ اس سارے کام پر دوملین ڈالرخرچ اٹھا ہے۔ ''(14) تیل کی آمدن علم تک غیر مساوی رسائی کے منصوبوں میں استعمال نہیں کی جا رہی۔ اس کی بجائے تقدس کے بارے میں ''طاعت'' (مقتدرہ کے حکم کی تعمیل) خوئے تسلیم اور جبر کو مسلسل ہمارے اذہان میں انڈیلا جا رہا ہے۔

یہ سب اپنی جگہ لیکن اگر تقدیس کو بنیاد بنا کر چلنے والی تحریکوں کی حرکیات کا مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن کا مخصوص مقاصد کے لئے استحصال کرنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود کہیں کوئی قوت موجود ہے جو ان آیات کی وساطت سے منتقل ہو رہی ہے۔ یہ قوت دبائے جانے کی تمام تر کوششوں کے باوجود اپنے ہونے اور اثرات کا احساس دلاتی ہے۔ فرد کو اتنی توانائی دیتی ہے کہ وہ اپنے اضطراب اور ناراضگی کا اظہار اور دنیا کے کسی اور طرح کے ہونے کا تخیل پال سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے لئے قرآن کے الفاظ، علامات اوراس کے مناظر سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ پندرہ صدی پرانے جذبات سے پھٹ پڑنے کی حد تک طاقتور محوری تصورات ہیں جنہیں ہمارے معاشروں کے غیر مطمئن عناصر ازسرنو فعال کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انہی تصورات میں حق و باطل بھی شامل ہیں۔ امام خمینی نے حق و باطل کا نعرہ لگا کر ہی وہ ہلچل مچائی کہ وہاں اٹھنے والی موجیں ستر کی دہائی میں شاہ ایران کو باہر بہا لے گئیں۔ بغداد پر بمباری کے دوران لاہور سے Nouhakchot تک گلیوں میں مظاہرین اسی حق کو پکار رہے تھے۔لیکن حق کے لئے صدا بلند کرنے والے نے نعرے میں اپنی محرومی اور اضطراب بھی شامل کر دیا تھا۔

حق ہجوم کو کس طرح متلاطم کرتا ہے، یہ سمجھنے کے لئے ہمیں اپنی اجتماعی یادداشت میں بہت روز تک جانا ہوگا۔ ہمیں تقویم یعنی کیلنڈر کو الٹا گھما کر صفر یعنی نقطہ آغاز تک لے جانا ہوگا اور قبل اسلام یعنی جاہلیہ تک جھانکنا ہوگا؛ اسلام سے قبل مکہ کس طرح کا تھا۔ ایسا تمام معکوس سفر بلاشبہ ایک مہم جوئی ہے۔ یہ ''الغرب'' یعنی اجنبی سے ملاقات کے مترادف ہے۔ ہمیں یہ علم ہے اور ہم اس کے لئے تیاری کرتے ہیں، لیکن ''جاہلیہ'' کے مقابلے میں غریب کا

ڈھونڈنا مشکل ہے۔ تشدد اور بدنظمی کے حوالے سے تو قبل اسلام کا طرز حیات ہمارے آج کے شناسا انداز سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ پرانے اور نئے میں عدم شناخت کے باعث ایک پر دوسرے کا التباس اتنا اضطراب انگیز ہے کہ پرانی اساطیر کی طرح، ہمیں خبر نہیں رہتی کہ ہم وقت میں آگے بڑھ رہے ہیں یا پیچھے کو لوٹ رہے ہیں- کیا واقعی جاہلیہ ہماری پشت پر یعنی ہمارا ماضی ہے؟

MashalBooks.org

باب6

حریتِ فکر کا خوف

یہودیت اورعیسائیت دونوں مذاہب کے نام اپنے پیغمبروں (یہوداؑ اور مسیحؑ) کے اسمائے مبارکہ پر ہیں۔ لیکن اس کے برعکس لفظ اسلام حوالگی اور اطاعت بیان کرتا ہے۔ ''اسلام'' کا عربی مادہ ''استسلام''، حرب یعنی جنگ سے کنارہ کش ہوتے ہوئے ہتھیار پھینک دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ فریقین میں جنگ بندی کے بعد ایک فریق استسلام (ہتھیار پھینک دینے) اور دوسرا تسلیم (قبول کر لینے) پر عمل پیرا ہے۔ جنگی قیدیوں کے لئے مستعمل الفاظ میں سے ایک لفظ ''سلام'' بھی ہے۔ (1) مکہ کی جنگ بندی کے فریقین کی شناخت کے لئے آٹھویں صدی ہجری (630عیسوی) میں ہونے ولی فتح مکہ کا حال پڑھنا کافی رہے گا۔ اس سال حضرت محمد ﷺ بطور فاتح مکہ واپس ہوئے اور بت پرست عربوں کے مذہبی مرکز مکہ کا سرکاری مذہب اسلام قرار پایا۔ یہ جنگ بندی اہل مکہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوئی اور اہل مکہ شرک اور اپنے اس مذہب کے انتخاب سے دستکش ہوئے جو کعبہ میں رکھے تین سو ساٹھ بتوں کی صورت جاگزیں تھا۔ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے مکہ میں امن کی ضمانت فراہم کی جہاں امن و امان ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ لفظ ''شرک'' اسلام کا متضاد ہے۔ شرک یوں اسلام کا الٹ ہے کہ موخرالذکر زمین اور آسمان پر انتشار ختم کرتا ہے۔

شرک، مذہب اور انحراف کی آزادی

مذہب اور رائے کی آزادی کا علمبردار ہونے کے حوالے سے ''انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ'' اہل اسلام کے لئے شرک کو ازسرنو فعال کرنے کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے

MashalBooks.org

کہ شرک اپنے اشتقاق کی رو سے مطلب 'اکٹھے ہونا'' اور ''حصہ لینا'' ہے۔ اس لفظ کیمستعملات منفی اثرات کے حامل ہیں کیونکہ اسے630 عیسوی یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں فتح ہونے سے قبل مکہ میں پراگندگی اور انتشار کو بیان کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ فتح کے موقع پر رسول اللہ نے تمام دیوتاؤں کو ان کے استھانوں سے گرا دیا۔

''پیغمبر اسلامؐ بطور فاتح مکہ میں داخل ہوئے تو لوگ کچھ مجبوراً اور کچھ برضا و رغبت مسلمان ہوگئے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنی سواری پر ہی کعبہ کے گرد طواف کیا، جس میں تین سو ساٹھ بت رکھے تھے۔ ہر بار جب کسی بت کے پاس سے گزرتے تو اپنی چھڑی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے: ''حق ظاہر ہوا، باطل چھپ گیا۔ اس لئے کہ باطل کو بالآخر مٹ جانا ہوتا ہے۔'' جب بھی وہ یہ جملہ دہراتے صنم اپنے استھان سے پھسل کر زمین پر گرتا اور چور چور ہو جاتا۔ سب سے اہم بت ہبل تھا۔''(2)

ابن سعد سے لیا گیا یہ اقتباس جدید اسلام کو درپیش کئی معموں کے حل میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ ان معموں میں سے ایک تو شخصی آزادی کا خوف ہے۔ انسانی چہرے کی شبیہ سازی کی ممانعت کی جڑیں اسی خوف میں ہیں۔ دوسرا معمہ سیاست سے عورت کا باہر کیا جانا ہے۔ اس عمل کا گہرا تعلق خدا کے واحد ہونے کے عقیدے سے ہے۔ کعبہ میں موجود تین سو ساٹھ معبودوں میں سے طاقتور ترین دیویاں تھیں۔ یہ دیویاں ''رحمہ'' یا ایک پالن ہار ماں کی محبت اور شفقت سے متصف نہ تھیں اس لئے کہ یہ ہمیشہ قربانی کی طالب ہوتیں اور اس کے خون میں لتھڑی رہتیں اور چونکہ یہ قربانی فقط برائے قربانی ہوتی اور کسی دوسری افادیت کی حامل نہ تھی چنانچہ اور بھی ظالمانہ ہوتی۔ ان دیویوں کو جن مادرانہ معجزات کی ضمانت خیال کیا جاتا، ان سے کبھی سرزد نہ ہو سکتے۔ یوں نسوانیت کو پردہ عام پر ظہور پذیر ہونے کی ممانعت پر دوہری مہر ثبت ہونے کو تھی۔ عورتوں کو حجاب اختیار کرنا تھا۔ اول اس لئے کہ دیویوں کی بے رحمی اور تشدد انگیز توقعات ان کے ساتھ منتشخص ہونے لگے تھے اور دوسرے اس لئے کہ امت کو یک جان اور شہر کو ہر چیز سے پاک کرنا تھا جو شہر میں قبل اسلام کے انتشار کی پشت پناہی کرے۔ ہم اس ابتدائی منظرنامے کی طرف لوٹیں گے جب اسلام کا عمرانی معاہدہ تکمیل پایا: آزادی کے بدلے امن اور شرک کے عوض رحمت کی ضمانت۔

MashalBooks.org

بلاشبہ 630ء سے قبل افکار کی آزادی موجود تھی اور عرب کے آسمانوں پر دیوتا ہجوم در ہجوم منڈلاتے تھے اور معبدوں کے ساتھ ساتھ ہر گھر میں ان کی جگہ موجود تھی۔ اس زمانے میں جب عربوں کے پڑوس میں یہودیت اور عیسائیت بحیرہ روم کے علاقے میں پورے کروفر اور طمانیت سے جمی ہوئی تھی، عرب وحدانیت کو مسلسل مسترد کرتے چلے جا رہے تھے اور بقول ابن خلدوں: ''اپنی بت پرستی میں شہرت رکھتے تھے۔'' قبل اسلام کے عرب مذاہب پر ابن خلدون نے نہایت سحر آفریں اور نادر تحریریں قلمبند کی ہیں۔

> ''مکہ کے ہر گھر میں ان کا اپنا صنم تھا، جس کی اہل خانہ پوجا کرتے تھے۔ اہل خانہ میں سے کوئی سفر پر روانہ ہوتا تو گھر چھوڑتے ہوئے سب سے آخر میں وہ صنم پر ہاتھ رکھتا، اسے تھپتھپاتا تا کہ اس کی کرم گسترانہ قوتوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ سفر سے لوٹتا تو گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے صنم کے پاس جاتا اور وہی رسم دہراتا تا کہ کرم گستری سے فیض یاب ہو سکے۔''

''انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ'' کی شق اٹھارہ میں لفظ(Freedom) کے ترجمہ کے لیے مناسب ترین لفظ شرک ہے اور یہ وہ مثالیہ ہے جس کا حاصل کیا جانا مقصود ہے۔ ہر کسی کو خیال، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں مذہب بدلنے کی آزادی بھی شامل ہے۔ یہ شق عین جاہلیہ کی تعریف ہے یعنی قبل اسلام کی پرانتشار اور غیر منظّم دنیا کی۔ اس کا مطلب وقت کے پیمانے پر صفر کی طرف مراجعت ہے۔ اقوام متحدہ کے مترجم جنہیں چارٹر عربی میں منتقل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، کام کے بوجھ تلے چکرا گئے۔ ''اپنا مذہب تبدیل کرنے کی آزادی'' (Freedom to Change his Religion) کے لئے مناسب ترین لفظ ''شرک'' استعمال کرنے کی بجائے وہ چار الفاظ پر مشتمل (حق حریۃ تغییر الدینیہ) اصطلاح برتتے رہے۔ حالانکہ شروع سے آخر تک قرآن میں یہ لفظ160 بار سے کم استعمال نہیں ہوا۔ (4) ایسا نہیں ہے کہ مختصر سی شق 18 اور شرک کے تصور میں جمہوریت اور اسلام کے درمیان فلسفیانہ نوعیت کی بحث سما گئی ہے.....وہ فلسفیانہ بنیادی بحث جسیشاہی دربار کی پشت پناہی کے باعث منظر عام پر آنے سے روکے رکھا گیا۔ سوال بہت سادہ اور فقط اتنا ہے، کیا ہم اس اسلام سے محبت کرتے ہیں جو پولیس کے زور سے ہم پر مسلط کیا جاتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ اسلام سے ہماری محبت ان تمام خوبصورتیوں کی وجہ سے ہے جو پولیس دے

سکتی ہے اور نہ ہی چھین سکتی ہے.....خصوصاً ''رحمت'' جیسا عظیم الشان تصور۔

رحمت.....ایک متجانس شہر میں ہمدردی

میں نے1971ء میں برکلے کے ایک کالے مسلمان کا انٹرویو کیا کہ وہ اسلام کی طرف کیسے مائل ہوا؟ لفظ ''رحمت'' اس کی ساری گفت وشنید کا حاصل ثابت ہوا۔ اس نے کہا، ''یہی لفظ تھا، یہی ضابطہ تھا۔ جس کی مجھے دیر سے تلاش تھی اور یہاں وہ مجھے مل گیا۔'' اس کا ایک شامی دوست ایک جمعہ کو اسے سان فرانسسکو کی مسجد میں لایا۔ اس دن امام نے اپنے خطبے کے لئے جو آیت چنی وہی تھی جسے ہمیں بچپن میں یاد کرایا گیا تھا کہ اندھیرے سے ڈر لگنے کی صورت میں اسے پڑھیں۔ ''کتب علیٰ نفسہٖ الرحمتہ'' (سورہ6۔آیت ۔54) رحمہ کا تصور نہایت وسیع وعمیق اور کثیر پہلو ہے۔ اس میں حساسیت (الرقہ)، گداز اور معاف کرنے کی صفات سب سما جاتی ہیں۔ اس میں نرماہٹ، مٹھاس، پرورش اور حفاظت سب سما جاتا ہے.....بالکل رحم مادر کی طرح؛ رحمتہ کا مادہ ہی رحم مادر ہے۔ بارش رحمت ہے کیونکہ یہ بڑھوتری اور خوشحالی (الخیر) (6)لاتی ہے۔ امت مسلمہ رحمتہ سے چھلک رہی ہے اور یہ ایسا تعلق ہے جو خاندان کے افراد کے مابین ہوتا ہے اور ان میں سے کوئی بھی دوسرے کے انجام اور مقدر سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

آج کے نوجوان مسلم بنیاد پرست کے شور وشغب کا سبب دراصل، دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ، اس اسلام کے نام اپیل بھی ہے جو رحمت سے متصف ہے۔ وہ اسلام جس میں شہر کے صاحب ثروت غریبوں کے اضطراب کو بے حسی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ان کی نعرہ بازی دراصل خاندان کے نہ چاہے جانے والے بچوں کی شکایت ہے جو جدید علم اور اس کی سائنسوں سے کٹ گئے ہیں اور یوں وہ روزگار اور وقار دونوں کی ضمانت سے محروم ہیں۔ ان نوجوانوں کی صدائے احتجاج کو کرہ ارض کے امراء.....یعنی اہل مغرب کے خلاف اعلان جنگ خیال کر بیٹھنا ان کے اضطراب کی تفہیم میں ایک بڑی غلطی کرنے کی مترادف ہوگا۔ اس دنیا میں امن اور اس کے حصول کے لئے حکمت عملی کا انحصار جزوی طور پر اس اضطراب اور غم وغصے کے درست تجزیے پر منحصر ہے۔ اگر تو ان کے متشددانہ رویے پر کیمرہ مرکوز رکھا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہیں ختم کرنے کی حکمت عملی وضع کی گئی ہے۔لیکن اگر

ان کے غم و غصے کو، جو علم کی دعوت عام میں نظر انداز کر دیے جانے پر احتجاج ہے اور جو اس کے لیے جدیدیت کی پرکشش ترین نعمت ہے، توجہ کا مرکز بنایا جاتا ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ اسے اس دعوت میں شریک ہونے دیا جا رہا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو آٹھویں صدی ہجری کے کعبہ کی طرف مراجعت میں دلچسپی کی وضاحت کرتی ہے کہ یوں ہمیں بہتر اندازہ ہو سکے گا کہ اسلام، جو اس وقت محض امن کی امید نظر آتا تھا، درحقیقت کیا پیغام دے رہا تھا اور اسے کس مزاحمت کے خلاف نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔

کعبہ میں تخت نشیں 360 دیوتا کثرت اور آزادی فکر وعقیدہ کا اظہار تھے لیکن اسلام اپنے خداواحد کے ساتھ فاتح رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام رحمتہ کے قیام میں کامیاب رہا تھا جس کی ضمانت دینے میں وہ دیوتا بے بس رہے تھے۔ اس وقت مکہ میں انتشار اس درجہ زوروں پر تھا کہ انسان کو خوش کرنے والے دیوتا بھی توڑ پھوڑ دیئے جاتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ کی کامیابی نہایت تیز رفتار اور فیصلہ کن تھی کیونکہ عرب شہری عدم تحفظ، فتنہ اور انتشار سے متاثر ہو رہے تھے۔ بقول طبری جاہلیہ اجتماعی رویہ تھا اور یہ ظلم و جبر لاعلمی اور بے خبری کی پیداوار تھا۔(7) ایک باخبر اور صاحب علم شخص ظالم اور فسادی نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے رحمتہ کے قیام کے لئے اسی رویے کو ختم کرنے کی تجویز پیش کی۔

ہوا (خواہش) کی قربانی

دوسرے وحدانی مذاہب کی طرح اسلام بھی قربانی.....یعنی خواہش، ''ہوا'' کی قربانی..... کی قیمت پر رحمتہ کے قیام کا وعدہ کرتا ہے۔ اجتماعی امن اور رحمت کے قیام کی ایک ہی صورت ہے کہ فرد اپنی ''ہوا'' و ہوس سے دستبردار ہو جائے کیونکہ انہیں ہی اختلاف رائے اور جنگ کا منبع خیال کیا جاتا ہے۔ جاہلیہ میں ''ہوا''، خواہش اور انفرادی انانیت کی حکمرانی تھی۔ اسلام کے پیش نظر اس کے برعکس کا حصول تھا- یعنی ''ہوا''، انفرادی خواہشات اور جذبات، کی قربانی کی قیمت پر اجتماعی سطح پر رحمتہ کا استقرار ___ آزادی کے بدلے میں رحمتہ ایک طرح کا عمرانی معاہدہ ہے۔ نئے مذہب نے اہل مکہ کے سامنے یہی معاہدہ پیش کیا۔ آزادی فکر سے دستکش ہوتے ہوئے خود کو گروہ کے ماتحت کر دینا وہ میثاق تھا جو امن کی راہ پر گامزن کر سکتا تھا- اگر فرد اپنی اپنی انفرادیت قربان کرنے پر رضامند ہو جائے تو

سلامتی کا قیام عمل میں آ سکتا ہے۔ اگرچہ ''ہوا'' سے ''خواہش'' اور ''جذبہ'' دونوں مطالب نکلتے ہیں لیکن اس میں ''شخصی رائے'' کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ یہ کسی شخص کی ایسی بے لگام خواہش ہوسکتی ہے جو محض اپنے مفاد کے پیش نظر دوسروں کے وجود سے انکار کر دے۔ خواہش جو اپنی تعریف میں ہی انفرادی ہے، رحمتہ کا الٹ ہے۔ اس لئے کہ رحمتہ دوسروں کے حوالے سے انتہا درجہ کی حساسیت ہے: دوسرے سب لوگوں کے لئے، پورے گروہ کے لئے- اسلام جو امن قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ ابتدا ہی سے نہایت نازک تھا۔ یہ ایک ایسا امن تھا جسے خواہش، یعنی انفرادیت کے مظاہر میں سے وہ جس کے متعلق سب سے کم درجہ تیقن کے ساتھ پیش گوئی کی جاسکتی تھی، کے ہاتھوں ہمیشہ اندر سے خطرہ لاحق رہا۔ گروہ کے سامنے سپراندازی کو عقل (شعور یا استدلال) سے ملا دیا گیا اور ذاتی خواہشات و ترجیحات کی طرف میلان کو غیر عقلی قرار دیا گیا۔(8) اسی باعث ''ہوا'' ایسے جذبات کے مترادف قرار دی گئی جو ذہن کے قابو میں نہیں۔ قبل اسلام کے انتشار کا خطرہ ہمیشہ سر پر معلق رہتا تھا، اس لئے کہ یہ انسانی فطرت میں وراثتاً چلتا ہے۔ ہر انسان میں ایک کارگر ''جاہلی'' سویا ہوتا ہے اور امن فقط ایک متزلزل توازن ہے۔ ''ہوا'' اور اس کی جمع ''اہوا'' دو الفاظ قرآن میں تقریباً تیس جگہ آئے ہیں اور ہر جگہ انہیں ایک مثالی شہر کے منفی قطب کو بیان کرنے کے لئے برتا گیا ہے۔ ''ہوا'' ہی وہ رخنہ اور شگاف ہے جس میں سے نزاع اور انتشار راہ پاتے اور داخل ہوتے ہیں۔

لیکن اسلام کا کمال ____ اور انفرادیت ____ یہی ہے کہ ''ہوا'' کو نہ تو ختم کیا جانا ہے اور نہ ہی بے دخل، بلکہ لازم ٹھہرایا گیا کہ اس کا بندوبست اس طور کیا جائے کہ یہ مقررہ انتہاؤں، یعنی مقدس حدود سے تجاوز نہ کر پائے۔ اسلام کسی بھی چیز کو مسترد نہیں کرتا، یہ ہر چیز کا انتظام کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک توازن مثالی خاکہ ہے، اگر حالات غیر معمولی نہ ہوں تو ہر چیز کو، جو گروہی مفاد کے لئے خطرہ نہیں بنتی ایک خاص حالت توازن کے اندر حرکت میں رہنے کی اجازت ہے۔ انفرادی تجاوز کو بہرحال محدود کرنا ہوگا۔ نگرانی اور تعزیر کے لئے کوئی مستقل مذہبی ادارہ موجود نہیں، اس لئے کہ بنیادی مقصد توازن ہے نہ کہ بندی خانہ۔ مائیں اور اساتذہ ہر مسلم بچے کے ننھے سے ذہن میں جو کلیدی ضرب المثل ہر روز

ڈالتے ہیں اسی طرزِ عمل کو بیان کرتی ہے۔ ''ہر چیز لیکن اعتدال میں۔'' مذہبی نگرانوں کی عدم موجودگی میں یہ فرد کی ذمہ داری ہے کہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور امت کے مفاد کو کبھی ذہن سے محو نہ ہونے دے۔ افراد کو حصولِ مسرت کا حق حاصل ہے لیکن اسے اجتماعیت کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ نوعِ انسان ویرانے میں زندگی بسر نہیں کرتی، اسے اردگرد کے لوگوں کیلئے کسی صدمہ کا باعث نہیں بننا چاہیے۔ خود کو محروم رکھنا بھی مستحسن نہیں لیکن اپنے یا دوسروں کے حقوق کی پاسداری میں غلو کی بجائے اعتدال سے کام لینا چاہیے۔ ان رہنما خطوط پر چلتے ہوئے ''ہوا'' کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے، کیونکہ امت کے انتشار کا شکار ہونے کی صورت میں ابتری اور بدنظمی کی سی صورت پیدا ہو جائے گی۔

سلمان رشدی کے معاملے پر یہ اندازِ نظر بھی ممکنات میں سے ہے کہ امام نے، جو اس معاندانہ رویے کے حامل سیارے پر اسلام کے بیڑے کی سلامتی کی غرض سے عالمگیر توازن پر نگاہ رکھتا ہے، متخیلہ کے یوں پھوٹ کر بہنے کو مہلک حملہ خیال کرتے ہوئے اس کی مذمت کی ہو۔ سلمان رشدی ایک ادیب ہے۔ اس کے تخلیقی سوتے متخیلہ سے پھوٹتے ہیں اور متخیلہ انفرادیت کی وہ پناہ گاہ ہے جو ناقابلِ رسائی ہے۔ یہ کسی فرد کا وہ خفیہ چمن ہے جس پر کسی قدغن یا مفاہمت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ایک فرد کو جھکنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے'' زیرِ اطاعت لایا جا سکتا ہے لیکن اس کے تخیل کو لگام نہیں دی جا سکتی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد مغربی فلسفہ روشن خیالی متعارف کروانے والے ترقی پسند انشوروں کے خلاف ہونے والی کاروائیوں کو دیکھنے کے ممکنہ طریقوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے ازمنہ وسطیٰ میں رائے (ذاتی خیال) اور عقل (شعور) کے مقام پر بحث کی تجویز پیش کرنے والے معتزلہ کے خلاف اعلانِ جنگ کو ایک نئی شکل کے طور پر دیکھا جائے- میں اس فہرست کو پھیلا بھی سکتی ہوں۔ فی الحقیقت پندرہ صدیوں سے تخیل پر الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ یہ اپنی جستجو میں فصیلوں اور حدود، سے باہر نکل جاتا ہے۔ ہمارے عظیم اذہان لندن، پیرس یا نیویارک میں ہوں تو اس عمل سے کوئی خطرہ نہیں۔ ہر طرح کی کج روی کا اصل تخیل ہے ; جب دشمن کے مصنوعی سیارے ہماری حرکات پر نظر رکھے ہوئے ہوں تو انفرادیت میں کھل کھیلنے کی عیاشی نہیں کی جا سکتی۔ اسلام کے مستقبل اور بیسویں صدی میں

اس کی بقاء کا بہت کچھ انحصار اس امر پر ہے کہ رائے کے کردار کا تعین کس طرح کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم ایک بار پھر اس موضوع کی طرف رجوع کریں گے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ امت اپنی سلامتی کی جڑیں سوچ پر پابندی کی بجائے کہیں اور گاڑے۔ ہم تخیل، یعنی غور و فکر اور خوابوں کی آزادی، کو معطل رکھنے کا عمل جاری نہیں رکھ سکتے کیونکہ یہ اختراع کا دور ہے اور اختراع ہی اس الیکٹرانک عہد میں دولت کا سرچشمہ ہے۔ یہی وہ عظیم مسئلہ ہے جس کا مسلمانوں کو سامنا کرنا اور اسے حل کرنا ہے۔ جنونی، غیر متمدن اور جدید علوم سے تقریباً بے بہرہ رہنما ہمیں کوئی حل نہیں دے سکتے۔ انہیں چاہیے کہ وہ اپنے گرد اچھی طرح رحمتہ لپیٹیں اور نہایت انکسار سے فکر و تامل کے وسیلے سے سیکھنے کی کوشش کریں۔ اسلام اپنی اصل میں دو قطبوں کے درمیان ایک متحرک اور نازک توازن ہے۔ ایک قطب منفی (ہوا) اور دوسرا مثبت (صحت) ہے۔ خواہش اور اختیار کے درمیان ایک نہایت نازک تعلق شہر کو رواں دواں رکھتا ہے اور نہ صرف امن و امان بلکہ اس مسرت کی ضمانت بھی دیتا ہے جس سے ہم کسی تعطیل کی شام شاد کام ہوتے ہیں۔ اسلام کی ابتداء میں یہ تصور بہت طاقتور تھا اور ان لوگوں کے اذہان میں آج بھی ہے جو خودغرضی کا شکار اور اپنے مقدر کی بے حسی کے ہاتھوں بے سکت و لاچار ہوکر رہ گئے ہیں۔ اس عمرانی معاہدے کو ذہن میں رکھے بغیر ہمارے لئے یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ حریت فکر، تخلیق اور بہتری سے وابستہ الفاظ کو مذموم قرار دیتے ہوئے ان پر ممانعت کی مہر کیوں لگا دی جاتی ہے۔

تخیل ـــــ ہر نوع کی کج روی کا سرچشمہ

تخیل ـــــ حقیقت سے لاتعلقی اور انقطاع پر مبنی طریق فکر ہے جو فرد کو اس کے داخل میں کھینچ کر گروہی نگرانی سے آزادی عطا کرتا ہے۔ عربی مادہ ''خیال'' سے ایک مشتق لفظ ''خیل'' کا مطلب گھوڑا ہے۔ ''لسان العرب'' کا مصنف ہماری توجہ اس امر کی طرف منعطف کروانا چاہتا ہے کہ گھوڑے کو ''خیل'' کا نام دینے کی وجہ اس کی چال میں پائی جانے والی رعونت ہے۔ اس کی چال سے ایک نوع کی بددماغی ٹپکتی ہے۔ جس شخص کے افعال سے انا پرستی اور نرگسیت ٹپکتی ہو عربی میں اس کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے کہا جاتا ہے، ''یطلیق

العنان'' (وہ باگیں ڈھیلی چھوڑ بیٹھتا ہے)۔ ذہنی صلاحیتوں کا تقابل بیشتر اوقات گھوڑے سے کیا جاتا ہے اور بلاشبہ، عربی گھوڑوں کو اس قبیل کے خوبصورت ترین اور پروقار جانوروں میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ یہ تیز رفتار ہوتے ہیں۔ آزادی کے متعلق ہمارے تصور میں گھوڑوں اور پرندوں کو طاقتور علامتوں کی حیثیت حاصل ہے۔ میں جب کسی عرب ملک میں منعقدہ سرکاری کانفرنس میں شرکت کرتی ہوں تو اکثر اوقات اختتام پر مجھے کسی نہ کسی اعلامیہ پر دستخط کیلئے کہا جاتا ہے۔ جب میں انکار کرتی ہوں تو ان لوگوں میں گھر جاتی ہوں جو دستخط پر قائل کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انہیں مجھ سے محبت ہے اور اسی وجہ سے وہ مجھے میرے مفادات کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن جب میرے منہ سے ''انا طیر حر'' (میں آزاد پرندہ ہوں) کے الفاظ نکلتے ہیں تو یہ سب کوششیں اچانک یوں رک جاتی ہیں گویا کسی نے سحر پھونک دیا ہو۔ لفظ ''حُر'' سیدھا ''جاہلیہ'' سے ہم تک پہنچا ہے جہاں آزاد ترین شخص اشرافیہ میں شمار کیا جاتا تھا یعنی وہ شخص جس کا کوئی مالک نہیں۔ لفظ ''حُر'' کا متضاد ''غلام'' تھا۔

مسلم تہذیب میں ''الحریۃ'' (آزادی) کا مقام و مرتبہ کبھی غیر مبہم نہیں رہا ہے، اسے کبھی طبقہ امراء سے منسوب نہیں پایا گیا اور نہ ہی اسے کبھی مثبت تصور کی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے معانی ہمیشہ ''جاہلیہ'' کے انتشار سے وابستہ کئے جاتے رہے۔ ایف- روز نتھال F.Rosenthal درست طور پر تبصرہ کرتا ہے کہ ''سیاسی طور پر فرد سے توقع نہیں کی جاتی تھی کہ حاکم یا حکومت کے انتخاب میں اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کرے- لیکن کبھی کبھی وہ اپنے حق پر اصرار بھی کرتا تھا- روزنتھال مزید لکھتا ہے کہ صوفیاء کے نزدیک ''حُریہ'' کے معنی خدا کے سامنے سپرانداز ہونے کے تھے۔(10) تاہم خدا اور بندے کے درمیان اس رکاوٹ کو ختم کرنے پر کے لئے صوفیاء کے آزادی کے اس تصور کو خلفاء نے اپنے لئے خطرہ خیال کیا۔ صوفیاء نے انسان کی تعریف اس انداز میں کی کہ اسے تمام حقوق واپس مل گئے۔ تخیل اور ذہن کی آزادی پر عائد پابندی کی جڑیں انفرادیت کے ایک خاص حد سے زیادہ پنپنے کے خوف میں ہیں۔ ایسا معاشرہ جہاں انفرادیت کو تمام تر عدم توازن کا ماخذ خیال کرتے ہوئے اس سے خوف کھایا جائے، ''حریت عامہ'' یعنی عوامی آزادی کو کس نگاہ سے دیکھے گا اور عوامی آزادی (حریت عامہ) ان حقوق میں سے ایک ہے جن کی بات انسانی حقوق کا

عالمی اعلامیہ اٹھاتا ہے۔اگر عرب ریاستوں نے جہدِ آزادی کے دوران کئے گئے وعدوں کا پاس کرتے ہوئے، آزادی کے بعد سے اپنی دستیاب توانائیاں ہمیں آزادی پر غور و فکر کی طرف متوجہ کرنے میں صرف کی ہوتیں تو یقیناً آج ہم ان عوامی آزادیوں کو استعمال کرنے اور اپنے اسلامی ورثے سے ان کا تقابل کرنے کے اہل ہوتے۔ یوں ہمیں ان آزادیوں کے ساتھ آشنا ہونے میں کافی وقت مل جاتا جو آج اقتدار میں معمولی سا حصہ رکھنے والے کو بھی خوفزدہ کرتیں اور اپنی جگہ سے ہلا دیتی ہیں۔ جب بھی کسی نوجوان مرد یا عورت کی طرف سے آزاد ہونے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے، ہر کسی پر ہسٹریا کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آیئے دوبارہ خیال سے رجوع کرتے ہیں: خیال جو پھیلتا ہے تو تخلیقی جذبہ بن جاتا ہے۔ خیال جو اتنا طاقتور ہے کہ افواج لرز جاتی ہیں اور ہر ''چاؤش'' اور اقدار کہن کا محافظ خطرہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

گھوڑا سوار سے زیادہ چالاک ہے

عربی گھوڑوں کے نظارے نے مجھے ہمیشہ مسحور کیا ہے۔ چھریرے اور پھڑکتے ہوئے پٹھوں والے گھوڑے، چمکدار جلد تلے چھلکتی توانائی!

قطع نظر اس کے کہ مابعد نتائج کیا نکلتے ہیں، مجھے اس صفت کے حامل مرد و زن کو دیکھنا اچھا لگتا ہے اور معجزہ یہ ہے کہ جب بھی تلاش کیا انہیں دیکھ پانے میں کامیاب ہوئی- میں اچھے عرب گھڑسواروں کیمداح ہوں۔ میرے نزدیک اچھا گھڑسوار وہ ہے جو بظاہر جانوروں پر غالب ہوتے ہوئے بھی ان سے زیادہ تیزی دکھانے کی کوشش نہ کرے۔ میں رواں دواں شہری ماحول میں رنگی ایسی جگہ پیدا ہوئی جس کی آٹھویں صدی تک کی تاریخ مجھے معلوم ہے۔گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ روزمرہ کی اشیاء کی بار برداری گدھوں پر ہوتی ہے۔ بیس برس کی عمر تک ان گلیوں کے سنگی فرش پر میں ان سست لیکن تقریباً مانوس گدھوں کے پہلو بہ پہلو چلتی رہی۔(12) تہواروں پر مجھے شہر کے نواحی علاقوں میں کسانوں کے کھیل دیکھنے لے جایا جاتا جن میں بڑی محنت سے سجائے اور سدھائے گھوڑے ہوتے۔ میری نظر تحسین ہمیشہ سوار کی بجائے جانور پر ہوتی۔ مجھے اور دوسری بچیوں کو جو چیز سب سے زیادہ حیران کرتی وہ گھوڑوں کا ناقابل اعتماد رویہ تھا۔ہمیں سب سے زیادہ مسرت اس لمحے ہوتی جب جانور اپنے سوار کو

گرا پھینکتا۔ اپنے بچپن کے ان مناظر پر سوچتے ہوئے مجھے خیال گزرتا ہے کہ ہر کسی اور خصوصاً بچوں کی ہمدردیاں سوار کی بجائے جانور کے ساتھ ہوتیں۔ چالیس برس کی عمر میں مجھے وہ عربی کہاوت سننے کا پہلی بار اتفاق ہوا جو سوائے میرے سب کے علم میں تھی۔ ''الخیل اعلم من فرسانہا'' (گھوڑے اپنے سواروں سے زیادہ چالاک ہوتے ہیں۔''

یقیناً عربوں سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ ریس کے گھوڑے پر حاوی ہونے کی کوشش مضحکہ خیز ہے اور اس عمل کی توسیع کرتے ہوئے اسے انسانی ذہن کی غیر معمولی آزادی پر بھی منطبق کر لیں۔ اس طریقہ کار کو دیکھ لیں جو وہ ہمیں تعلیم دینے میں استعمال کرتے ہیں۔آپ کو ہماری سرکشی اور ان کا جبر نظر آ جائے گا اور یہاں استاد شاگرد تعلق اسی نوعیت کا ہے۔ کسی زیادہ فکر و تامل کے بغیر کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ انسانی ذہن قدرتی طور پر سرکش ہوتا ہے۔ یعنی وہ ہٹ دھرمی کی حد تک آزاد و خودمختار ہے اور تمام بیرونی اثرات کی مزاحمت کرتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو للاّ فقیہہ مجھ پر اتنی کڑی نظر کیوں رکھتی تھی اور مجھے مارنے میں اتنے بغض کا اظہار کیوں کرتی تھی! اسے پتہ تھا کہ اس کا اختیار محض یوٹو پیائی ہے۔

قرآن میں غرور کی مذمت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ مغرور اور بڑھ چڑھ کر باتیں بنانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ (سورہ 4، آیت 36)۔ خیال اور اختیال (یعنی تکبر) کا لسانی ماخذ ایک ہی ہے۔ ہمارے لوگوں کے نزدیک معاشرے کے لئے قوت متخیلہ خطرناک ہے، کیونکہ یہی وہ قوت ہے جو شبیہ کے خیال میں آنے اور پھر وجود میں لانے میں کارگر ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں متخیلہ ایک اور طرح کی حقیقت کو پیدا کرنا ہے۔ ''لسان العرب'' کے مطابق کسی چیز کا تصور کرنا دراصل اس کی شبیہ بنانا ہے۔'' اور شبیہ سازی پر سختی سے پابندی عائد کر دی گئی تھی کیونکہ اہل عرب کے ہاں جو شبیہیں بنائی جاتی تھیں، زیادہ تر بتوں کی تھیں۔ عرب زیادہ تر اپنے ذاتی یا اپنے قبیلے کے بتوں کی نقول تیار کرتے تھے۔ اور بیشتر اوقات یہ قبیلے چند خاندانوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ یہ سوچنا غلط ہوگا کہ وہ قبائلی اپنے دیوتا کے حضور کچھ بہت زیادہ اطاعت گزاری یا سپراندازی کا اظہار کرتے تھے، کیونکہ دیوتا سے منسوب کوئی توقع پوری نہ ہونے کی صورت میں اسے آسانی سے مسترد بھی کر دیا جاتا تھا۔

MashalBooks.org

شبیہوں اور مورتیوں پر پابندی

عربی میں تصویر یا شبیہ کے لئے لفظ الصورۃ استعمال ہوتا ہے۔ آج ہم فوٹوگرافر کے لئے فقط ایک لفظ مصور استعمال کرتے ہیں۔ مسلم ممالک میں ہر کسی نے محسوس کیا ہوگا کہ سرکاری عمارتوں کے قریب کیمرہ لئے گھومنا پولیس اور دوسرے محافظوں کے لئے خفگی کا باعث بنتا ہے۔ لیکن میرا موضوع اس فوٹوگرافی پر عائد پابندی نہیں جو دنیا میں ہر جگہ تمام عجائب گھروں میں نافذ ہے۔ مجھے اس زائد از معمول جارحیت پر بات کرنا ہے جس کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوسکتا ہے جو کیمرہ کبھی لئے عرب شہروں میں گھوما ہے۔ خبر نہیں فوٹوگرافر عرب ممالک میں اپنی روزی کس طرح کماتے ہیں، کیونکہ میں نے تو جب بھی کسی درخت یا دروازے کی تصویر لینے کی کوشش کی ہے، میرے لئے کوئی اچھا شگون ثابت نہیں ہوا۔

1987ء میں ایک نوجوان مصری میرے پیچھے پڑ گیا کہ وہ مجھے ابوالہول کی تصویر نہیں لینے دے گا۔ میں اسے اپنا کیمرہ تھما کر کسی حد تک ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہوئی.....اسی طرح جیسے کسی غصیلے بچے کو رام کیا جاتا ہے، لیکن میں نے خاصی سُبکی اور بیزاری محسوس کی، میرا وقت الگ سے برباد ہوا تھا۔ میں نے مدہم سے لہجے میں استفسار کیا کہ میں نے ایسا کونسا کائنات کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ پھر میں نے روتے ہوئے کہا کہ وہ میرے ساتھ محض اس لئے زبردستی کر رہا ہے کہ میں کمزور ہوں۔ اس ظالم نے میرا کیمرہ فوراً واپس کر دیا اور منمنایا ''پتہ نہیں۔'' تاہم اسے خبر ہونی چاہیے تھی کہ نویں صدی میں احادیث کے مجموعے ''الصحیح'' مدون کرنے والے امام بخاریؒ کے مطابق ''روز حساب مصوروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت ترین عذاب کا سامنا ہوگا۔''(13) کہا جاتا تھا کہ جس گھر میں تصویر یا کتا ہوگا، وہاں فرشتہ داخل نہیں ہوگا..... اور تصویر سے مراد کسی بھی قدرتی جسم کی نمائندگی کرنے والی شئے ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ مورتی پوجا کی شروعات اسی طرح ہوئی تھیں۔ انسان نے شبیہیں تراشیں اور پھر انہیں پوجنے لگا۔

ایک داستان کے مطابق عربوں کے اجداد میں سے ایک شخص لوحیٔ نے ''پہلے پہل کعبہ میں بت پرستی کو متعارف کروایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے شام میں دوران سفر لوگوں کو مختلف اجسام و اشیاء کی پرستش کرتے دیکھا اور پوچھنے لگا کہ ''یہ کیا ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا کہ

وہ انہیں آسمان سے بارش اور دشمن پر غلبے کی دعا مانگنے کے لئے استعمال کرتے ہیں؛ اس نے ان سے کچھ اجسام مانگے" انہیں لے کر مکہ لوٹ آیا اور کعبہ کے گرد رکھ دیا۔(14) انسان کی شبیہ سازی پر ہمیشہ کے لئے عائد کی جانے والی پابندی مسلم لاشعور میں عہد حاضر میں ابھرنے والی دو عظیم ترین چیزوں کے درمیان ایک تعلق کو جنم دیتی ہے۔ ابلاغیات کے اس جدید عہد کی یہ دو چیزیں شبیہ اور انفرادیت ہیں۔ تخلیق، تخیل اور انفرادیت..... یہ سب ایک ہی داستانوی اور پرخطر دشمن کے مختلف چہرے ہیں۔ یہ سب خوابوں اور آئینوں کی طرح ہیں۔ ''لسان العرب'' میں ابن منظور ہمیں جتاتا ہے کہ ''خیال'' ''شبیہ ہیں جو بظاہر موجود نظر آئیں خواہ ہم حالت خواب میں ہوں یا بیداری میں اور یہی وجہ ہے کہ آئینے میں نظر آنے والی شبیہ خیالی کہلاتی ہے اور دھوپ میں بننے والا ہمارا سایہ بھی۔ خلقہ اور بدعہ جیسے الفاظ، جن کا مطلب پیدا کرنا ہے، خطرناک قرار دیئے گئے اور ان پر ممانعت کی مہر لگا دی گئی۔ ہر طرح کی اختراع اشیاء کے نظام ترتیب میں نقص ڈالنے اور اس سے تجاوز کرنے کے مترادف ہے۔ ابن منظور ہمیں بتاتا ہے کہ درحقیقت، اگر خلق کا تعلق انسانی صورت سے ہو تو یہ ایک اور لفظ کذبہ (15) کا مترادف ٹھہرتا ہے جس کا مطلب جھوٹ بولنا ہے۔

تین الفاظ، جنہیں آج بھی دین کے محافظ ہم پر ہتھیاروں کی طرح چلاتے ہیں، کافر، ملحد اور زندیق کا مطلب ایک ہی ہے یعنی راہ راست سے انحراف۔ ہر دوسری مطلق العنانی کی طرح مذہبی جنون کا بھی ایک پہلو جبر و تشدد کا ہے۔ اس کے الفاظ بالکل گلوٹین کی طرح عمل کرتے ہیں۔ وہ شخص جو بنام خدا بیان کرتا ہے، کسی کو ملحد یا کافر قرار دے دے تو ملزم سزا کا نہایت جائز ہدف ٹھہرتا ہے۔ چونکہ تخلیق اور اختراع گروہ سے انحراف کے معانی رکھتے ہیں، چنانچہ ہر لفظ کو استعمال کرنے سے پہلے اچھی طرح تول لینا چاہیے۔

اس امر کا بیان خاصا تردد انگیز ہے کہ لفظ ''کافر'' اپنے معنی میں فکر کا تقریباً معکوس ہے۔ دونوں الفاظ کے حروف علت کا مصدر ایک ہی ہے اور ان کی ترتیب نو انہیں اتنی سہولت سے ایک دوسرے میں بدل دیتی ہے کہ حالت خواب یا زبان کی لڑکھڑاہٹ تک سے یہ وقوعہ سرزد ہو سکتا ہے۔ وہ شخص کافر ہے جو حاصل شدہ فوائد کو چھپاتا یا ان کے آثار معدوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لسان العرب کی رو سے کافر وہ ناشکرا ہے جو اس امر کو تسلیم

نہیں کرتا کہ خدا نے اسے راہ راست دکھائی ہے۔ لفظ زندیق فارسی سے لیا گیا ہے اور اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اگلی دنیا اور خدا کے واحد ہونے پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ ایسا شخص ہے'' جو اپنے لئے اشیاء کو نہایت محدود کر لیتا ہے اس لئے کہ وہ خود کو ابدیت سے محروم کرتا ہے۔'' (16) عکسی اثر کے طور پر دیکھا جائے تو یہ تینوں الفاظ شیطنیت کے بلیک ہول میں ایک دوسرے کو منعکس کرتے ہیں۔ ''ملحد'' اور ''کافر'' کے مترادف ''زندیق'' کا مطلب وہ شخص ہے جو شیطان کے زیر اثر چلا گیا اور شیطان جیسا کہ ہم جانتے ہیں اپنی چالیں ''ہوا، یعنی خواہش اور جذبات کی زمین پر چلتا ہے' جو چیز بھی شیطان سے حفاظت کرنے والی حدود کے اندر خود کو مقید اور معذور و لاچار محسوس کرے' شیطانی ہے۔

تعوذ' جس کا ورد ہم دن میں (کم از کم) دس بار کرتے ہیں' کی تفسیر کرتے ہوئے امام ابن کثیر شیطان کی تعریفوں میں سے ایک پر لکھتے ہیں: ''عربی زبان کے لفظ شیطان کا ایک مصدر ''شطنہ'' سے مشتق ہے جس کا مطلب معمول کے انسانی رویے سے انحراف ہے جس کا مقصد کسی ایک دوسرے طریقہ سے عام لوگوں کی صف سے نکل کر نمایاں ہونا ہو۔'' شیطان کی یہ تعریف بہت اہم ہے کیونکہ یہ ہمیں اصل عمرانی معاہدے کی شرائط اور بغاوت کے معنی یاد دلاتی ہے۔ ''شیطان باغی ہے خواہ وہ انسانوں مں ہو' جنوں یا حیوانوں میں ہو۔ ہر کوئی جو بغاوت کرتا ہے شیطان ہے۔ شیطان کو یہ نام ہی اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ تخریبی (متمرد) ہے اور اس کی تخریب اسی امر میں پنہاں ہے کہ اپنے رویے اور افعال میں سب کے لئے مشترکہ طرز عمل یعنی وہ رویہ جو راستی کی طرف لے جاتا ہے' ترک کر دیتا ہے۔

فلاح عام اور انفرادی فکر کا باہمی تعلق اور عوامی مفاد اور فرد کی صلاحیتوں کے نکھار کا مسئلہ لازماً غور و فکر اور عالمی بحث کا نقطہ ماسکہ ہونا چاہیے اور یہ کام مسلمانوں کے کئے جانے کا منتظر ہے۔ آٹھویں صدی ہجری میں یہی مسئلہ مکہ میں بھی سامنے آیا تھا کہ آیا عوامی مفاد (امن) ہے یا انفرادی مفادات (اہوا)؛ لیکن اگر آج ہمیں اس انتخابی کشمکش کا سامنا کرنا پڑے تو جواب تلاش کرنے کے لئے استعمال میں آنے والے معیارات اور حرکیات یقیناً اس وقت سے مختلف ہوں گی۔ اسی وجہ سے تجزیے کے نتیجے میں سامنے آنے والا حل بھی یقیناً آٹھویں صدی ہجری کا سا نہیں ہوگا۔ اقتصادی اور تمدنی ترقی کی شرائط ایسی ہیں کہ ہمیں اب اپنی تقطیع کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر عرب پارلیمنٹیں فعال ہو جاتیں اور لوگ جمہوری

انداز میں شاہراہوں کی تعمیر، سکولوں کے قیام اور ذرائع روزگار کی فراہمی میں شریک کار کیئجاتے تو آزادی کے متعلق ہمارا انداز فکر اپنے دور جاہلیہ کے اجداد سے مختلف رہا ہوتا۔

اسلام میں عمرانی معاہدہ: میثاق قریش

حضرت محمد ﷺ پیدائش مکی اور قبیلہ قریش کے فرد تھے۔ قریش عرب کے طاقتور ترین قبیلوں میں شمار ہوتے تھے اور اسی وجہ سے انہیں کثیر خدائی کے حامل شہر مکہ میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ حضرت محمد ﷺ کی طرف سے خدائے واحد کا پیغام لوگوں کو نہایت عجیب لگا۔ حضرت محمد ﷺ فکری یکجائی لانا چاہتے تھے اور یہی چیز آپ ﷺ کے معاصرین کے حیطہ ادراک سے باہر تھی۔ قرآن ان کی اس عدم اہلیت کا شاہد ہے۔ سورۃ اڑتیس کی چھٹی آیت میں ان کی حیرت کا ذکر ملتا ہے جو انہیں دیوتاؤں کو ایک خدا سے بدل لینے کی دعوت پر ہوئی تھی۔ ایسا نہیں کہ قریش کے معززین آپؐ سے غیر متفق تھے- دراصل آغاز میں تو وہ سمجھ ہی نہ پائے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ''کیا محمد ﷺ تمام معبودوں کی تکسیر معبود واحد میں کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ ہم سب کو ایک سی مناجات اور دعائیں پڑھتے سننا چاہتے ہیں؟ (حالانکہ) انہیں اچھی طرح علم ہے کہ ہم سب کا اپنا اپنا معبود ہے۔''(18) ان کے نزدیک تمام عقائد کی ایک عقیدے میں تکسیر کی کوششوں کا کچھ نہ کچھ تعلق ساحری سے ضرور تھا۔ سورہ اڑتیس ہی کی چوتھی آیت میں انہیں ساحر خیال کیا جانا مذکور ہے۔

630ء کے عربوں کے نزدیک فکری تنوع اور آزادی پر قدغن صرف مکہ میں موجود تین سو ساٹھ دیوتاؤں کی ہی نہیں بلکہ ان لاکھوں نہ سہی، ہزاروں چھوٹے چھوٹے معبودوں کی تباہی کے مترادف تھی جنہیں لوگ ہر روز اپنے اپنے گھروں میں اور صحرا کے مسافر دوران سفر بناتے تھے۔ بتوں کی ایک رنگا رنگ اور بھرپور صنعت موجود تھی۔ ہر قبیلہ، شہر اور گروہ اپنے بت کا مرتبہ اپنی دولت کے مطابق متعین کرتا۔ ''اگر بت افسانی شکل پر اور لکڑی سے تراشا یا چاندی میں ڈھالا گیا ہوتا تو صنم کہلاتا۔ اس کے برعکس پتھر سے تراشا گیا بت وثن(watan) کہلاتا تھا۔''(19)

لکڑی سے تراشے گئے بت ''اُمراء اور اہل ثروت کی ملکیت ہوتے تھے، کیوں کہ یہ درآمد کئے جاتے تھے۔''(20) اجتماعی عبادت گاہوں یا دوسرے عوامی مقامات پر رکھے گئے

بت گروہی کوششوں کا مظہر سمجھ جاتے تھے۔ گھروں میں عبادت کے لئے ان کی سستی نقلیں مقامی دستکار تیار کرتے تھے۔ گھریلو زندگی کے حریت فکر پر مبنی ہونے کے تصور کو مٹائے بغیر اس کثرت معبودیت کو کسی ایک معبود میں کیسے مجتمع کیا جا سکتا ہے' لیکن حضرت محمد ﷺ کی کثرت کو وحدت میں تبدیل کرنے کی تجویز کو سحر پر محمول کرنا اس حقیقت کو نظرانداز کرنے کے مترادف تھا کہ ایک پیغمبر کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔

اسلام دنیا میں ناممکن کو وجود میں لانے کے لئے آیا۔ یہ حقیقت اس کے مرکزی تصورات میں سے ایک اور اس کی عالمگیر کامیابی کے عوامل میں ہویدا ہے۔ کوئی دنیاوی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا جسے حل نہ کیا جا سکے۔ اسلام کے مزاج میں شامل نتائجیت کا عنصر مذکورہ بالا حقیقت ہی کی ایک شکل ہے اور یہی وجہ ہے اسلام سیاست سے لاتعلق نہیں رہ سکتا اور اس طرح کی علیحدگی کی کوئی بھی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ اسلام' ہندومت یا بعض دوسرے مذاہب کے برعکس' اپنے علمبرداروں کے مراقبہ میں ڈوب جانے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ روحانیت کے متلاشی مثلاً صوفیاء کو بھی اپنا ایک پاؤں مضبوطی سے مادی حقائق کی ٹھوس زمین پر جمائے رکھنا ہونگے۔ بصورت دیگر انہیں معتبر نہیں گردانا جائے گا اور خصوصاً جب ان کا اصل ہدف شہر کے مسائل حل کرنا ہو' خواہ وہ مسائل کتنے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں' انہیں ارضی حقائق کو لازماً پیش نظر رکھنا ہوگا۔

اپنے سال تبلغ یعنی 613ء سے فتح مکہ کے سال یعنی 630ء تک' آپؐ نے سترہ برس اس نظریے پر زور دیا اور' یوں' دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیں تباہ کرتے ہوئے عربوں کو ''الواحد'' کے گرد متحد کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ کارنامہ اگر معجزہ نہیں تو ششدر کن ضرور ہے۔ اس لئے کہ ابتداء میں کوئی اس خیال سے متفق نہیں تھا کہ امن کے لئے کعبہ کی کی یہ عظیم تطہیر ضروری ہے۔ دراصل کسی کو ادراک نہیں تھا کہ کثیر خدائی اور بدامنی کے درمیان کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔ اہل قریش کی مجلس کے نزدیک معاملہ بہت سیدھا تھا کہ حضرت محمد ﷺ بھی اپنا خدا کعبہ میں لے جا رکھیں اور دوسرں کو ان کی راہ پر چلنے سے نہ روکیں۔ ابوطالب حضرت محمد ﷺ کے سرپرست اور انہیں مشورہ دینے کی اہلیت کے حامل واحد شخص تھے- ان کے گھر ہونے والی تاریخی اہمیت کی حامل مجلس میں اہل قریش کے وفد نے تجویز پیش کی کہ ''محمد ﷺ ہمارے دیوتاؤں کی مذمت ترک کر دیں'' اور ''ہم انہیں ان کے خدا

کے ساتھ (ان کے حال پر) چھوڑ دیں گے۔'' ابوطالب جو بذات خود شہر کے داناؤں میں شمار کئے جاتے تھے' حضرت محمد ﷺ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت غیر مبہم انداز میں کہنے لگے'' میرے بھائی کے بیٹے یہ وفد ہم دونوں کے قبیلے کے بزرگ ترین افراد پر مشتمل ہے۔ وہ اپنے اس مطالبے کی رو سے انصاف طلبی کر رہے ہیں کہ تم ان کے دیوتاؤں کی مذمت ترک کر دو اور اس کے بدلے میں' وہ تمہیں پورے امن سے تمہارے خدا کی عبادت کرنے دیں گے۔'' (21) وفد کے ارکان بڑی بے تابی سے پیمبرؐ کے جواب کے منتظر تھے۔ آپؐ کا ردعمل یہ تھا کہ وہ شرکائے مجلس سے صرف اس امر کے خواہاں ہیں کہ وہ ایک فقرہ ادا کر دیں' صرف ایک فقرہ جس کے بعد وہ ان سے واسطہ نہیں رکھیں گے' اس لئے کہ وہ فقرہ انہیں تمام عرب کو زیر کرنے اور عجم پر ملکیت حاصل کرنے کا اہل کر دے گا۔'' وفد کے ارکان' جواب قدرے پرسکون ہوگئے تھے' بیتابانہ پوچھنے لگے' لیکن وہ فقرہ کیا ہے؟ تم چاہو تو ہم وہ فقرہ دہرانے کو تیار ہیں'' وہ مفاہمانہ فضا ہموار کرنے کو بے تاب تھے۔ پیغمبرؐ نے انہیں بتایا۔ انہیں فقط اتنا کرنا ہے کہ وہ شہادت پڑھ لیں' یعنی کہ وہ فقرہ جو مسلمان ہونے کا پہلا عمل ہے: ''کہو! ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' ظاہر ہے کہ انہوں نے انکار کر دیا اور کہنے لگے:''کسی بھی اور چیز کی خواہش ہو تو کہو لیکن یہ نہیں۔''

اس پر آپؐ نے وہ الفاظ کہے جنہیں ہم آج بھی اس وقت استعمال کرتے ہیں جب ہماری مراد یہ ہو کہ کسی بھی قیمت پر مفاہمت ممکن نہیں۔

''اگر تم سورج پکڑ کر قابو کرنے اور لا کر میری ہتھیلی پر رکھنے میں بھی کامیاب ہو جاؤ تو میں پھر بھی اپنا ارادہ نہیں بدلوں گا۔ تمہارے پاس سوائے کلمہ پڑھ لینے کے کوئی دوسرا رستہ نہیں۔'' (2) نتیجتاً شہر اس واقعہ کے بعد دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس اختلاف رائے کو بیان کرنے کے لئے قرآن کے لفظ ''شقاق'' کو مسلمہ حیثیت حاصل ہے۔ یہ شگاف گروہ اور آسمان دونوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اسلام دوسرے کو ملعون ٹھہراتا ہے ۔ لفظ شقاق اڑتیسویں سورت کے آغاز میں آتا ہے جہاں اہل قریش کی مجلس کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کی ابتدائی گفت وشنید کو بیان کیا گیا ہے۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ محمد ﷺ خدائے واحد سے متعلق کسی مفاہمت پر آمادہ نہیں تو ان کے پاس آپ کو شہر بدر کرنے کے فیصلے کے سوا اور کوئی حل نہ بچا۔

اس واقعہ کے بعد خدائے واحد کی مخالفت پر ہمیشہ کے لئے منفیت کا رنگ چڑھ گیا۔ آج بھی واحد کی مخالفت کے لئے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں' وہ تفرقہ کا رنگ لیے ہوئے ہیں- عرب ممالک میں اس کی مثال حزب اور شیعہ ہیں جو بالترتیب ''جماعت'' اور مختلف رائے کے حامل گروہ کے لئے برتے جاتے ہیں' جن کی جڑیں مذکورہ بالا واقعہ کے عہد میں ہیں۔ ان الفاظ کو دراڑ' شگاف' خلیج یعنی شقاق (ناقابل علاج گھاؤ) کے معنوں میں برتا جا سکتا ہے۔ جدید.....یعنی مغربی..... دور کی عرب دنیا میں لفظ ''حزب'' سیاسی جماعت کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن اپنی اصل میں یہ جنود الکفار' (کافروں کے لشکر) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس سے مراد وہ اہل قریش ہیں جنہوں نے حضرت محمد ﷺ کے خلاف سازشیں کیں اور ان کے خلاف لشکر بندی کی۔ اور یہ وہ تھے جن کی ہمدردیاں اور وفاداریاں معبودوں کی کثرت اور فکری آزادی کے ساتھ تھیں۔ ''شیعہ'' ایک اور تصور ہے اور اس سے مراد ''وہ ہیں جو چیزوں کو مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔'' قرآن میں ان کی مذمت کرتے ہوئے قرار دیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں' ''جو اپنے مذہب میں رخنہ اندازی کرتے اور فرقے بن جاتے ہیں۔(23) یہاں اصطلاح شیعہ' یہودی اور عیسائی ''فرقوں'' کے لئے برتی گئی ہے' کیونکہ اسلام اہل الکتاب کو ایسا ہی خیال کرتا ہے۔

آغاز میں سب لوگ راستی پر تھے۔ پھر کچھ لوگ بھٹک گئے اور پھر اصل اسلام انہی بھٹکے ہوئے اور الگ ہو جانے والے لوگوں یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے پیدا کیا گیا۔ خدا کے آخری پیغامبر حضرت محمد ﷺ اسی تقسیم کو ختم کرنے اور لوگوں کو اصل یعنی اسلام میں واپس لانے کے لئے بھیجے گئے۔ حضرت محمد ﷺ سے پہلے اور بعد میں بھی متفق علیہ کو چیلنج کرنا انحراف قرار دیا گیا۔ اگرچہ مغرب اکثر و بیشتر اس امر کو نظرانداز کر دیتا ہے لیکن اسلام اپنی جڑیں یہودی' مسیحی روایات میں ہی قرار دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک دونوں مذاہب نے اپنی روحانی میراث برقرار رکھی لیکن ساتھ ہی اسلام انہیں ایسے فرقے قرار دیتے ہوئے مذموم ٹھہراتا ہے جو اصل سے منحرف ہوگئے۔ اگر افترا نے سر نہ اٹھایا ہوتا تو تینوں ''اہل الکتاب'' شمار کئے جانے والے، جنہیں وحی الٰہی سے سرفراز کیا گیا، اچھے بھائی چارے سے استفادہ کرتے۔

اسلام کا شیعہ اور سنی میں بٹ جانا بھی اس امر کا تاریخی ثبوت ہے کہ رائے کے

اختلاف کو گروہ کا کمزور ہو جانا خیال کیا جاتا ہے۔ ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ اگر اختلاف رکھنے والا گروہ مناسب طور پر طاقتور ہے تو اسے اصل سے الگ کر دینا چاہیے کہ وہ اپنی راہ خود اختیار کرے۔ مخالفت کو تباہ کن خیال کیا جاتا ہے۔ یہ اختلاف ''واحد'' کی فتح سے پہلے مکہ میں ہونے والے جبر و تشدد اور انتشار کی یاد دلاتا ہے اسی لئے یہ خوفزدہ کرتا ہے۔ حاکم اور محکوم مسلمانوں کے لئے اس مسئلے کو بذریعہ بحث مباحثہ حل کرنے اور عقل اور رائے کو اس کا مقام دینے کے امکان کو، جسے معتزلہ اور اہل فلاسفہ نے بھی تجویز کیا تھا' ازمنہ وسطیٰ میں متشددانہ طور پر کچل دیا گیا اور انیسویں صدی تک موقوف معطل رکھا گیا۔ جب نو آبادتی افواج کی زیرنگرانی پارلیمانی جمہوریت متعارف کروائی گئی تو قوم پرستوں نے ایک بار پھر اس بحث کو زندہ کر دیا اور، جیسا کہ ہمیں علم ہے' کمیونٹی کے داخلی قضیوں پر بحث کے اس موقع کو بھی مسترد کر دیا گیا۔ نوآزاد اقوام نے اتحاد کی ناگزیر ضرورت کو بطور ڈھال استعمال کرتے ہوئے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی حزب اختلاف کے خلاف محاذ کھول دیا۔ ان کے رہنما قید کر دیئے گئے اور ان کے دانشوروں کو آزادی اظہار سے محروم رکھا گیا۔ اکیسویں صدی کے دروازے پر کھڑی عرب دنیا اقتصادی بدنظمی کا شکار ہے' جس کی بڑی وجہ غیر جمہوری انتظامات ہیں۔ اس بدنظمی کے تجزیے کا ایک ہی طریقہ ہمارے پاس موجود ہے کہ ہم اس صورت حال کا تجزیہ ان مقدس اصطلاحات کو استعمال کرتے ہوئے کریں جنہیں فرد اور کثرت آراء کے خلاف بھاری بوجھ تلے دبا دیا گیا ہے۔ چونکہ اسلامی تاریخ میں واحد کے گرد مجتمع کرنے کے عمل نے ہمیشہ شاندار نتائج کے حصول کو یقین بنایا ہے اس لئے جدید سیاست کی زبان کے طور پر تقدس کی اجارہ داری ہمیشہ سے کہیں زیادہ مسحور کن ہے۔ ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پیغمبرؐ نے کھلے عام تبلیغ کا آغاز 613ء سے پہلے نہیں کیا۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس سے زیادہ تھی۔ چنانچہ شہر میں نظم وضبط کی ذمہ دار قریش کونسل کے ساتھ تنازعات اسی دور میں اٹھے ہوں گے۔ تاہم شہر کے معززین نے' جو اس کی سلامتی کے ذمہ دار تھے' کہیں 622 میں انہیں شہر بدر کرنے یا غالباً ان کے پیغام کو خاموش کرنے کا فیصلہ کیا۔ 622ء وہ سال ہے جب حضرت محمدؐ اور مکی منتظمین کے مابین تعلقات ناقابل اصلاح حد تک بگڑ گئے۔ حضرت محمدؐ نے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ وہ مدینہ روانہ ضرور ہوئے لیکن وہاں رہنے کے لئے نہیں۔ مسلم اجتماعی یادداشت میں ہجرت حتمی نقل مکانی نہیں ہے بلکہ یہ

واپس لوٹنے کے سفر کا پہلا قدم ہے- حضرت محمدؐ بھی مکہ واپس آنے کے لئے مدینہ گئے جہاں سے وہ بطور فاتح مکہ آئے تاکہ کثرت کی تکسیر واحد میں کریں-(24)

مسلم کیلنڈر622ء سے شروع ہوتا ہے یعنی اس سال سے جب کثیر خدائی اور وحدانیت کے درمیان فیصلہ کن فرق پیدا ہوگیا- پیغمبر اسلام کا معجزہ نما کارنامہ یہی ہے کہ وہ اپنی حیات میں ثابت کرنے میں کامیاب رہے کہ ان کا خاکہ یا نمونہ موثر ہے-630ء میں انہوں نے مکہ فتح کیا اور تمام عربوں کے نزدیک مقدس ترین معبد کعبہ میں داخل ہوگئے-632ء میں ان کے وصال مبارک تک تقریباً تمام عرب متحد ہو چکا تھا- کامیابیوں اور فتوحات کے مرغولے نے حرکت پکڑ لی تھی-632 میں رومی سلطنت کو شام میں ان کی پہلی شکست ہوئی-637ء میں قادسیہ کے مقام پر فارس کی افواج کو کچل دیا گیا- ایران کے ساتھ جنگ کے دوران اور جنگ خلیج میں ریڈیو بغداد اور عراقی پریس بار بار اس جنگ کا حوالہ دیتے رہے- یروشلم، قبرص اور پرسیپواس پر بالترتیب638ء،649ء اور50-649ء میں قبضہ ہوا-655 میں مسلم بحری بیڑے نے اناطولیہ کے جنوب میں رومی بیڑے پر حملہ کر دیا اور اس کا کمانڈر، رومی شہنشاہ بمشکل بھاگ کر اپنی جان بچا پایا-

اسلام اور شرک کے درمیان جنگ ایک شہر کے لیے نہیں تھی-

یہ ایک کونیاتی لڑائی تھی جس کا مقصد جنت حاصل کرنا اور زماں کو ہاتھ میں لینا تھا- فوجی دستوں کی نقل وحمل، مقدس سرزمین میں غیر ملکی افواج کی دراندازی نے آٹھویں ہجری یعنی مکہ کی فتح کے سال کی یاد تازہ کردی تھی- مسلم لاشعور کی گہرائیاں کپکپاہٹ کا شکار ہوگئیں- بھولی جبلتیں سطح پر ابھر آئیں اور ان سے وابستہ علامتی واقعات پھر سے زندہ ہوگئے- امریکی فوجی دستوں کی مقدس سرزمین پر تعیناتی اپنے اثرات میں یلغار سے مختلف نہیں تھی- آج بھی مقدس سرزمین کا نفسیاتی مرکز مکہ اور اس کی فضائیں ہیں- نئے دارالحکومت ریاض کی ویسی علامتی حیثیت نہیں ہے-

امریکی صدر نے جنگ خلیج کے دوران جو زبان استعمال کی اسے جابجا ''خدا امریکہ پر رحم کرے'' (God Bless America) کے چھینٹے دے کر تقدیس کا رنگ دیا گیا تھا- یوں بہت سے لوگوں کو شدید غلط فہمی ہوگئی- انہیں تاثر ملا گویا سٹیلائٹ بجائے خود روحانیت کی تجسیم ہیں- لگتا تھا یہ مذہبی جنگ ہے جس میں ایک عالمی سازش کے ذریعے ایک دوسرے مذہب

کو اسلام پر غالب کیا جا رہا ہے' وہ دوسرا مذہب جو متکبر اور سرمایہ دار امریکہ کا ہے- صدر مسٹر بش کے ''خدا'' کے ساتھ ساتھ لفظ ''آزادی'' کے استعمال نے بھی اس تاثر کو زائل نہ کیا- خاصے تیقنسے کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر بش کے بار بار ''خدا امریکہ پر رحم کرے'' دہرانے سے بھی مسلمان اتنے ہی سراسیمہ ہوئے جتنے بغداد پر بمباری سے ہوئے تھے- جنوری 1991 کے سٹیٹ آف یونین کے مشہور پیغام کا اختتام صدر نے ان الفاظ پر کیا تھا، ''آج رات، جبکہ ہماری افواج میدان جنگ میں ہیں' ہم انہیں اوران کے خاندانوں کو اپنی دعاؤں میں یاد کرتے ہیں- خدا ان میں سے ہر ایک کی حفاظت کرے اور خلیج میں موجود ہماری حلیف افواج کی بھی-''

لوگ بڑی حیرت سے سوال کرتے تھے، ''لیکن وہ کون سے خدا کی بات کر رہا ہے؟'' شہروں کی گلیاں گنگ ہوگئیں- امریکہ جسے لوگ مکمل مادہ پرست خیال کرتے تھے، اپنے خدا کے لیے لڑ رہا تھا- عام لوگ تو اس تقریر کا مدعا ہی نہیں سمجھ پائے جسے ذرائع ابلاغ کی مدد سے پوری دنیا میں پھیلایا گیا اور جس میں امریکی صدر نے وضاحت کی تھی کہ جنگ کا مقصد دراصل جمہوریت اور آزادی کی حفاظت ہے- ''اب تغیر کی ہوائیں ہمارے ساتھ ہیں- آزادی کی قوتیں متحد ہیں- ہم اگلی صدی میں داخل ہونے کو ہیں اور پہلے کسی بھی دور کی نسبت زیادہ پر اعتماد ہیں کہ ہم اندرون اور بیرون ملک وہ کچھ کرنے کا عزم صمیم رکھتے ہیں جو ہمیں لازماً کرنا ہے یعنی آزادی کے لیے محنت-'' لوگوں کا ابہام دوگنا ہوگیا' ''کیا جمہوریت کوئی مذہب ہے-'' جس عمارت میں میری رہائش ہے اس کے دربان نے اگلے دن یہی سوال پوچھا تھا-

امریکی صدر کے بیان میں آزادی اور جمہوریت کے نام پر لگائے جانے والے نعروں میں مذہب کی آمیزش نے بغداد کی شہری آبادی پر ہونے والی بمباری کے معانی بدل کر رکھ دیے تھے- عرب عوام کو یہ الیکٹرانی جنگ کوئی جدید تنازعہ نظر نہیں آ رہا تھا- یہ جنگ مذہبی تھی اور مسٹر بش کے بار بار استعمال کردہ جمہوریت اور آزادی کے نعریر بوں کو خون کی بساند میں بسے لگتے اور قبل اسلام کے لٹیروں کے حملوں اور بعد کے زمانوں کی صلیبی جنگوں کی یاد دلاتے تھے- کارٹونوں میں صدر بش کو بارہا ایک طاغیہ یا فرعونی آمر کے طور پر دکھایا گیا- اور چونکہ ان سے موسیٰ اور ان کے پیروکاروں کے خلاف فرعون کے ظالمانہ قوت کی کارفرمائی

یاد آتی تھی اس لیے مغرب کے نیک مقاصد' یعنی جمہوریت کے دفاع کا عزم مکمل طور پر غیر معتبر ہوگیا- انسانی تاریخ کے جدید ترین ہتھیاروں اور دوسرے ذرائع سے لڑی گئی جنگ خلیج نے علاقہ کے لوگوں کو تباہی سے یوں خوفزدہ کیا کہ وہ ایسے نشان منزل تلاش کرنے لگے جو عقل کو فریب منزل دیتے ہیں یعنی اساطیر اور اس کی ابہام سے متصف زبان-

MashalBooks.org

باب 7

انفرادیت کا خوف

تعقل پسند، غارت گری کی حد تک نتائجیت پسند اور، سب سے بڑھ کر یہ کہ، نہایت تندخو انفرادیت پسند قبل اسلام دور جاہلیہ کے عربوں نے اپنے ہمسائیوں پر غالب آجانے والی وحدانیت کی کئی صدیوں تک مزاحمت کی- وہ دیوتاؤں کی کثرت کو ترجیح دیتے رہے جن کی توہین کرنے اور جنہیں دھمکانے سے وہ ذرہ بھر نہ ہچکچاتے- اپنے پجاریوں کی خواہشیں پوری نہ کرنے پر ان دیوتاؤں کو اکثر اس سلوک سے دوچار ہونا پڑتا- دیوتا پر سنگ زنی، اس کی توہین اور اسے اٹھا کر پٹخ ڈالنا معمول کے واقعات تھے-

مدار(Mudar) قبیلہ کی ایک ذیلی شاخ بنو ملکان کے معبود سعد سے ہونے والی بدسلوکی عربوں کے اس رویے پر بہت حد تک روشنی ڈالتی ہے- دیوتا کی مورت ساحل سمندر کے ساتھ، جدہ کے قریب ایک چٹان کی صورت پھیلی ہوئی تھی- اس کا ایک پجاری اونٹوں کا ایک ریوڑ لیئے خیروبرکت کی غرض سے وہاں پہنچا- جب اس نے دیوتا کے حضور قربانی پیش کی تو جو کچھ اس نے دیکھا کبھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہ آیا تھا- دیوتا کے حضور پیش کی گئی قربانی کا خون، جسے رسم کے مطابق چٹان پر انڈیلا گیا تھا، دیکھ کر اونٹوں کے ریوڑ میں دہشت پھیل گئی اور وہ دوڑتے ہوئے صحرا میں چلے گئے- غصے میں بپھرے بدو نے چند پتھر چنے اور انہیں دیوتا کی شبیہ پر برسانے کے بعد کہنے لگا، ''میری اونٹوں کو خوفزدہ کرنے والا مجھے کیا خیروبرکت دے گا؟''

بالآخر جب وہ گھیر گھار کے اپنا ریوڑ دوبارہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس نے ایک نظم لکھی جس میں اس نے بتایا کہ وہ دیوتا کی طاقت پر اعتبار کرنے کو کیوں تیار نہیں-

MashalBooks.org

''ہم سعد کی پاس آئے تھے تا کہ میں اور میرا ریوڑ ساتھ رہ سکیں اور اب سعد نے ہمیں جدا کر دیا۔

اور سعد ایک بنجر بانجھ ویرانے میں تن تنہا چٹان کے سوا درحقیقت کچھ نہیں۔''

ابن الکلبی نے ایک دوسری مثال میں ایک نسبتاً زیادہ معزز دیوتا ذوالخلصاء کی بدنصیبی کا ذکر کیا ہے جو اپنے ایک پجاری کی سزا کا نشانہ بنا۔ اس کا یہ پجاری دور جاہلیہ کا معروف شاعر امراء القیس تھا۔ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیئے قبیلہ بنو اسد پر حملہ کرنے سے پہلے وہ اپنے پسندیدہ دیوتا کے پاس فال لینے اور حصول خیر و برکت کی غرض سے پہنچا کیونکہ مہم پر خطرہ اور دیوتا کے تعاون کی متقاضی تھی۔ اسے ہاتف کی طرف سے حسب خواہ جواب نہ ملا بلکہ اسے بدلہ نہ لینے کی نصیحت کی گئی تو امرء القیس کو اس قدر طیش آیا کہ وہ دیوتا کی توہین کرنے سے قطعاً نہ ہچکچایا، ''جاؤ اپنے باپ کا عضو تناسل چبا ڈالو، اگر تمہارا باپ قتل ہوا ہوتا تو تم کبھی مجھ سے مشورہ نہ کرتے''(2)

ان واقعات سے عربوں کے خود پرستانہ تکبر کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ دور جاہلیہ میں انسان اور الوہیت کے مابین تعلق' بعد ازاں اسلام کے مجوزہ اس تعلق کے بالکل الٹ تھا۔ دور جاہلیہ میں انسانوں کی بجائے دیوتا ان کے ناقدانہ استدلال اور ارادے کے یرغمال تھے۔ فرد خود مختار اور دیوتا کا ناقد تھا اور اپنے معیار کے مطابق مسلسل دیوتا کی کارکردگی پر نظر رکھتا رہتا تھا۔ فرد کی یہ خود مختاری جو خود اس کی اپنی طاقت سے متصف تھی' اس کا یہ تکبر جو اسے دیوتاؤں کو پرکھنے کی اور اپنے برابر خیال کرنے کی ہمت دیتا تھا' دراصل طاغیہ کے اوصاف تھے: قبائلی سردار یا بادشاہ کے سے اوصاف جسے اپنی شخصی تعظیم یا جابرانہ عزائم کے باعث دنیاوی اختیارات حاصل تھے۔

طاغیہ؛ موسیٰ کا فرعون

قرآن میں لفظ طاغیہ ''ظالم لامحدود اختیار کے مالک بادشاہ'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہ ایک کثیر پہلو تصور ہے اور کوئی بھی پہلو کسی دوسرے سے کم منفی نہیں ہے۔ بعض اوقات یہ حد سے بڑھے غرور کے لیے استعمال ہوتا ہے جو سپر اندازی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے (دوسری سورت' چودھویں آیت)۔ بعض جگہ اسے فرعون کے سے جابر حکمران کے

لیے استعمال کیا گیا ہے (بیسویں سورت آیات40;24)- طاغیہ وہ حکمران ہے جو بشمول الوہیت' ہر چیز کو بہ نظر حقارت دیکھتا ہے- اس طرح کے طاغیہ کے نزدیک محض کمتر دماغی صلاحیتوں کے حامل یعنی احمق ہی خدا کے سامنے جھکتے ہیں- قرآن کی دوسری سورت کی آیت13 میں اسے بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ کیا ہم اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح احمق لاتے ہیں-''

اسلامی فلسفہ کی اشاعت کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ یہی مکمل خودمختاری تھی جس میں وہ کسی کمی کے روادار نہیں تھے- الوہیت کی مخالفت کرنے والوں کا ایک نمونہ مصر کا فرعون بھی تھا- موسیٰ کی وساطت سے اترنے والے احکام الٰہی سے اس کا انکار قرآن کی کئی سورتوں میں مذکور ہے- خود کو دیوتا قرار دینے والے فرعون کی عبرت ناک شکست کی کہانی قرآن میں بیان کی گئی ہے اور اس کا مقصد انکسار سے عاری انسان کا انجام بیان کرنا ہے-(3) جدید اسلامی بنیاد پرستوں کے ہاں بھی طاغیہ ایک پسندیدہ اور مقبول لفظ ہے' اکثر و بیشتر وہ اس لفظ کو معاصر مسلم حکمرانوں کو گالی دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں-

عرب کارٹونوں میں صدر بش کو بیشتر اوقات فرعون کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے- فروری1990 میں مراکش اخبار ''الاتحاد الاشتراکی'' کے ایک شمارے کی ایک سرخی میں بش کا خاکہ اڑانے کے لیے اسے یہ کہتے دکھایا گیا ہے-''میں جارج بش ہوں' میں تمہارا عظیم خدا ہوں-'' قرآن کے مطابق موسیٰ نے فرعون کو اللہ پر ایمان لانے اور خود کو دیوتا کہنے سے باز رہنے پر زور دیا لیکن اس نے جواباً اپنے دستوں کو جمع ہونے کا حکم دیا اور قرآن کی سورت 79 آیت24 کے مطابق ان کے سامنے اعلان کیا کہ میں ہی تمہارا برتر و اعلیٰ مالک ہوں-'' عین فطری تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مکمل شکست دی اور پھر وہ کبھی سنبھل نہ سکا-

قرآنی علامات اور ان کی بازیافت کا جو مظاہرہ جنگ خلیج کے دوران ہوا وہ لاثانی تھا- پریس اور عوامی نعروں کی ساری لفاظی اسی منبع سے اخذ کی گئی- اس طرح کے نعرے بہت عام تھے کہ ''ہم قرآن اور ایمان سے امریکہ کو شکست دیں گے- عربی لفظ قرآن اور امریکان کے صوتی آہنگ کی قربت نے نعروں کو آسان تر کر دیا- سوشلزم اور جمہوریتکے بھی بہت سے حوالے دہرائے گئے لیکن مستولیہ (ذمہ داری) قرار (فیصلہ سازی) اور طبعہ

(انحصار) جیسے الفاظ میں وہ جذباتی قوت موجود نہیں تھی۔

اگرچہ صدر بش کو فرعون سے تقابل کا اعزاز حاصل رہا لیکن عرب ریاستوں کے سربراہ ویسی قوت کے طاقت کے حامل نہ ہونے کے باعث قدرے کم درجے کے تقابل کی خوش آمد پر قانع رہنے پر مجبور تھے۔ انہیں حمار (گدھے) پر گزارا کرنا پڑا جو صوتی آہنگ میں ڈالر (عرب ڈالر کو دلار کہتے ہیں) کا سا ہے۔ بعض جگہ انہیں دکانداروں کی سطح پر اتارا گیا۔ ''فہد یا الحمار بیعتہ مکہ بالاُلار (گدھے تم نے ڈالر کے بدلے مکہ بیچ دیا)' (مبارک یا ذلیل بیعتہ مکہ ونیل) (مبارک' اے بھکاری' تم نے مکہ اور نیل بیچ دیا ہے)۔

اگر الاتحادالاشتراکی'' کے کارٹون میں' کارٹونسٹ نے مسٹر بش کو ایک سعوری شہزادے کے لباس میں دکھایا ہے تو مقصد دراصل سعودی حکومت اور امریکی صدر کے درمیان تعلق پر زور دینا ہے۔ اور طاغیہ کے قرآنی بیان کے مطابق دونوں گزر جانے والی اور خالی شبیہوں کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ صرف اللہ کی حکومت ہی لازوال ہے۔ فرعونی طاغیہ کا یہ آرکی ٹائپ مسلم سیاسی نظام کی ساختی اور توارثی عدم استحکام کی جڑوں میں موجودہ ہے۔ خلفاء سے لے کر آج کی جدید جمہوریتوں کے رہنماؤں تک سب کو چیلنج کیا جاسکتا ہے اور خارجی بغاوت کی روائت میں ان پر بیشتر اوقات جسمانی حملہ بھی کردیا جاتا ہے۔

عوام الناس کو ہمیشہ قرآن کے طاغیہ کے تصور کے نام پر متحرک کیا جاسکتا ہے۔ استحصال کو روکنے کی ایک ہی صورت ہے کہ عوامی تمدن کے مراکز یعنی مسجد اور بازار تک جمہوریت پہنچائی جائے اور ایسا صرف تعلیم اور روزمرہ کی فیصلہ سازی میں شراکت سے ہی ممکن ہے۔ جدید اسلامی حکومتوں نے اطاعت کے بندھن کو مضبوط کرنے کی غرض سے مقدس علامات کو ہر مناسب مقام پر جڑ دیا ہے۔ اگرچہ یہ حکومتیں عوام کو رام کرنے میں کامیاب رہی ہیں لیکن اس حالت کا استقرار ممکن نہیں۔ بالآخر لوگوں میں ''طاغیہ'' کی استبدادی قوتوں کے خلاف اضطراب اور بے چینی جنم لے گی جسے عرب رہنما ہوا دے رہے ہیں۔ ٹیلی وژن کی نشریات میں جبر پر پردہ ڈالنے کی کوشش زیادہ عرصہ تک کام نہیں کرے گی۔ اسلام مثبت قطب (اطاعت اور' سلام یعنی امن اور سپر اندازی) اور منفی قطب (یعنی طاغیہ اور فتنہ یا انتشار) کے درمیان ایک ایک توازن قائم رکھنے پر مبنی ہے۔ ٹیلی وژن کی نشریات پر چاہے صرف مثبت قطب کو ہی پیش کیا جاتا ہے' مسلمان سامعین کے ذہن میں

گمشدہ قطب یعنی ایک جابر کا سایہ ہمیشہ موجودہ رہتا ہے-

ظہوراسلام کے کئی صدیوں بعد بھی کئی مسلمان رہنماؤں نے فرعون کی سی بدفطرتی اپنائے رکھی- بعض اوقات کچھ نے نبوت کا دعویٰ بھی کردیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ عنایت محمدؐ پر ختم کردینے کا اعلان کردیا تھا- بعض نے اس سے بھی بڑی چھلانگ لگائی اور خدا ہونے کے دعویٰ پر معلق ہوگئے- عموماً اس ترغیب کی مزاحمت نہ کر پانے کی قیمت انہیں اپنی جان کی صورت دینا پڑی لیکن' اس کے باوجود یہ ترغیب آج بھی موجود ہے اور مشرق وسطیٰ کے کئی دارالحکومتوں میں اسی درجے کو پہنچی ہوئی شخصیت پرستی دیکھنے کو ملتی ہے-

حضرت محمدؐ کے بعد جھوٹے نبی اور جھوٹے خدا:

کہا جاسکتا ہے کہ دور جاہلیت کا تکبر کبھی غائب نہیں ہوا- ظہور اسلام کے عرصے بعد تک عربوں نے پیغمبر ہونے کے دعوے جاری رکھے- قاہرہ پر 386تا411ھ (996تا1021ء) حکومت کرنے والے فاطمی خلیفہ الحاکم بامراللہ جیسے کچھ افراد نے تو باقاعدہ الوہیت کا دعویٰ کردیا-(4) جھوٹے نبی مسیلمہ (جسے کذاب کہا گیا) نے تو حضرت محمدؐ کی زندگی میں نبوت کا دعویٰ کردیا- خلفاء کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں سے کئی نے نبوت کا دعویٰ کیا اس کی ایک مثال المختار الثقفی (متوفی 68ھ/687ء) ہے' جس نے بنوامیہ کے خلاف اعلان بغاوت کیا- ''افواہ پھیلی کہ وہ پیغمبر ہے اور اس پر آسمانوں سے وحی اترتی ہے-'' اس نے کچھ غنائیہ تقاریر بطور ورثہ چھوڑیں جن میں شعوری طور پر قرآن کا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے- قرامطی اہل تشیع کی ایک انتہا پسند شاخ تھے- ان کے کئی رہنماؤں نے ایسے خوفناک مظالم ڈھائے اور ایسے دہشت انگیز کام کیے کہ خود اہل تشیع نے ان سے لاتعلقی کا اعلان کردیا- ذکروی القرامطی (متوفی 293ھ/906ء) نے خدائی کا دعویٰ کیا اور لوگوں سے اپنے سامنے سجدہ ریز ہونے کا تقاضا کیا- اس کے بدنام ترین اعمال میں سے ایک بیس ہزار حاجیوں کے ایک قافلے پر غارتگری کے بعد ان کا مکمل صفایا تھا- یہ قافلہ خراسان سے مکہ جارہا تھا-(5)

مختلف خلفاء کے پاس نبوت کے دعویدار آئے کہ انہیں سنا جائے- ان میں سے کئی کی کہانیاں زبان زدعام ہوگئی تھیں- ایسی ہی ایک' بظاہر ماورائے حقیقت، کہانی مورخ

المسعودی نے بیان کی ہے جس میں عباسی خلیفہ المامون اور نبوت کے ایک دعویدار کی ملاقات پڑھنے کو ملتی ہے- اپنی رعایا کے خیالات سے آگاہ رہنے کے لیے المامون نے اپنے دروازے خواص وعام کے لیے کھلے رکھے تھے اور اس عمل نے بہت سی داستانوں کو جنم دیا ہے- کہانی کا راوی خود خلیفہ بتایا گیا ہے-

''ایک شخص کو اندر لایا گیا جو اپنے پیغمبر ہونے کا دعویدار تھا-

میں نے اس سے پوچھا ''تم کون ہو؟''

اس نے جواب دیا ''موسیٰ' عمران کا بیٹا''

میں نے اپنی بات جاری رکھی ''خیال رہے کہ موسیٰ نے اپنا عصاء زمین پر پھینکا اور وہ اژدہا کی طرح بل کھانے لگا' آپؑ نے اپنا جلتا ہوا ہاتھ عبا میں چھاتی پر رکھا اور نکلا تو صحیح سلامت اور سفید تھا- اور یوں میں نے وہ سارے ثبوت گنوا دیے جو انہیں اپنے پیغمبر ہونے کے دعویٰ کی صداقت ثابت کرنے کے لیے عطا کیے گئے تھے- پھر میں نے اس سے کہا کہ ''اب اگر تم ان میں سے محض ایک نشانی بھی دکھا دو' ایک معجزہ بھی دہرا دو جو انہوں نے دکھائے تو میں تمہارے دعویٰ پر ایمان لانے والا پہلا شخص ہوں گا- بصورت دیگر تمہیں مرنا ہوگا''

اس شخص نے جواب دیا' ''آپ ٹھیک کہتے ہیں- میں نے اپنی نشانیاں صرف اس وقت دکھائی تھیں جب فرعون نے کہا تھا' میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں-'' اگر تم بھی مجھ سے یہ کہہ دو تو جو معجزے میں نے اسے دکھائے تھے' تمہیں بھی دکھانے کو تیار ہوں-''

جھوٹے پیغمبر نے جو فقرہ دہرانے کا مطالبہ کیا تھا' وہی تھا جو ایک اخبار نویس نے صدر بش کے منہ میں ڈالا تھا' ''میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں-'' ایک مسلمان خلیفہ کو خواہ کتنا بھی طاقتور کیوں نہ ہو' موسیٰ کے تکبر سے گریز کرنا اور خدا کے سامنے اظہار عجز کرنا پڑے گا- کیونکہ برتری کا سزاوار صرف خدا ہے- چنانچہ المامون اس جھوٹے نبی کے مطالبے پر وہ فقرہ نہ دہرا سکا اور یوں وہ محل سے زندہ نکل گیا-

قرآن کے توانا ترین پیغاموں میں سے ایک الوہیت اور انسان کے درمیان ایک مکمل نقطاع اور تمام نوع انسان کا بلا امتیاز رنگ ونسل' خدا کے نزدیک برابر ہونا ہے زندگی میں ان کا مرتبہ کچھ بھی رہا ہو' ان کا عقیدہ ہی ان کے مابین حقیقی فرق کا ذمہ دار ہے- عظمت' طاقت

مکمل اقتدار اور برتری فقط خدا سے منسوب ہے- ان کا دعویدار ہر شخص جھوٹا ہے- اہل تشیع اور اہل سنت کے مابین اختلافی مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ سنی امام کے معصوم عن الخطا ہونے پر ایمان نہیں رکھتے- صرف خدا کی ذات ہے جس سے غلطی سرزد نہیں ہوتی چونکہ انسان کو غلطی کی رعایت حاصل ہے، صاحبان اقتدار تنقید سے ماورا نہیں- کمزور اور طاقتور کے درمیان اور حاکم اور محکوم کے درمیان یہی بنیادی مساوات اصل اسلام کی روح ہے- یہ اسلام کے ان تصورات میں سے ایک ہے جس نے اسلامی عہد کو دور جاہلیت سے منقطع کردیا- یوں ایک نیا اور انقلابی تصور متعارف کروایا گیا جو اب تک نامعلوم تھا- یہ تصور مساوات یعنی برابری کا تھا-

ہم مرتبہ لوگوں کی امت:

دو جاہلیہ کے مکہ میں جہاں تجارتی روابط باہمی تعلقات کے خطوط کا تعین کرتے تھے' دیوتاؤں کی حفاظت اتفاقی معاملہ ہوا کرتا تھا- ظہور اسلام تک دیوتاؤں کو باقاعدہ بلیک میل کیا جاتا تھا کہ ''اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا وفادار رہوں تو مجھے کچھ ڈھور ڈنگر دلوا دو-'' دیوتاؤں کے ساتھ اس طرح کے معاملے کی وجہ سے ہی اسلام سے قبل وحدانیت خود کو ثابت کرسکی اور نہ ہی مستحکم(7)

اس حوالے سے دیکھا جائے تو اسلام متکبرانہ انفرادیت کے خلاف اٹھنے والی ایک آواز تھی- قریش کی یہی خود اعتمادی تھی جس کے حوالے سے رسول اللہ نے مطالبہ کیا کہ آتش مزاج عرب اشرافیہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے آگے سرنگوں ہوجائے- اسی مکمل اور غیر منقسم اطاعت' یعنی صرف خدا کے سامنے اطاعت' کے نتیجے میں ہی ایک ایسا معاشرہ وجود میں آسکتا تھا جس کی بنیاد مساوات پر ہو- جہانوں کے مالک خدا کے سامنے انفرادیت کی فنا کے نتیجے میں ہی مسلم تنظیم یعنی مساوات کے دوسرے ستون کی تعمیر ممکن تھی- انفرادیت سے دستبرداری کے بدلے میں تمام انسانوں ___ مردوں اور عورتوں' مالکوں اور غلاموں' عربوں اور غیر عربوں ___ کی مساوات وہ دوسری چیز تھی جس کی ضمانت اسلام امن کی ضمانت کے ساتھ فراہم کرتا تھا- لیکن امن اور مساوات کی یہ ضمانت انفرادیت سے دستبرداری کے بدلے میں تھی- اس مضمون کی آیات میں سے پرکشش ترین انچاسویں سورت کی تیرھویں

آیت ہے- جناب رسولؐ کعبہ کو بتوں سے پاک کر چکے تو یہ آیت نازل ہوئی- مسلم کانفرنسوں اور دوسرے اجتماعات کے موقع پر یہ آیت بڑی باقاعدگی اور اہتمام سے پڑھی جاتی ہے ''اے نوع انسان ہم نے تمہیں مرد اور عورتیں پیدا کیا اور پھر تمہیں قبیلوں اور اقوام میں بانٹ دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو جان سکو'(8)

اس آیت میں دو پیغامات کو مجتمع کیا گیا ہے- ایک تو یہ کہ امت باہم مساوی افراد پر مشتمل ہے اور دوسرے یہ کہ اتحاد بین المسلمین سرحدوں اور تمدنوں سے ماورا ہے- امت کا مختلف تمدنوں کو محیط کرنا ہی مسلمانوں میں باہمی یگانگت کا وہ خوبصورت احساس پیدا کرتا ہے جو ان کو باہم ایک عالمگیر برادری کے رکن ہونے کا جذبہ فراہم کرتا ہے- اس جذبے کی شدت کا احساس غیر ملکی سفر کے دوران ہوتا ہے- ڈاکار سے ملائشیا تک دکانداروں کے ساتھ لمبی سودے بازی کے دوران قطعی لاتعلق نظر آنے والے چہرے میرے منہ سے عربی کا کوئی لفظ پھسل نکلنے پر دمک اٹھتے ہیں- پھر وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں کہاں سے آئی ہوں- جب میں جواب دیتی ہوں کہ مراکش سے تو وہ فوراً کہتے ہیں-''آہ! المغرب الاقصیٰ (مغرب بعید)' لاالہ الااللہ'' پھر اچانک مجھے تمام تر توجہ اور مراعات دی جاتی ہیں' کرسی پیش کی جاتی ہے' قریبی دکان سے لاکر کوکا کولا پیش کی جاتی ہے اور پھر سینگ کے ترشے دانوں یا شیشے کے منکوں کے مالا کی قیمت اندھا دھند کم کردی جاتی ہے-

اسلام کے بے پناہ تیزی سے پھیلنے کی توضیح محض پر جوش عربوں کے جذبہ جہاد سے نہیں کی جاسکتی- اس صورت میں ایک انتہائی اہم امر نظر انداز ہوجائے گا' اور وہ امر قرآن کا تمام انسانوں کے باہم برابر ہونے پر متواتر اصرار ہے- تمام انسانوں کا خواہ وہ کسی بھی نسل یا معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں- اس اصول نے اسلام کو ایک ایسا پر امن مسافر بنادیا جو کسی کے معاملات میں خواہ مخواہ کی مداخلت نہیں کرتا اور بغیر فوجوں اور سامان حرب کے پر امن طور پر اپنی تمام تر سادگی کے ساتھ مسلمہ تجارتی راستوں کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا جاتا ہے- اسلام افریقہ اور ایشیا تک پھیل گیا جہاں سماجی حفظ مراتب نہایت سخت ذات پات کی صورت میں موجود تھا- اسی طرح اسلام انڈونیشیا اور چین کو جانے والی عظیم تجارتی شاہراہوں کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا گیا ان علاقوں میں اسلام سے جس مذہب کو سب سے زیادہ خطرہ لاحق ہوا وہ بدھ مت تھا-

''اسلام وہاں تک بھی پھیل گیا جہاں اس وقت تک عیسائیت نہیں پہنچتی تھی- ازمنہ

وسطیٰ کے آخری ادوار تک اسلام مشرقی افریقہ کے زنجبار اور کامورو جیسے جزائر اور ساحل کے ساتھ ساتھ کی ساری تجارتی چوکیوں تک میں مورچہ بند ہو چکا تھا- یہاں اسے کسی بڑے شہری مذہب سے حریفانہ واسطہ نہیں پڑا- لیکن گجرات کے مشرق کی طرف کے تمام شہری معاشرے ہندومت اور بدھ روایات سے اپنی وابستگی میں بہت پختہ تھے- اس علاقے کی تمام بندرگاہوں میں اسلام اہمیت اختیار کر گیا- چودھویں صدی تک اسلام جنوبی ہند کے تجارتی گروہوں کی وساطت سے جزیرہ نما مالہ اور شمالی سماٹرا کے ساحلوں تک پھیل چکا تھا- یہاں تجارت خلیج بنگال اور بحیرہ جنوبی چین کے راستے سے ہوا کرتی تھی-مشرق بعید کے ترقی یافتہ تمدن ہندوستانی تجارتی گروہوں سے ہمیشہ سے اثرات قبول کرتے چلے آئے تھے اور صدیوں تک ان اثرات سے مراد ہندومت تھا- اب یہ اثرات زیادہ تر اسلام کی شکل اختیار کرنے لگے جس کے ساتھ عربی' ایرانی تمدن نے بھی اپنے اثرات چھوڑے-1500 تک ملائشیا کے مجمع الجزائر اور ہند چینی ساحل کے ساتھ ساتھ اسلام ایک بڑی قوت بن چکا تھا-''(9)

میں پہلی بار1987 میں صبح چار بجے نیم خوابیدگی کے عالم میں کراچی اتری- جس بات نے مجھے حیران کر دیا یہ تھی کہ کسٹم ایجنٹ جس نے نہایت احترام سے صبح ہونے پر مجھے شہر دکھانے کی پیش کش کی تھی اور میں نے انکار کر دیا تھا' خالص عربی لہجے میں قراۃ کرنے لگا- ''اے نوع انسان' ہم نے تمہیں مرد وزن پیدا کیا اور پھر قبیلوں اور قوموں میں بانٹ دیا تا کہ تم ایک دوسرے کی شناخت کر سکو-'' یہی آیت میں نے خالص امریکی لہجے کے حامل ایک امریکی جازسنگر سے ٹوٹے پھوٹے عربی لہجے میں سنی تھی- میں اس کا گانا سننے ہیوسٹن کے نواحی علاقے راکس بری میں گئی تھی- یہ1970 کے وسط کی بات ہے جب میں طالب علم تھی اور میلکم ایکس کے زیر اثر سیاہ فام امریکی اسلام قبول کر رہے تھے- درحقیقت قیام امریکہ کے دوران مجھ پر پہلی بار منکشف ہوا کہ زیر استبداد اقلیتوں کے لیے اسلام میں کس قدر کشش ہے- اپنے وطن مراکش میں مجھے کبھی اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوا تھا جہاں مساوات اور اتحاد کا فقدان معمول کی بات ہے-

جنگ خلیج کے دوران مسلم ممالک میں عراق کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس میں صدام

حسین کے ساتھ شخصی عقیدت کا کوئی تعلق نہیں تھا جیسا کہ جمال عبدالناصر کے ساتھ تھا ایران کے خلاف صدام حسین کی جنگ نے، جس میں ہزاروں مسلمانوں کی جان گئی تھی، عامتہ الناس کو گومگو اور یکساں خیالی کے فقدان سے دوچار کردیا تھا- صدر ناصر کے بعد سے عرب عوام کسی لیڈر کے منتظر ہیں- صدر ناصر کے بعد سے، جو سرد جنگ کے دوران خودمختاری اور آزادی کا علمبردار تھا اور اس وقت تک رہا جب تک اس نے دانشوروں کو قید کرنا نہیں شروع کردیا، اس کی جگہ خالی پڑی ہے-

صدر قذافی کی ''سبز کتاب'' کو سنجیدگی سے فقط ان لوگوں نے پڑھا جنہیں کسی ملازمت یا مالی مفاد کی توقع تھی- عرب دنیا کی قیادت کے دوسرے دعویدار بہرحال اتنے عقلمند ضرور ہیں کہ انہیں اس پر اصرار نہیں-

جنگ خلیج کے دوران عوام الناس کے کسی ایک یا دوسرے کا ساتھ دینے کی وجہ شخصیتوں سے محبت کا تاثر نہیں تھا- دراصل یہ طاغیہ کا تصور تھا جو عوام کا جھکاؤ عراق کی طرف کیے ہوئے تھا- تیل کے کنوؤں پر بیٹھے کویتی اور سعودی شیخ دولت کا درست استعمال کرتے تو طاقت کا توازن درست کیا جاسکتا تھا- لیکن انہوں نے فقط اپنے اپنے ذاتی مفادات کی نگہبانی کی اور اسی کے پیش نظر حکمت عملی مرتب کی- چنانچہ عوام الناس کے نزدیک ''طاغیہ'' کے تصور پر پورے اترتے تھے- عرب اخبارات اور عوامی نعروں میں انہیں اسی طرح پیش کیا گیا، ایسے فرعون جو اس رحمتہ کو فراموش کر بیٹھے تھے جس کا وعدہ حضرت محمدؐ کے مکہ نے دنیا سے کیا تھا- صدر بش نے ساری دنیا کو مجبور کیا کہ وہ عراق کے خلاف جنگ میں حصہ لے اور یوں کویتیوں اور سعودیوں کو دنیا پر عیاں کرنے پر مجبور کر دیا کہ وہ مختلف مغربی ممالک کو کتنی رقم ادا کرتے رہے ہیں- جمہوریت کی بین العرب بحثوں میں اس رقم کی مقدار ایک دھماکے سے کم نہیں تھی کہ کویت اسلحہ کی مد میں فرانس کو کتنی رقم ادا کرتا رہا ہے- سی این این کی مہربانیوں سے شاہی اخراجات کے بجٹ اور اسلحہ کی خریداری میں صرف ہونے والی رقم کی تفصیلات پہلی بار دنیا کے علم میں آئیں- لوگوں کو پہلی بار شعور ہوا کہ ایک ٹینک یا جہاز

MashalBooks.org

کتنے میں پڑتا ہے- ہر بار ٹی وی سکرین پر کسی ٹینک یا جہاز کو جلتے اور دھوئیں میں تحلیل ہوئے دکھایا جاتا- نوجوان جفت ساز نفیس چمڑے پر چلتے اپنے ہاتھ روکے بغیر ذہن میں حساب لگاتے اور کہتے ''یہ ایک اور لے لوفرعون-'' شہر اقتصادی انتشار اور تقدس کے امتزاج سے مرتب فضا میں ڈوبا ہوا تھا جس میں کبھی کبھار جابر وقاہر حکمران کی مذمت سننے کو ملتی تھی-

عوام الناس میں پھیلے احساس محرومی کو کوئی رخ دینے میں آج اسلام بطور کلچر موثر ترین کردار ادا کرسکتا ہے اس لیے کہ اسلام اہل ایمان کو معاشرتی اتحاد کی بے پناہ توقعات سے نوازتا ہے- لمبے عرصے تک عوام کو خاموش اور بے حس رکھنے کے لیے بطور ہتھکنڈا استعمال کیا جانے والا تقدس آج ان لوگوں سے اپنا انتقام لینے پر تلا ہوا ہے جنہوں نے اسے استعمال کیا ہے- بالکل اپنے ظہور کے زمانے کی طرح آج پھر اسلام مراعات یافتہ افراد کو ڈگمگا دینے والی قوت بن گیا ہے- اور یہ عمل علاقائی اور عالمی ہر دو سطح پر ہو رہا ہے- سوشلزم اور مارکسزم سے پھوٹنے والی بائیں بازوں کی جدید قوتوں کو ہراساں کیا گیا- اسی وجہ سے وہ اتنی محنت اور لگن سے کام نہ کرسکے وگرنہ ممکن تھا کہ وہ دوسرے نظریات کی جگہ لینے میں کامیاب ہوجاتے- بہت سوں کے نزدیک مسلم ممالک میں جمہوری تحریکوں کے انہدام کی وجہ سرد جنگ کے دوران سوشلسٹ بائیں بازو کے خلاف امریکہ کی جدوجہد تھی- وہ مصدق کے خلاف سی آئی اے کی سازش کو اسی عمل کا نمائندہ گردانتے ہیں- سرد جنگ نے مسلم معاشروں کی تمدنی نشوونما کو پٹری سے اتار دیا اور ایران میں' امام کو موقع فراہم کیا کہ وہ دبی ہوئی امنگوں کے عکس کی صورت میں سامنے آئے-''آج تمام طرح کے بنیاد پرستوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ وہ نہ صرف اسلام کی روح کو ازسرنو تابندگی نہیں دے رہے بلکہ بوسیدہ خوابوں کا ایک جنازہ تیار کررہے ہیں جسے بالآخر صحرا کی ریت میں گم ہوجانا ہے- بنیاد پرستی ذہانت کو جذباتی اور غیر ارادی حرکات کی سطح پر لے آتی ہے- دماغ میں گرنے والا بنیاد پرستی کا ایک قطرہ بھی اپنے اندر انحطاط کے جراثیم لیئے ہوتا ہے-

عظیم جمہوری ترقی اور تمدنی اور سائینسی کامیابیوں اور کارناموں سے خالی ہماری لولی لنگڑی جدت پسندی امیدوں کے سوداگروں کے لئے راہ ہموار کررہی ہے چونکہ ہم ایسے

انداز نظر سے عاری ہیں جو مستقبل تو کیا حال میں لنگر انداز ہو سکے' چنانچہ وہ سوداگر ہم سب کو ایسے علاقوں کی طرف لے جارہے ہیں جہاں صرف سراب پنپ سکتے ہیں یعنی ماضی کی طرف-ان کے دلوں میں عورت کا خوف بھی گھر کئے ہوئے ہے- یہ وہ خوف ہے جس کی بنیاد زمانہ جاہلیہ کے انتشار میں پیوست ہے-عربوں نے اس دور سے آگے قدم بڑھانے کے لئے کبھی ٹھنڈے دل سے اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی- ابتداء میں اسلام نے جاہل عربوں کے خوف اور ان کے توہمات سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی-لیکن بہت جلد پیغمبر اسلامؐ کی مثال لوگوں کے شعور سے غائب ہوگئی- آنحضرتؐ تبدیلی کی ضرورت پر اصرار کرتے تھے- بعد کے خلفا دور جاہلیہ کی طرف واپس چلے گئے اور عورتوں کو مقفل کرنے لگے اور مساجد میں ان کا داخلہ بند کر دیا- پھر عورتیں جہالت کے گڑھے میں گر گئیں اور انہوں نے خاموشی اختیار کر لی-

MashalBooks.org

باب 8

ماضی کا خوف

میں اس امر پر اصرار کی جرات کیسے کرسکتی ہوں کہ عرب ماضی سے خوفزدہ ہیں- وہ عرب جن کے رہنما روزانہ نقارہ بجاتے ہیں کہ ان کا ماضی بے عیب اور کامل اوران کی شناخت کی کٹھالی ہے اور جس کے بغیر کسی طرح کے حال یا مستقبل کا تصورنہیں کیا جاسکتا- ہمارا قبل اسلام کا ماضی جاہلیہ کہلاتا ہے یعنی جہالت کا زمانہ چنانچہ اسے زیرحجاب ہونا چاہیے جوعورت کے لیے بھی لازم ہے- لیکن عربوں سے بہتر پس حجاب اور چھپائی گئی چیز کی طاقت کو کون سمجھتا ہے- عربوں نے دو قدم ایسے اٹھانے کی جرات کی ہے جس کا تجربہ کسی عظیم تہذیب نے نہیں کیا؛ انہوں نے اپنے ماضی سے انکار کیا ہے (اس ماضی سے جو تاریک تھا) اور نسوانیت کو چھپانے کی کوشش کی ہے- اور ماضی اور نسوانیت خوف کے تمام منابع وماخذات کے سرچشمہ- یعنی فرق- پرغوروفکر کے دوقطب ہیں-''

اگر پرانے کونظروں سے چھپا دیا جائے تو پھر نئے کی شناخت کیسے کی جاسکتی ہے- اور اگر مونث کونظروں سے اوجھل کردیں تو' کوئی بتا سکتا ہے کہ' مردانگی کی شناخت کیسے ہوگی- یعنی عورت کو ایک بلیک ہول' ایک خاموش شگاف اور بے چہرہ کردیا جائے' اور یہی سلوک دور جاہلیہ سے بھی کیا جائے تو مرد اور جدید دونوں کی شناخت ناممکن ہوجائے گی-

کیا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جاہلیہ' لاعلمی کا نقاب محض ایک تعویز ہے جسے ہم ہر اس چیز کے خلاف استعمال کرتے ہیں جسے ہم تسلیم اور قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں- ہم اس ننگے تشدد

MashalBooks.org

اور بدامنی سے متصف شہر کو قبول کرنے پر تیار نہیں جو جزوی طور پر مدفون ماضی کی وساطت سے نسوانیت سے وابستہ ہے- یہ نسوانیت جس پر غور وفکر ہمارے لیے مزید ناقابل برداشت ہے- کیونکہ یہ کعبہ پر حاکم دیوی کی تجسیم ہے- ان دیویوں کا ماورانہ خصائص سے کوئی واسطہ نہیں تھا- ان کا استھان خون کا تالاب اور مقدس شہر ناانصافی اور قتل وغارت کا ایسا میدان تھا جس پر نہ تو مذہب اور نہ ہی قربانیوں سے قابو پایا جاسکتا تھا-

زماں کے ایک خاص نقطے پر جاہلیہ کی یہ بدامنی معجزانہ طور پر رک گئی تھی اب دوبارہ جاہلیہ نے پہلے سے کہیں زیادہ عالم وحشت میں جنم لے کر اپنے انتقام کا انتظام کیا ہے کیونکہ مکہ اس وقت ''امریکی میزائیلوں کی حفاظت میں ہے-''

وہ میزائل جنہیں بعض اوقات ہیلمٹ میں چھپے معصوم چہروں والی لڑکیاں چلاتی ہیں-

کیا یونیفارم میں ملبوس پیرا شوٹ سے مقدس شہروں میں اترنے والیاں جانتی ہیں کہ ان سے پہلے ہتھیار صرف دیویاں سنبھالتی تھیں اور عربوں میں خون کا مطالبہ بیدار کیا کرتی تھیں- وہ عرب جہاں خوابوں اور شیطانی مخلوق کی طرح ثانیث بھی اندھیرے میں دھکیلی جاچکی ہے-

نوجوان امریکی خواتین جانتی ہیں کہ انہوں نے فوجی ملازمت کا انتخاب ایک ملک کی آزادی کے لیے کیا لیکن کیا وہ جانتی تھیں کہ عرب سرزمین میں دندناتے داخل ہوکر انہوں نے موت کی دیویوں کے دیوقامت ہیولوں کو از سرنو جگا دیا ہے- ان ہیولوں کو جو پندرہ صدیوں سے تغافل کا شکار ہیں- کیا ان ٹینکوں سے جھانکتے ان سروں میں یہ شعور موجود ہے کہ ان کی یہ سواری' جس کا وظیفہ موت اور قربانی ہے' اتنی ہی قدیم ہے جتنا الوہی ہتھیار- کیا انہیں یہ علم ہے کہ وہ جس جدیدیت کو سامنے لا رہی ہیں اسے دور جاہلیہ سے منسوب کیا جا رہا ہے-

وائے اے امریکی عورت' تم جمہوریتکے حق کو فقط جنگی ہیلمٹ اور موت کے ساتھ معاملہ کرنے میں برت رہی ہو' مجھے عرب کے اسرار میں سے ایک کو بے نقاب کرنے دو- عرب جو تمہارے لیے فقط تفویض شدہ فرائض میں سے ایک ہے لیکن میرے لیے ایک روایت اور ایک منزل ہے- مجھے یہ بتانے دو کہ میرے اجداد نے حجاب کے پس پر وہ کیا کچھ رکھا تھا؟ حجاب کے پیچھے کیا ہے؟ حجاب جو کہ ایک حد فاصل ایک رکاوٹ کے معنی رکھتا

ہے- ایک بات تو طے شدہ ہے کہ حجاب بہرحال کسی نہ کسی چیز کو چھپا رہا ہے- اگر کوئی چیز چھپانے کو موجود نہیں تو حجاب کا کوئی جواز نہیں-

حجاب عموماً ان چیزوں پر ڈالا جاتا ہے جو طاقتور ہوں اور خطرناک بھی- ہماری تہذیب میں مشہور ترین حجابوں میں سے ایک وہ تھا جسے بعض خلفاء استعمال کرتے تھے- حجاب الخلیفہ سیاسی اسلام کے اداروں میں سے ایک تھا جس کی اپنی رسوم اور اپنے آداب ہوتے تھے- یہ حجاب کئی رسالوں کا واحد موضوع رہا ہے جس میں سے دلچسپ ترین الجاحز کا ہے-(1) خلیفہ نقاب استعمال کرتا تھا کیونکہ وہ ایک خطرناک طاقت کا مجسم ارتکاز تھا- اور وہ طاقت موت کی طاقت تھی- تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم مسلمانوں کی اجتماعی یادداشت میں طاقت سے مملو عورت کا تعلق تشدد اور قتل سے ہے-

اس کا جواب ہمیں صفر وقت یعنی دور جاہلیہ میں ڈھونڈتا ہوگا- اس دور میں دیوتاؤں کی کثرت کے باوجود مکہ میں دیویاں ہی زمین وہ آسماں کی عناں گیر ہوا کرتی تھیں- اور ان دیویوں کی حیات کا انحصار ہی خون پر تھا- جنگ اور موت کی دیویاں جن کی خوفناک رسوم اور خوف انگیز مطالبے عربوں کی قابل رحم حالت کے ذمہ دار عوامل میں سے ایک تھے؟ عرب جن کی ایک بہت بڑی تعداد خود ان کی باہمی لڑائیوں کی بھینٹ چڑھ جاتی تھی- اسی تشدد اور خون کو بند کرنے یا کرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک عرب پیغمبر پر اپنا پیغام نازل کیا-

سورۃ ترپن کی آیت انیس اور بیس میں عرب کے آسماں پر حکمران تین معبودوں کا ذکر ملتا ہے جن کی باری باری مذمت کی گئی ہے- ان میں سے ایک العزہ ہے جو لفظ کے عسکری استعمال میں ''قوت'' کے معنی دیتا ہے- دوسرا ''منات'' ہے جو مصدر مانیہ سے مشق ہے جس کا مطلب ''موت'' ہے تیسرا اور آخری لات ہے جو الہات (دیوؤں) کے متضاد ہے- قرآن میں مذکور دیوتاؤں میں سے کچھ واد' سوء' یاغوث اور نصر ہیں (سورت 71 آیت 23)- لیکن عرب اور دوسرے ماخذوں کے مطابق یہ دیوتا اپنی قدر و قیمت میں دیویوں(2) سے کمتر تھے- آیئے پہلے سورۃ ترپن میں ان دیویوں کا ذکر دیکھتے ہیں-

ان دیویوں کے ذکر اور شناخت میں باقاعدہ نام استعمال کیا گیا ہے اور اس حوالے سے انہیں کعبہ میں موجود دوسرے دیوتاؤں پر تخصیص حاصل ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے دو گہواروں' مکہ اور مدینہ میں انہیں بلا مقابلہ اقتدار حاصل تھا-

MashalBooks.org

دیویوں کے شہر:

سیرت ابن ہشام کے مطابق بنوطقیف کی دیوی کا نام لات تھا اور اس کی حکمرانی شہر طائف پر تھی- عوذ اور خزرج منات کی پوجا کرتے تھے- مدینہ میں ان دو قبائل کی اکثریت تھی اور حضرت محمدؐ کو انہیں نے622ء میں مدینہ آنے کی دعوت دی تھی-''ان کی اور اہل یثرب میں سے اپنے مذہب پر عمل کرنے والوں کی دیوی منات تھی- اس کا مندر ساحل پر تھا- اور آخر میں' ابن ہشام کے مطابق' اہل قریش کی دیوی کا نام العزہ تھا اور ان کے شہر مکہ پر اس کی حکمرانی تھی-(3) اپنی کتاب ''کتاب الاصنام'' میں ابن کلبی ہمیں مزید معلومات فراہم کرتا ہے- منات قدیم ترین تھا اور عرب اپنے بچوں کے نام اس پر رکھتے تھے جسے ''عبدمنات'' اور ''زید منات'' اس کا بت سمندر کے بالمقابل' المشلل نامی پہاڑ کے ساتھ ساحل سمندر پر مکہ اور مدینہ کے درمیان کھڑا تھا- عوز اور خزرج اور وہ سب جو ان شہروں کا یا ان کے نواح کا سفر کرتے' انہیں دیویوں کی عبادت کرتے' نذرانے چڑھاتے اور ان کے حضور قربانیاں پیش کرتے تھے- عوز اور خزرج' دوسرے اہل عرب کی طرح کی تمام رسوم ادا کرتے تھے- وہ فقط اپنے سر نہیں منڈواتے تھے-'' وہ اپنے سر منات کے حضور منڈواتے اور اس کے قدموں میں یہ قربانی دینے کے بعد ہی ''وہ اپنا حج مکمل خیال کرتے تھے-''(4) منات کی اشکال میں سے ایک چٹان (سخرہ) تھی- اس نام کی جڑیں قدیم زبانوں کے سامی گروہ میں ہیں اور اس کا مطلب ''اپنی زندگی کے دن شمار کرلو'' تھا- بعد ازاں اسے مقدر کے ساتھ متشخص کیا جانے لگا-''جو ہر شخص کو اس کا کردار اور کارحیات عطا کرتی ہے-'' اپنے آخری دور میں اس کا نام مینیّہ تھا- یہ لفظ ہمارے ہاں موت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے-(5)

دوسری دو دیویوں لات اور العزہ کے علاوہ منات کے لیے بھی طاغیہ(6) کا لقب استعمال ہوتا تھا اور یہ لقب ان سے وابستہ خصائص کے عین مطابق تھا- یہ تمام جزئیات بے معنی نہیں ہیں- اس لیے کہ علامات کی دنیا میں جزئیات ہی میں سب کچھ ہوتا ہے- عرب ذرائع کے مطابق منات کے مندر میں موجود چوڑی پشت کی خمدار تلواروں میں سے ایک کو اسلام کے جھنڈے تلے ایک نئی زندگی ملی- یہ وہی تلوار ہے جو حضرت علیؓ کے حوالے سے مشہور ہوئی یعنی ذوالفقار- منات کے معبد کی تباہی کے بعد حضرت محمدؐ نے علیؓ کو جو دو تلواریں

عنایت کیں ان میں سے ایک یہی ذوالفقار تھی-(7)

ابن الکلبی کے مطابق طائف میں موجود معبد منات کے مقابلے میں نسبتاً جدید تھا- ''اس کے گرد بنو طائف نے مربع چٹان کی شکل کی ایک دیوار چن دی تھی' اہل قریش اور دوسرے قبائل اسے بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے- اس کے اعزاز میں اہل عرب اپنے بچوں کے نام ''زید اور لات'' رکھتے تھے-''(8) حالیہ سائینسی مہمات اور تحقیقات سے لات سے وابستہ عسکری جہات بھی سامنے آئی ہیں-

''ہیران کی قربان گاہ پر' جہاں ہم دوساریس دیوتا کے ملنے کی توقع کررہے تھے' ہمیں اس کے ہمراہ ایک جنگجو دیوی ملی جس سے وابستہ خصائص ایتھنا (یونانی) دیوی کے سے تھے- اور ایتھنا عظیم عرب دیوی لات کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی جس کی پرستش جنوبی عرب سے لے کر پالمیرا تک کے تمام علاقے میں کی جاتی تھی- اس کی شناخت' جو ایک لمبے عرصے تک مشکوک رہی تھی' حالیہ ملنے والے ایک کتبہ کے باعث شک وشبہ سے بالاتر اور مصدقہ ہوگئی ہے-''(9)

خود اور ہتھیاروں سے لیس اس مورت کی قربان گاہ اور ساواوید کی سردلوں سے ملنے والی دیوی کو ماہرین آثار قدیمہ نے لات کے طور پر شناخت کرلیا ہے-''نیزے سے مسلح یہ دیوی جنگجو تھی اور سپاہی اس کی تعظیم کرتے تھے- اسے کلغی نما تاج پہنے جنگجوؤں سے خراج وصول کرتے دکھایا گیا ہے-'' اگرچہ ابتداء میں لات زرخیزی اور جنگ دونوں کی دیوی تھی' لیکن بعدازاں اس سے صرف جنگ وابستہ رہ گئی-

العزہ خون کی پیاسی دیوی

لیکن جو دیوی معبودیت کے عسکری پہلو کو بھرپور طور پر پیش کرتی ہے وہ العزہ ہے- یہ دیوی اجتماعی یادداشت میں نسائی عہد حکومت کو تاریک ادوار سے ملاتی ہے- ان تاریک ادوار سے جب معبودوں کو خون سے سیراب کیا جاتا تھا اور یہ خون ہمیشہ جانوروں کا نہیں ہوتا تھا- کچھ ماہرین کے خیال میں نوزائیدہ بچیوں کا دفنایا جانا' جو حضرت محمدؐ کے وقت تک رائج تھا' یعنی وعدالبنات کا معمہ اسی صورت حل ہوسکتا ہے اگر اسے کچھ دیوتاؤں کے حضور قربانی کی ایک شکل کے طور پر لیا جائے- اور ان معبودوں میں العزہ بھی شامل ہو- اس کا نام دو

الفاظ عز (اقتدار، طاقت) اور قویٰ (جسمانی قوت) سے مرکب ہے- اس کی عبادت شجر کی شکل میں کی جاتی تھی- کعبہ میں اس کی تعظیم کے لیے ایک مورت موجود تھی- کعبہ سے باہر ایک معبد صرف اس کی عبادت کے لیے تھا- کچھ دوسرے ماہرین کا خیال ہے کہ اسے زہرہ خیال کیا جاتا تھا اور اس کی پوجا کے لیے ستارہ پرستی بھی کی جاتی تھی- ہم کسی نتیجہ خیز بحث کے لیے بطور خاص کسی ایسی چیز سے آغاز کریں گے جو حسیاتی شناخت میں آ سکے- یعنی زمین پر اس کے مظہر سے جسے کعبہ میں موجود 360 بتوں کی شکست وریخت کے وقت تباہ کر دیا گیا- اس کے بعد ہم اس کے فلکی پہلو پر توجہ دیں گے جو خصوصاً جنوبی یمن میں، حالیہ زمانے تک بظاہر موجود ہے-

ابن ہشام اپنی سیرت النبی میں رقم طراز ہیں کہ ''پیغمبرؐ کا قبیلہ'' قریش جس کا اثر و رسوخ مکہ سے باہر تقریباً تمام جزیرہ نمائے عرب میں تھا، نخلہ میں اس کی عبادت کرتے تھے، جو عراق کو جانے والے راستے پر مکہ سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ کچھ کے خیال میں یہ ایک درخت تھا اور بعض اسے کیکر کے تین درختوں کا جھنڈ مانتے ہیں۔ اس کے معبد میں قربان گاہ اور ہاتف کا موجود ہونا، جس سے دور نزدیک کے لوگ رجوع کرتے تھے، اس کی اہمیت کا ایک اور ثبوت ہے- وہ اہل قریش کی اہم ترین مورت تھی۔ وہ اس کا حج کرتے اور اس کی معاونت کے حصول کی غرض سے اس پر چڑھاوے چڑھاتے۔ اس کی قربان گاہ جسے غبغب کہا جاتا تھا کا لفظی مطلب ذبیحہ کا مقام تھا۔ ''یہ ایک خشک کنویں یا کھائی کے نزدیک رکھی قربان گاہ تھی جس میں مورت کے حضور پیش کی گئی قربانی کا خون بہتا تھا۔ (12)'' بازنطینی مورخ پروکوپ ڈلی سیزاری کے مطابق ہیرا کے مشہور بادشاہ المنظر (54-505) نے اس دیوی کے حضور چار سو انسانوں کی قربانی دی جو سب کے سب ساسانی جنگی قیدی تھی۔(13)''

کیا عرب جناب رسول ﷺ کے زمانے میں بھی انسانوں کی قربانی کر رہے تھے؟ کیا قربانی کے لئے رسوم خصوصیت سے دیویوں سے مخصوص تھیں اور یوں قبل اسلام زمانے سے متعلق ہماری یا دداشت میں موجود نسوانی فرماں روائی اور ظلم وستم کے درمیان تعلق کہیں پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔ اگر معاملہ یہی ہے تو کیا اس امر کا تعلق حجاب کے معمہ سے نہیں جو نسوانیت کو چھپاتا ہے اور اس کے وجود سے انکار کے خطرے کی قیمت پر اس کے ارادے کو

کچلتا ہے؟ کیا صنفوں کے مابین ایک نئے تعلق کے متعلق گفت وشنید ہمارے ماضی کے دور جاہلیہ سے مفاہمت کو ناگزیر حیثیت دینے کی متقاضی ہے تاکہ وہ ہمارے احاطہ علم کا ازسرنو ایک جزو لازم بن جائے۔ بہت سے ممنوعہ سوال تاحال جواب کے منتظر ہیں- اگر کوئی دیرپا شناخت تعمیر کرنا ہے تو ان سوالوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہی شناخت دیرپا ہوسکتی ہے جس میں اپنی پوری بشری وراثت کو زیرحساب رکھا جائے۔ ہمارے پاس جو چند سراغ موجود ہیں، سردست انہیں ہی زیرغور لانا بہتر ہوگا۔

کیا لڑکیوں کا دفن کیا جانا انسانی قربانی تھی؟

اگرچہ کچھ آیات اسے دیوتاؤں کے تقاضوں سے منسلک کرتی ہیں اور یوں یہ انسانی قربانی کی ایک شکل بن جاتی ہے لیکن بہت سے مسلم مورخین اس وضاحت کو تسلیم نہیں کرتے اور توجیہہ میں کچھ دوسرے نظریات پیش کرتے ہیں جن میں سے ایک اور غالباً معروف ترین یہ ہے کہ غربت یا بے عزتی کا خوف والدین کو طفل کشی پر مجبور کرتا تھا۔ اول تو باپ اپنی بیٹیوں کو فاقوں کی موت سے بچانے کے لئے قتل کر دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ انہیں کسی نہ کسی لڑائی میں دشمن کے ہاتھ لگ جانے کے خوف سے بھی قتل کر دیا جاتا تھا، اگر اس نظریے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو (عرب کے اس وقت کے حالات دیکھتے ہوئے) طفل کشی تخمینہ شدہ تعداد سے کہیں زیادہ ہونی چاہیے تھی۔ لیکن قرآن کی سورۃ 138 کی آیت 6 میں ہی بڑے واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ الوعد ان خون آشام معبودوں کے اثرات میں سے ایک ہے جنہیں لوگ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

طبری ان مورخین میں سے ہیں جو اشاعت اسلام کے زمانے میں طفل کشی کے بطور انسانی قربانی مروج ہونے کو ماننے سے محترز ہیں۔ ان کا جھکاؤ اس نظریے کی طرف ہے کہ خاندان کی عزت طفل کشی کا بنیادی محرک تھی لیکنجب انہوں نے مذکورہ بالا آیت 138 پر غور کیا تو وہ بھی اس ناقابل قیاس بات ماننے پر مجبور ہوگئے کہ نومولود یا نوعمر بچیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں بتوں کے تقاضوں کا ہاتھ بھی تھا۔ اسی سورت کی آیت 41 میں طفل کشی کو جہالت قرار دیتے ہوئے ایک مذموم فعل ٹھہرایا گیا ہے اور ان گمراہ کن معبودوں کے پیدا کردہ وسوسوں کے نتائج میں سے ایک قرار دیا گیا ہے جو لوگوں کو مسلسل گمراہ کرتے اور حق پر کان دھرنے سے باز رکھتے ہیں۔ طفل کشی کا تقاضا کرنے والا معبود بعید ازفہم ہے۔ میرے

خیال میں یہی وہ خوف ہے جو ہمارے ذہن میں دور جاہلیت سے وابستہ دہشت کی وضاحت کرتا ہے اور یہی خوف آج کے دن تک اس زمانے کے متعلق کسی بھی عالمانہ تحقیق کی راہ روکے ہوئے ہے۔ یکم ہجری (622ء) سے پہلے انسانیت کی کوئی تاریخ نہیں۔ جاہلیہ سے جنم لینے والا خوف بجائے خود اس امر کی وضاحت ہے کہ اس دور کی یاددلانے والی ہر شئے کیوں ہمارے اندر زیرسطح پر خوف کی جھرجھری پیدا کرتی ہے جس سے ہم آج تک نجات حاصل نہیں کر سکے۔

صفر وقت، یعنی جس سے قبل کی ہر چیز تاریکی میں ہے، اسی طرح دہشت انگیز ہے جیسے مستقبل۔ مستقبل دور جاہلیہ سے کس درجہ مشابہ ہے جو عرب دنیا پر ہر طرف سے یلغار کا حامل ہے۔ اندرون اور بیرون سے یلغار آسمان سے گرتے بموں کی شکل میں تشدد اور جارحیت جس کی لگام دور جاہلیت کے دیوتاؤں کی طرح کے شیطانی دشمنوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ مذکورہ شیطان اور دور جاہلیہ کے معبود اپنے پاگل پن میں کس درجہ مشابہ ہیں۔ عرب سمجھ نہیں پاتے کہ جنگ خلیج اور حتیٰ کہ اس سے بھی پہلے سے امریکہ ان کے اتنا سخت خلاف کیوں ہے۔ ہر روز گلیوں میں مرتے فلسطینی، خوف و ہراس سے دوچار کرنے کے بعد ہجرت پر مجبور کئے گئے فلسطینی دنیا کی عظیم طاقتوں کے نیک عزائم میں کسی طرح کا جوار بھاٹا نہیں لاتے کہ وہ اس تنازعہ کے حل کے لئے کچھ کر سکیں۔ جاہلیہ ہمارے ماضی میں ہے یا ہمارے مستقبل میں بھی اور ابھی ہمارا واسطہ اس سے پڑنا ہے۔ عرب اخبارات میں یہ سوال اکثر دہرایا جاتا ہے۔ ہم عربوں نے کیا بگاڑا ہے کہ خدا ہم پر اتنا نامہربان ہے کہ ہم اپنے باطن میں شرمندہ کئے جاتے ہیں اور خارج میں ہمیں بمباری اور دھمکیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جنگ خلیج کے دوران ذرائع ابلاغ پر لفظ جاہلیہ چھا گیا اور اس نے اس مسئلے کی نشان دہی اور اہمیت کو بیان کیا جسے حل کرنے کے لئے اسلام اس دنیا میں آیا تھا یعنی کہ جبر وتشدد کا مسئلہ۔ عورت اور طاقت و اقتدار کے درمیان تعلق کو جو خفتہ اور لاشعوری خوف کو بیدار کرتا ہے، سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے خوف اور جاہلیہ کی عدم قبولیت کے درمیان تعلق کو بیان کریں۔ جاہلیہ وہ دور ہے جو ہمارے شعور سے کھسک گیا ہے۔ وہ دور جسے تسلیم نہ کیا جائے دہشت انگیز بن جاتا ہے کیونکہ باطن میں دبا دیئے گئے ظلم و جبر کے تخیلات سے واسطہ پڑنے کا خطرہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

طفل کشی کے حوالے سے ایک بات ہم تیقن سے جانتے ہیں کہ اس رسم میں بچی کو زندہ

دفن کر دینے کی رسم ماں کو ادا کرنا ہوتی تھی۔ ہاں البتہ اس رسم کی ادائیگی کے فیصلے کا بوجھ باپ کے سر ہوتا تھا۔طبری کے مطابق

''ربیعہ اور مدار قبائل میں مرد اپنی بیوی پر شرائط عائد کرتا تھا کہ اسے صرف ایک بیٹی زندہ رکھنے کی اجازت ہے۔ دوسری بیٹی ہونے کی صورت میں اسے دفن کرنا اس کی ذمہ داری ہوگی۔ جسے زندہ دفن کیا جاتا، اس کی پیدائش پر باپ منظر سے باہر ہوجاتا اور جاتے ہوئے دھمکی دے جاتا کہ اس کی واپسی پر بھی بچی زندہ ہوئی تو ان کے درمیان ہر طرح کا تعلق ختم ہو جائے گا۔عورت زمین میں گڑھا کھودتی اور پھر کچھ افراد ڈھونڈتی جو اس فریضے میں اس کی معاونت کریں۔ جب عورت کو اپنا خاوند آتا نظر آتا تو وہ بچی کو گڑھے میں ڈالتی اور اسے مٹی سے اچھی طرح ڈھانپ دیتی۔''(15)

قرآن حکیم کی روشنی میں دیکھا جائے تو جناب رسول ﷺ کی حیات مبارکہ میں صرف لڑکیاں دفن کی جاتی تھیں، لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں، صرف ایک نسل پہلے تک دیوتاؤں کے مطالبے میں لڑکے بھی شامل تھے۔ حضرت محمد ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ یعنی آپ کے والد حضرت عبداللہ قربانی سے بال بال بچے تھے۔ ذرائع کے مطابق عبدالمطلب نے ہبل دیوتا کے سامنے عہد کیا تھا کہ اگر ان کے ہاں دس صحت مند لڑکے پیدا ہوئے اور زندہ بھی رہے تو وہ آخری کو اس پر قربان کر دیں گے۔ اب عبدالمطلب کے آخری بیٹے رسول اللہ کے والد تھے۔ اہل قریش نے عبدالمطلب کو قائل کر لیا کہ وہ بجائے اپنے دسویں بیٹے کو قربان کرنے کے دیوتا کے ساتھ کسی متبادل چیز پر مذاکرات کریں۔ ہاتف کی وساطت سے دیوتا عبداللہ کی قربانی چھوڑنے کے عوض سو اونٹوں کی قربانی پر مان گیا۔(16)

بعض مصنفین نے اس واقعہ کی حقانیت کو چیلنج کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ مورخین کیخیال کی پیداوار ہے جو رسول اللہ کے وجود میں آنے کو ہی ایک معجزہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں کیونکہ اگر عبداللہ قربان کر دیئے جاتے تو رسول اللہ کیونکر جنم لیتے۔ چونکہ حضرت محمد ﷺ اپنی ذات کے ساتھ معجزوں کی وابستگی کو مسترد کرتے تھے چنانچہ مورخین نے ان کی حیات مبارکہ میں تب و تاب پیدا کرنے کی غرض سے اس میں مافوق الفطرت واقعات غیرمحسوس طور پر داخل کر دیئے۔ ایک لمحے کو فرض کرتے ہیں کہ اس نظریے کو پیش کرنے

والے حق پر ہیں یعنی کہ حضرت عبداللہ کے متعلق یہ واقعہ مورخین کا اپنا اور من گھڑت ہے، لیکن اس کے باوجود دیوتا کے حضور قربانی پیش کرنے کی کہانی کا انتخاب اپنی جگہ ایک اہمیت کا حامل ہے۔ نہ تو یہ ہوتا ہے کہ محض کوئی جھوٹ منتخب کر لیا جائے اور نہ ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص تخیل بغیر کسی وجہ کے انتخاب میں دوسرے بہت سوں پر فوقیت پا جائے۔ ہمارے جھوٹوں کے کئی منابع اور ماخذ ہوتے ہیں اور چیز منابع اور ماخذ کی ترجیحات سے زیادہ طے شدہ اور رمزیت بھری کوئی دوسری چیز نہیں ہوتی۔

دور جاہلیت کے متعلق ایک امر یقینی ہے کہ ہم اس کے متعلق بہت کم جانتے ہیں حالانکہ یہ ہماری شناخت کی تعمیر میں نہایت اہم ہے۔ اسلامی تہذیب کی تشکیل میں حصہ لینے والی ہر چیز کی دریافت بہت ضروری ہے۔ تاریخی اور داستانوی اجزاء پر مشتمل ہمارا سارا ماضی اپنی ساری ''سچائیوں'' اور سارے ''جھوٹوں'' سمیت تمام تر بلند اور پست لمحات سمیت.....ایک متحرک اور محیط کل شناخت کی تعمیر کے لئے ناگزیر ہے۔ خصوصاً ان معاملات کو بغور دیکھنے کی ضرورت ہے جن پر خاموش کروا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ لاشعوری رویے کے انہی حصوں پر سے پردہ ہٹانا ضروری ہے۔ یہی وہ حصے ہیں جہاں ہمارے آج کے خدشات اور خوف کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر الوعد جیسی رسوم اور خونخوار دیویوں کے خوف کا مطالعہ اور تجزیہ جو ان قربانیوں کی طالب ہیں' فہمارے لئے ناگزیر ہے۔ ہمیں اپنے بے روزگار اور باہر جا بسنے والے ماہرین آثار قدیمہ کو تحریک دینا ہوگی کہ وہ ہمیں ان معبودوں کی خواہشات کے بارے میں بتائیں- زمین پر تراشے گئے اصنام نہ ہوں بلکہ ستاروں پر بسنے والے صنم بھی ہوں۔ زہرہ دراصل وینس ہی ہے-

عرب کی وینس..... کوکبتہ

قدیم عراق کے مذاہب پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دیوی عزہ، وینس دیوی کی عرب ہم مرتبہ تھی اور دونوں کوکبتہ کہلاتیں جو اپنی اصل میں شامی لفظ تھا۔ (17) آج عرب میں ستارے کے لئے عام ترین لفظ کوکبہ اور قواعد کے اعتبار سے مذکر ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے (مثلاً سورت 12، آیت 4: سورت 24، آیت 35) ۔ ''لسان العرب'' کے مصنف ابن منظور کے مطابق اس کے زمانے میں (پیدائش 630ھ

1232ء) کوکب کو کوکبتون بھی کہتے تھے۔ ابن منظور لکھتا ہے کہ ''ایک سے زیادہ (علماء) کے نزدیک تمام ستاروں میں سے کوکبتون صرف زہرہ (وینس) کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ صرف زہرہ کے لئے مونث کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے، باقی تمام ستاروں کے لئے مذکر کا صیغہ (کوکب) استعمال ہوتا ہے۔''

لگتا ہے کہ دسویں صدی کا عالم المسعودی، جسے بہت سے ''ثقہ'' عرب مورخ اس کی چٹکلہ بازی اور جزئیات نگاری کے غالب رجحان پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، ستاروں کے مظہر عبدیت سے بہت متاثر تھا۔ اس نے ایسے مقدس مانے جانے والے ستاروں پر خاصا مواد اکٹھا کیا ہے۔ اس نے تقدس کی جغرافیائی تشریق پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اس کی کوشش تھی کہ مختلف ستاروں کے مقدس مانے جانے کے مظہر کی شناخت تمدنی احوال کے پس منظر میں کرے۔ اس کی دلچسپی کا خصوصی میدان یہ تھا کہ ستارہ پرستی کے مختلف عقائد یونان اور خصوصاً ہندوستان سے عرب کس طرح آئے۔ یمن غیر معمولی وصول کنندہ ثابت ہوا۔ اس نے ساری دنیا سے آنے والے علم کو ذخیرہ کرنے کی کوشش کی۔ المسعودی نے 336ھ/947ء میں وینس کے لئے وقف ایک مندر کی سیر کا حال بیان کیا ہے۔ یہ معبد سباء میں تھا اور اسے (بعدازاں تیسرے خلیفہ کے درجہ پر فائز ہونے والے) عثمانؓ بن عفّان نے تباہ کیا۔

مسعودی لکھتا ہے کہ ''آج یہ کھنڈرات پر مشتمل ایک بلند ٹیلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یمن کے بادشاہ رات کو مشعلیں لئے اس معبد کی چوٹی پر چڑھتے تو لوگوں کو تین دِن کی مسافت سے ان کی روشنی نظر آتی۔'' (18) المسعودی کے نزدیک اہل سباء وینس کے بت کو ''دانشورانہ سرگرمیوں اور علم نجوم جیسے علوم کے لئے وقف معبدوں میں رکھتے تھے'' جہاں اسے ایک مربع میں بنی مثلث سے ظاہر کیا جاتا۔ مسلم فن تعمیر میں یہ نمونہ بکثرت دیکھنے کو ملتا ہے اور لاہور سے مراکش تک جیومیٹری کے نمونوں والی ٹائیلوں میں یہ نشان بکثرت نظر آتا ہے۔

''اہل سباء کے ہاں اقتدار کے مندر، احتیاج کے مندر اور روح کے مندر بھی موجود تھے۔ یہ دونوں معبد دائروی کی شکل میں نہ تھے۔ زحل کا معبد شش پہلوی، مشتری کا تکونا، عطارد کا مثلث درمثلث، جبکہ زہرہ یعنی وینس کا مندر ایک مربع میں بنی مثلث کا سا تھا۔ چاند کا مندر ہشت پہلو تھا۔ اہل سبا کے نزدیک یہ معبد ایسی علامات اور اسرار کے نمائندہ تھے

جن کا مکمل انکشاف ناممکنات میں سے ہے۔(19)

اب وقت ہے کہ ہم ان اسرار میں پنہاں معنی تلاش کریں۔ اس لئے کہ ہماری شاندار جدیدیت کا انحصار ہمارے لاشعور کی گہری تہوں میں کارفرما عوامل کے ازسرنو تعین پر ہے۔ یمن کے علاقوں میں ماہرین آثار قدیمہ کی کوششوں سے اس علاقے کے قدیم مسالک پر قابل ذکر اعداد و شمار اکٹھے کئے جا چکے ہیں۔ مقدس شمار کئے جانے والے اجسام میں سے وینس یعنی زہرہ پر خاصی معلومات بہم پہنچائی جا چکی ہیں۔

قرآن، خصوصاً چھٹی سورۃ میں قبل اسلام کے عرب میں ستارہ پرستی کا ذکر ملتا ہے۔ خود ہمارے جداعلیٰ ابراہیمؑ عراق کے ستارہ پرست تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے راہ ہدایت دکھائی۔ اس حوالے سے قرآن کی آیات 76، 77، 78، 79 اور 80 خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اور یوں جب ابراہیمؑ پر حق وحی کیا گیا تو عرب میں پہلی بار وحدانیت قائم کی گئی۔ ابراہیمؑ نے ستاروں اور خصوصاً چاند اور سورج کی پوجا کی مذمت کی۔ بعدازاں نوع انسان ابراہیمؑ پر وحی کے ذریعے نازل کیا گیا پیغام حق بھول گئی۔ اللہ تعالیٰ نے گم کردہ راہ لوگوں کی اصلاح کے لئے اپنے نبی اسحاقؑ، یعقوبؑ، نوحؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یوسفؑ، ایوبؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ بھیجے۔ (سورت 6، آیت 85)۔ قرآن میں مذکور دیگر نبی زکریاؑ، یوحناؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ (آیت 86) اور اسماعیلؑ اور لوطؑ (آیت 87) بھی شامل ہیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں حضرت محمد ﷺ پر عربی میں قرآن نازل فرما کر عربوں کو سرفراز کیا، (سورت 41، آیت 3)۔ اس لئے کہ دوسرے انبیاء پر جو کچھ نازل ہوا وہ دوسری زبانوں میں تھا۔

اگرچہ دوسرے اہل کتاب، یعنی یہودیوں اور عیسائیوں نے ابراہیمؑ کے بعد سے وحدانیت اپنائے رکھی اور ستارہ پرستی کی مذمت کی لیکن عربوں نے ان کی پیروی نہ کی۔ حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں اہل عرب کی ستارہ پرستی اپنے عروج پر تھی اور وہ اس سے کنارہ کش ہونے کو تیار نہ تھے۔ قرآن میں بھی ایسے عقائد کے ساتھ ان کی شیفتگی کا ذکر ملتا ہے۔ سورت 41 کی آیت 37 میں اللہ تعالیٰ انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ سورج یا چاند کی بجائے ان کے خالق کی حمد و ثناء کریں۔ اس آیت کی شرح کرتے ہوئے طبریؒ رقم طراز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بتایا کہ ستاروں کی راہیں اسی لئے معین ہیں کہ وہ ارادہ الٰہی کے پابند

ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ نے بھٹکے ہوئے انسانوں کو واپس راہ پر لانے کی سعی کی۔ اور یہ کہ سورج اور چاند اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور اس کے یکتا ہونے کا ثبوت ہیں۔ طبریؒ وضاحت کرتا ہے کہ ''چونکہ سورج اور چاند آسمان پر خود اپنی متعین کردہ راہ پر چلنے پر قادر نہیں ہیں اس لئے ان کی عبادت کسی طور پر نہیں کی جا سکتی۔ یہ خدا کے مقرر کردہ رستوں پر چلنے کے پابند ہیں اور اس لئے اس کی قدرت کے مظہر ہیں۔ ہمیں آیت کا مفہوم درست طور پر سمجھانے کی کوشش میں وہ ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ اللہ کی رضا ہوتی تو ان کی روشنی ہم سے چھپا لیتا اور ہم اندھیرے میں غرق ہو جاتے، نہ رستہ تلاش کر پاتے اور نہ ہی دیکھ سکتے کہ ہمارے قرب و جوار میں کیا ہو رہا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی سرے پر یمن میں ہونے والی سورج پرستی کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔ تب یمن میں ایک عورت، مشہور ملکہ شیبا (سبا) جسے عربی میں بلقیس کہتے ہیں، کی حکومت تھی۔ الشّمس نامی معبود کی پرستش کے لئے وقف بنوتمیم کی ایک خانقاہ بھی مسمار کر دی گئی اور اس دیوتا کے بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔(22) آج بھی ہماری خوبصورت زبان عربی میں سورج کے لئے لفظ ''الشّمس'' مونث ہے۔ قرآن میں ایک اور ستارے کی پرستش کا ذکر بھی ملتا ہے (سورت 53، آیت 59)۔ اس آیت کی شرح میں طبریؒ لکھتا ہے کہ جاہلیہ کے کچھ عرب شیعرہ یا سائرینس کی پوجا کرتے تھے۔(23) اسلام کو اپنی حکمت عملی صرف زمین تک محدود نہیں رکھنا تھی بلکہ اسے کہکشانی پیمانے پر فتح یاب ہونا تھا۔ چنانچہ ہر رات سائریس، زحل، مریخ اور زہرہ کی جو ذرہ بکتر ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتی ہے، اسلام کے مغلوبین میں شامل تھی۔ اسلام نے زہرہ اور پھر اس کے پیچھے پیچھے کائنات میں حرکت کرنے والی ہر چیز کو اپنے مدار میں کھینچ لیا۔

ہمارے ماہرین آثار قدیمہ کو عزہ پر از سر نو تحقیق کرنا ہوگی۔ عزہ جس کی جڑیں ''غب غب'' میں تر زمین میں بہت گہری ہیں۔ اگر ہمیں اپنے عہد قدیم کے خوف کی تفہیم اور ان کی عقلی توضیح کرنا ہے تو ہمیں لازماً اس تاریک دور میں دور تک دیکھنا ہوگا۔ قبل اسلام کے عرب میں فساد اس قدر غالب آ چکا تھا کہ کچھ قبائل تو حرمت کے مہینوں کا بھی احترام نہیں کرتے تھے حالانکہ ان میں شکار کی غرض سے بھی ہلاکت کی ممانعت تھی۔ شہر میں بدنظمی اور قتل و غارت کا عزہ سے تعلق ہمیشہ سے یادداشت میں موجود ہے۔(24) دور حاضر کی طرح،

MashalBooks.org

زمانہ جہالت بھی غربت، قتل و غارت اور انتشار و بدنظمی کے ادوار سے متصف تھا۔ اسلام نے اس چکر کو توڑا اور عربوں کو سکھایا کہ وہ ستاروں اور زماں دونوں کو زیرتصرف لاکر اپنے لئے زمانہ حال تیار کریں۔ لیکن اس سے قبل انہیں عزہ کو تباہ کرنا پڑا تھا۔ یہ تباہی فقط جسمانی اور مادی درجہ کی نہ تھی بلکہ اسے یادداشت سے بھی مٹانا پڑا تھا۔ اہتمام کیا گیا کہ جہاں کہیں اختیار و اقتدار بروئے کار لائے جائیں، مونث موجود نہیں ہونا چاہیے۔ نسوانی اختیار کا زمانہ نقطہ ابتداء یعنی زمانی پیمانے کے صفر پر مردہ ہو چکا تھا۔

مہلک نسوانیت.....صفر زماں کی ابتداء

عزہ کو اس کے اختیارات سے محروم کر دیا گیا، لیکن لات کے برعکس، اس کے سابقہ پجاریوں نے اس کا دفاع نہیں کیا۔ 8 ہجری یعنی 630 عیسوی میں فتح مکہ کے فوراً بعد اس کے معبد کی تباہی قابل دید نظارہ تھی۔ خالد بن ولید نے اس حملے کی قیادت کی تھی۔ وحدانی نظام اس امر کا متقاضی تھا کہ عورت کو اقتدار سے باہر کر دیا جائے کیونکہ اقتدار اور اختیار اب تقدس سے مطابقت اختیار کر گئے تھے۔

چونکہ عورت بھی صاحب ایمان ہے اور اسے شعور و ارادہ سے نوازا گیا ہے اس لئے اسلام میں وہ ہر پہلو سے مرد کے مساوی ہوگی، لیکن تب کے بعد اسے کارہائے سیاست میں نظر نہیں آنا تھا۔ خلیفہ کے محل میں اسے اپنا ایک مقام و مرتبہ حاصل ہوگا.....یعنی حرم کے اندر اور حجاب کے پیچھے..... یعنی ایک ''ممنوعہ مکان''، لیکن عورت کو اس مقام تک رسائی حاصل نہ ہو پائے گی جہاں سے موت کا بندوبست کیا جا سکے یا انتشار پھیلایا جا سکے۔ اسے شہر پر حکومت حاصل نہیں ہوگی، چونکہ عزہ، منات اور لات کے دور میں یہ رستہ خونی ڈھلان تھا۔ بیرونی دنیا کی طرح خلیفہ کا محل بھی دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک مردانہ مکان تھا، جہاں حکمران اپنے اختیارات کو مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کرتا اور ظلم و تعدی سے بھی کام لیتا۔ دوسرا زنانہ مکان تھا، یعنی حرم، جہاں عورتوں کو اختیار و اقتدار سے متعلق ہر شئے سے الگ رکھنے کا اہتمام کیا جاتا۔

لگتا ہے کہ آج کی عرب پارلیمنٹوں نے کل کے خلیفہ کے محل کا کردار سنبھال لیا ہے۔ یہاں فقط مرد بچے مباحثہ میں حصہ لے کر دنیا کے مقدر کا فیصلہ کرتے ہیں جبکہ خاموش اور پس نقاب عورت گھر پر انتظار کرتی ہے۔ گویا فیصلہ ہوا کہ نسوانیت کا اقتدار جاہلیہ، یعنی اسلامی

دورانیہ کے صفر کے ہم خط تصور کیا جائے گا۔ عرب بخوبی جانتے ہیں کہ ''صفر'' کا مطلب ''لاشئے'' نہیں ہوتا۔ انہوں نے ہی اس عدد کو اس کے مقام پر بحال کیا تھا (کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اسے انہوں نے ہندوستان سے لیا تھا جہاں پہلے سے زیر استعمال تھا)۔ صفر کا اپنے مقام پر بحال ہونا بہت بڑی عالمانہ جست تھی اور اسے جدید ریاضی کا نقطہ آغاز خیال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کو حجاب پوش کرنے کا مقصد محض یہ نہیں تھا کہ انہیں غیر مرئی بنا کر مرد عورت کے فرق کا بھول جانا ممکن بنایا جا سکے اور یہ افسانہ تراشا جا سکے کہ اُمّہ متجانس ہونے کے باعث متحد ہے بلکہ عورت کو زیر حجاب لانے کا سب سے بڑا مقصد لوگوں کے اذہان سے وہ سب کچھ محو کرنا تھا جس سے دور جاہلیہ کے عرب بہت اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں علم تھا کہ جسم اور ناقابل فتح جنسیت خودمختار انفرادیت کا وہ قلعہ ہے جو اپنا رقبہ برقرار رکھتا ہے۔ دور جاہلیہ کے عرب اپنے دیوتاؤں کی توہین کر سکتے تھے اور ان کے ساتھ ہتک آمیز اور ہٹ دھرمی بھی کر سکتے تھے، کیونکہ انہیں اپنی فناء کی ہمیشگی پر یقین تھا۔ وہ کسی دوسری دنیا پر یقین نہیں رکھتے تھے اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے خیال کو محض ایک تخیل سمجھتے تھے۔

البعث، یعنی موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا، مسلمانوں کو ابدیت دیتا تھا۔ ابدیت سے نوازنے کا یہ عمل ایک تیر سے دو شکار کرنے کے مترادف تھا۔ اس سے ایک تو فرد ستاروں کی گزرگاہوں سے وابستہ ہو جاتا تھا اور دوسرے عورت کا رحم معدوم ہو جاتا تھا۔ عورت کے رحم سے جنم پانے والے شخص کا فانی ہونا لازم اور ناگزیر ہے اور جاہلیہ کے عرب پدریت کے قانون سے ناآشنا تھے۔ ان کے نظام فکر میں اسے ثانوی حیثیت حاصل تھی، کیونکہ وہ اپنے فانی ہونے پر ایمان رکھتے تھے اور ان کے احاطہ ادراک سے باہر تھا کہ خدا ہڈیوں کے ڈھانچے سے انہیں دوبارہ حیات بخشے گا۔ سورہ 17 کی 49 سے 51 تک کی آیات ان کے انہی شکوک کا جواب ہیں۔

قبل اسلام کے عربوں کا ذہن لافانی ہونے کے تصور کو ناقابل ادراک پاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ صرف اس چیز پر اعتبار کرتے تھے، جسے وہ دیکھ سکتے تھے۔ اسی لئے ان کے لئے انسان عورت سے پیدا ہوتا، مرتا اور خاک ہو جاتا تھا۔ پدریت اسی کے لئے بامعنی ہو سکتی ہے جو خود کو لافانی خیال کرتا ہے، جو خود کو نسلوں کے سلسلے کی ایک کڑی خیال کرتا ہے وہ خود

کو ایسے نظام کا حصہ خیال کر سکتا ہے۔ جس میں اس کا ذاتی انفرادی تجربہ لمحاتی اور فوری گزر جانے والا ہوتا ہے۔ جاہلیہ کے ''بے خبر'' لوگوں کے لئے موت کے بعد دوبارہ زندگی کا تصور ''محض جادو'' (سورت11، آیت 7) تھا اور اسلام کے لئے ان اکل کھرے بدوؤں کو ستاروں سے شناسا کرنے اور انہیں استعمال کرنے کے قابل بنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔(25)

عربوں کو ماوراء میں حیات نو دی جانا تھی؛ مسلمانوں کو بعث کی رعایت حاصل تھی۔ مومن کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا جبکہ عورت کے لئے غیر مرئی ہونے کا قانون بنایا گیا تھا۔ عورتیں لافانیت سے محروم اور ''محدود'' سے متصف کی گئی تھیں جن پر رحموں میں عقل سے عاری اور احمقانہ موت اٹھائے پھرنے کا ٹھپہ لگا دیا گیا تھا۔

پچھلی صدیوں میں چلنے والی کم و بیش سبھی تحریکوں نے خود کو نشاۃ الثانیہ (البعث) کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال صدام حسین ہے جس نے لفظ بعث کو اپنی جماعت کے نام کا جزو بنایا اور یوں اپنے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ اس جدید دور میں عرب دنیا ایک نیا جنم لے سکتی ہے۔ دوسرے وحدانی مذہب کی طرح اسلام نے بھی مومن کا زماں کے ساتھ تعلق بدل کر رکھ دیا ہے۔ اسلام نے مومن کی زندگی کو ستاروں کی حرکت میں بُنا اور اسے ایک نئی معنویت دی ہے۔

اسلام نے مومن کو یہ ابدیت سپر اندازی اور اطاعت کے بدلے میں عطا کی۔ عربوں کو لافانی ہونا تھا۔ حال سے آگے ایک بے کراں ماوراء نے ان کے لئے زماں کی فتح کا ایک آسان راستہ کھول دیا۔ اب انہیں مرنا نہیں تھا، بلکہ جنت ان کی منتظر تھی۔ چونکہ عورت کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ فانی ہوتا ہے، اس لئے جنس کی تعلیم سے عورت اور اس کے رحم کو غائب کرنے کے لئے پدریت کے قانون کو ادارے کی شکل دی گئی۔ اسلام نے عربوں کو دو تحائف دیئے، پدریت کا تصور اور مسلم کیلنڈر یا تقویم۔ یہ دونوں تحفے اپنی اصل میں ایک ہی عطاء یعنی ابدیت کے دو رخ تھے۔ لافانیت کا یہ نیا ضابطہ دراصل عورت کے جسم پر کندہ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد سے عورت کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے اپنے باپ کی ملکیت ہوں گے یعنی اس مرد کے جو رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی صورت میں جنت کا یقینی حق دار بن جاتا ہے۔

MashalBooks.org

اس کے بعد عرب دنیا میں صدر دروازے سے داخل ہوئے۔ انہوں نے دنیا کو نئی تقویم کے تابع فرمان کرتے ہوئے زماں کی ملکیت حاصل کر لی۔ عربوں کے ساتھ معا ملت میں اہل فارس اور اہل روم کو ہجری تقویم استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا۔ وہ تقویم جس کے پہلے سال نے مسیحی تقویم کے چھ سو بائیس سال اور یہودی تقویم کے ہزاروں سال مٹا کر رکھ دیئے۔ زماں اور عورتوں کے مالک مسلمان ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تقویم لئے دنیا کی فتح کو نکل کھڑے ہوئے اور چند صدیوں تک برق رفتاری سے کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ آج وہ اپنے قرضوں اور ان کی بے باقی کا حساب مسیحی تقویم سے کرتے ہیں۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے تو جبراً اڑھائی گئی چادروں تلے، یونیورسٹی ڈگریوں اور مانع حمل گولیوں سے لیس غزہ شہر کو چیلنج کرتی اور اس کے لئے خطرہ بنتی دکھائی دیتی ہیں۔

MashalBooks.org

باب9

حال کا خوف

گیارہویں صدی کے باجبروت فاطمی خلیفہ الحاکم نے ماہر فلکیات ، ماہر بصریات اور ریاضی دان ابن الہیثم کو حکم دیا کہ وہ دریائے نیل کے پانیوں کو قابو میں لانے کے لئے اپنا علم استعمال کرے۔ نیل کے پانیوں کے تباہ کن اتار چڑھاؤ پر قابو پانے کے اس حکم کے پس منظر میں خلیفہ کے اپنے سیاسی مقاصد کارفرما تھے۔ کبھی دریا کا سیلاب تباہیاں لاتا اور کبھی اس کی خشکی قحط پر منتج ہوتی۔ ہر دو صورتوں میں ہنگامے ، فسادات اور سیاسی عدم استحکام خلیفہ کے لئے خطرہ بن جاتا۔ خلیفہ کا حکم انہیں خطرات کے تدارک کی صورت تھی۔ الہیثم نے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کا علم ریاضی مناسب حل دریافت کرنے کے لئے ناکافی ثابت ہوا۔ الحاکم نے اسے اپنے دربار سے نکال دیا اور اس کے ساتھ ہی ابن الہثیم کی زندگی کا ایک دور ختم ہوگیا جس میں وہ اپنی روزی کتابوں کی نقول سے کماتا رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بصریات پر اس کے رسالہ کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا اور مغرب میں کیپلر کے زمانے تک بطور درسی کتاب استعمال کیا جاتا رہا۔

آج کی کسی عرب ریاست کو شاذ ہی ایسا سربراہ میسر ہوگا جو بے روزگاری اور سیاسی عدم استحکام کے مسئلوں کے حل کے لئے اس پیمانے پر ماحولیات سے رجوع کرے- زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ آج کے حکمران گلیوں میں فوج بھجوا کر ہنگامہ کرنے والوں کو جیل میں پھینکوا دیں گے اور جب انہیں کسی ماحولیاتی حادثے کا سامنا ہوگا تو بجائے عرب سائنیس دانوں کی ٹیم سے رجوع کرنے کے وہ کسی امریکی فرم سے معاملہ کریں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے کویت کے امیر نے تیل کے کنوؤں کو دوبارہ قابل استعمال بنانے کے لئے کیا۔

MashalBooks.org

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مناسب تعداد میں عرب اذہان دستیاب نہیں ہیں جنہیں ان کاموں کے لئے بھرتی کیا جا سکے بلکہ مسلم ممالک کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل کوئی تیس ہزار سائنیس دان امریکہ اور یورپ میں مقیم ہیں جہاں بہت سے اپنے اپنے شعبوں میں تحقیق و ترقی کے منصوبوں میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ (American Men and Women of Science) کے تازہ ترین ایڈیشن میں ایسے 754 عرب ماہرین کی فہرست دی گئی ہے جن میں سے 225 طبعیات اور ریاضی دان ہیں، لیکن گیارہویں صدی کے خلیفہ کے برعکس، نہ امیر کویت اور نہ ہی کسی اور عرب ریاست کا سربراہ مسلمانوں کی اس سائنسی فوج سے رابطے اور سیاسی عدم استحکام اور اقتصادی غفلت کے مسائل حل کروانے کا سوچتا ہے۔

الحاکم نے اپنی مقتدرہ مسلم کیلنڈر سے منسلک کر دی جو دراصل سیاسی فیصلہ سازی کو ستاروں کی حرکت اور وقت پر حاکمیت کے ساتھ جوڑنے کا عمل ہے۔ آج مسلمان زمانے سے خارج ہیں' کیونکہ ان سرگرمیوں کی تعداد اور بروز کم ہوتی چلی جا رہی ہے جنہیں مسلم کیلنڈر یا تقویم سے باقاعدہ رکھا جاتا ہے۔ ہوائی سفر کی کمپنیوں کے اوقات کار سے لے کر غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی تک ہر اہم سرگرمی مغربی وقت کے مطابق کی جاتی ہے۔ مسلم حکمران الحاکم کے لئے وقت اور ستاروں کی چال تاریخ ساز اور اہم ترین سوال تھے۔ اس کے عہد حکومت میں قاہرہ دنیا کے عظیم ترین ماہرین فلکیات کا مرکز بن گیا تھا۔ بطور ایک شیعہ مسلمان وہ روشنی اور زندگی کے ساتھ ستاروں کے قریبی تعلق میں پنہاں معنی کو کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت بہتر سمجھتا تھا۔ فاطمیوں نے اپنے شاہی پارچہ جات کو روشنی کے رنگ دیئے۔ ان کی قبائیں اور پگڑیاں سفید اور طلائی ہوتی تھیں۔ ان کے نزدیک فلکیات ایک مشغلہ بھی تھا اور سیاسی فیصلہ سازی کا ایک ذریعہ بھی۔ بالکل عہد جدید کے پرائمری سکول کے مسلم بچے کی طرح الحاکم نے بھی بچپن میں سورہ چودہ کی آیات 32، 33 یاد کیں اور ان کی تلاوت کرتا تھا۔

الحاکم چاند کے ادوار اور ستاروں کی حرکت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی نیند بھول گیا۔ وہ ساری رات ستاروں کے مشاہدے میں محو رہتا۔ استغراق یہاں تک بڑھا کہ وہ دنیا سے بے خبر ہوگیا۔ وہ تیزی سے پاگل پن کی طرف بڑھنے لگا..... پاگل پن کی وہ قسم جو موت پر بہت زیادہ سوچنے والوں کی گھات میں ہوتی ہے' کیونکہ ستاروں سے ہماری محبت

اگر موت کا خوف نہیں تو کیا ہے؟ ہم چلے جاتے ہیں لیکن وہ برقرار رہتے ہیں۔ یہ ان کی پراسرار اور مستقل ٹمٹماہٹ کا پیغام ہے، لیکن یہ ایک اور کہانی ہے۔ جو بات مجھے فی الوقت کرنا ہے وہ یہ ہے کہ عرب زماں سے محروم کر دیئے گئے۔ جنگ خلیج میں ایک حقیقت جو شدید نفسیاتی صدمے کے مترادف تھی، آسمانوں اور ستاروں کا امریکہ کی خدمت میں چلے جانا تھا۔ اسلام کیا ہے اگر یہ ستاروں اور وقت کو، جنہیں مسلمان تقویم میں معنی دیئے گئے ہیں، مسلمانوں کی خدمت میں نہیں لا سکتا۔

تاریخ، تقویم اور تاریخ

یہ نظریہ جو اسلام کے زمانے پر حکمرانی اور انسانی زندگی کو ستاروں کے راستوں کے ساتھ منسلک کرتا ہے، پورے قرآن میں پایا جاتا ہے۔ دسویں سورت کی چھٹی آیت میں یہی بیان ہوتا ہے۔

مسلمان ہونے کا مطلب زماں اور ستاروں کا حاکم ہونا ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس لئے پیدا کیا کہ ہم تاریخ، ''تقویم'' قائم رکھ سکیں۔ لفظ تاریخ کا ''تقویم'' اور تاریخ دونوں کے لئے استعمال ہونا بجائے خود ان معنی کا انکشاف نہیں کرتا۔ تاریخ وہ تقویم ہے جس کی مدد سے ہم نہ صرف خود کو حال میں وقوع دے سکتے ہیں' کئے جانے والے اقدامات کی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں بلکہ گزرے دنوں کو اپنے پیچھے ایسے انداز میں ترتیب و توازن دے سکتے ہیں جو عقلی تقاضوں کے زیادہ قریب ہو۔ تقویم سے تہی لوگوں کی کوئی تاریخ ہوتی ہے نہ ہی حال سیدھے طور پر یوں کہہ لیں کہ وہ لاموجود ہوتے ہیں۔ بلاشبہ عربی میں وقت کے اظہار کے لئے زماں اور دہر جیسے بہت سے الفاظ موجود ہیں لیکن لفظ تقویم زماں اور انسان کی جدوجہد کو ایک دوسرے میں پرو دیتا ہے۔ واقعات وقت میں ہی ہمارے سامنے کھلتے چلے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہیں۔

تاریخ کے تصور سے ہی ہم اسلام کی ایک ایسی جہت کی طرف آتے ہیں جو پوشیدہ اور خفیف ترین لیکن یقیناً نہایت اہم اور فیصلہ کن ہے یعنی فنا پذیر ہونے کی جہت جو موت سے وابستہ اضطراب پیدا کرتی ہے۔ ہم موت سے خوف کھاتے ہیں کیونکہ ہم خوش رہنے اور محبت کرنے کے لئے مزید مہلت کے طالب ہوتے ہیں۔ اگر آج مذہب ایک بار پھر مقبولیت

MashalBooks.org

پکڑ رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ تمام تر موجودہ سائنس ہمارے گزرے دنوں کے ناقابل برداشت اختصار کا کوئی حقیقی حل دریافت کرنے میں ناکام رہی ہے۔ مسلم تقویم نے، جس کا آغاز ہجرت کے پہلے سال سے ہوتا ہے، محض بعث (دوبارہ زندہ کئے جانے) کے تصور سے موت کے خوف کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ یہ تصور، ''جبریہ'' انداز میں ستاروں کی حرکت، رات اور دن کے پھسلتے چلے جانے اور عورت یعنی زندگی کے نقطہ آغاز کو باہم باندھ دیتا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ عورت جو جنم دیتی ہے اور ''یوں'' فرد کے عرصہ زماں کا آغاز کرتی ہے، ہمارے لاشعور کے کسی اتھاہ تاریک گوشے میں کسی نہ کسی طور عرصہ حیات کے خاتمے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے-اس موت کے ساتھ جس کا مذہب مکمل طور پر منکر ہے اور بجائے خود اسے مٹانے پر تلا ہوا ہے؟ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ صنفوں کے اختلاط اور مسلم عوامی مقامات اور گلیوں بازاروں میں عورت کی دراندازی پر تشویش کا تعلق کسی نہ کسی طرح موت.....یعنی وقت.....سے' ہمارے رشتے پر ازسرنو غور کی ضرورت سے بھی ہے؟ جنسی بحران بہرحال موجود ہے جس کا بہترین اظہار حجاب کیمتعلق ہمارا غیر معقول رویہ ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ جنسی بحران درحقیقت وقت کے متعلق ہمارے ادراک کا بحران ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ عورت، جو زندگی اور ناگزیر طور پر موت کو یاد دلاتی ہے مسلمانوں کو حال کی طرف متوجہ کرتی ہو اور حال وقت ہے جسے مسلمان نظرانداز کرتے ہیں؟ مذہب کی مجوزہ ابدیت کا خواب شعور سے موت کے خوف کو نکال دیتا ہے، لیکن اس کی قیمت یوں ادا کرنا پڑتی ہے کہ حال بے وقعت ہوجاتا ہے۔ وقت، جس کا شمار اپنے مداروں میں گرداں ستاروں کے آہنگ اور گزرے کل اور آج سورج اور چاند کے طلوع وغروب سے ہوتا ہے، اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے۔ ہر غروب آفتاب پر ہم تھوڑا سا مر جاتے ہیں۔ مراکش کے سواحل جیسے علاقوں میں، جہاں غروب آفتاب کا دلکش وقوعہ نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، ہر غروب آفتاب پر ہمیں یہ اضطراب انگیز آگہی آ لیتی ہے کہ موت اور ہمارے درمیان ایک دن اور کم ہوگیا ہے۔ غالباً کسی بھی دوسرے مذہب کے مقابلے میں اسلام ستاروں اور وقت کے گزرنے پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔

ستاروں اور ان کے نور سے آگہی کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ بہت سی آیات اجرام فلکی کی دمک پر ملتی ہیں۔ اسی آگہی کا قدرتی نتیجہ ریاضی اور فلکیات کا فروغ تھا۔

MashalBooks.org

ستاروں کی حرکت کی تفہیم اللہ کے تخلیق کردہ عجائبات کی تفہیم ہے۔ اسلام میں عدالتی مقدمات بھگتنے والے کسی گیلی لیعہ کا ذکر نہیں۔ اس لئے کہ عیسائیت کے برعکس، اسلام نے مومنین کو غیر متحرک اور ساکت آسمان پر ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا۔ بقول برٹرینڈ رسل مسیحی کائنات پٹولمی والی تھی جس کے رو سے کائنات کے مرکز میں زمین ساکن ہے جبکہ سورج، چاند، سیارے اور اپنی اپنی جگہ قائم ستاروں کے نظام اس کے گرد گھومتے ہیں۔ (5) دنیا کا یہ تصور اسلام کے تصور سے مختلف ہے۔ قرآن میں پوری کائنات متحرک ہے۔ مطلب یہ کہ' کیتھولک چرچ کے برعکس' ریاضی دانوں اور ماہرین فلکیات کی نظریہ سازی سے مسلم مذہبی مقتدرہ کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیتھولک چرچ کو خدشہ لاحق تھا کہ اگر زمین سورج کے گرد گھومنے لگی تو آسمانی اقتدار منہدم ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ نئی فکر کے علمبرداروں کو دبانے پر مجبور تھا۔

''جب تک تو یہ سمجھا جاتا رہا کہ سورج اور چاند، سیارے اور ساکن ستارے دن میں ایک بار زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں یہ فرض کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا کہ تمام اجرام فلکی کا وجود ہمارے مفاد کا مرہون منت ہے اور ہم خالق کی خاص دلچسپی کے مرکز ہیں، لیکن جب کو پرنیکس اور اس کے بعد آنے والوں نے دنیا کو قائل کر لیا کہ گردش میں دراصل ہم ہیں اور ستاروں کو ہماری زمین سے کوئی دلچسپی نہیں اور مزید یہ کہ ہماری زمین کئی سیاروں کے مقابلے میں چھوٹی ہے تو اس ایمان کو قائم رکھنا روز بروز مشکل ہوتا چلا گیا کہ زمین کا سا غیر اہم اور چھوٹا سا ستارہ انسان کا مسکن ہو سکتا ہے اور خصوصاً اس انسان کا جسے روایتی الٰہیات میں اس درجہ اہمیت دی گئی تھی۔ محض قدری پیمانوں پر غور کرنے سے ہی خیال آنے لگتا تھا کہ ہم بہرحال کائنات کی تخلیق کا مقصد نہیں ہیں۔'' (6)

اسلام کو فلکیات کی دریافتوں سے کوئی خطرہ درپیش نہیں ہو سکتا، کیونکہ اسلام میں ایک متحرک کائنات کا تصور موجود ہے۔ اس کے مسلمات کو خارج سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ اسے نوع انسان کے باطن سے جنم لینے والے خطرات کا سامنا ہے۔ تخیل اور فرد کی ناقابل تکسیر خودمختاری ہی عدم توازن اور تناؤ کو جنم دیتے ہیں۔ اسلام کو اگر کسی گیلی لیو سے خطرہ لاحق ہوا تو وہ بہرحال سائنسدان نہیں بلکہ مضمون نگار ناول نگار، کوئی مسلمان رشدی ہوگا اور نفسیاتی شعبے میں ہونے والی دریافتیں ہی مستقبل میں اکھاڑے کو جنم دیں گی۔ (7) اسلام کو

یقیناً ستاروں سے کوئی خطرہ لاحق نہیں بلکہ ان کی حرکت اور توانائی اسلام کو تقویت دیتی ہے۔ ستاروں اور روشنی کے کردار کو نظرانداز کر دینے کی صورت میں شیعہ اسلام کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔(8)

اسلامی نقطہ نظر سے زمین اور آسمانوں کے خزانے انہی کیلئے ہیں جو زمینی حاکمیت کو ستاروں کی گزرگاہوں سے منسلک کرتے ہیں۔ باقی ہر شئے اسی میں سے نکلتی ہے۔ آج ہمارے سربراہ فلکیات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے جبکہ ماضی کے خلفاء کا یہ پسندیدہ مشغلہ تھا۔ آج آسمان اور ستاروں کے علم پر مغرب کی اجارہ داری ہے۔ ہم احمقوں کی طرح گنگنائے چلے جاتے ہیں۔''او رات، او چاند'' کیونکہ یہ ہمارے ہر عشقیہ گیت میں تقریباً لازماً شامل ہوتا ہے اور اس دوران یہ امر فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ اب رات اور چاند دونوں مصنوعی سیاروں کے آقاؤں کی ملکیت ہیں۔تقویم چند قیمتی تحائف میں سے ایک تھی جو خدا نے قبل اسلام کے ان چند خستہ حال عربوں کو عطا کیا تھا جنہیں ان کے اپنے دور میں بہ نظر حقارت دیکھتے ہوئے قابل توجہ خیال نہ کیا گیا۔ایک خط کے جواب میں جو پیغمبرؐ اسلام نے چھ ہجری کو شاہ ایران کو بھیجا تھا، یہ حقارت دیکھی جا سکتی ہے۔

''حضرت محمد ﷺ نے آٹھ بادشاہوں کو خدا کی جانب آنے کی دعوت دینے کے لئے آٹھ ایلچی بھیجے۔ فارس کے بادشاہ خسرو پرویز نے پیغمبرؐ کا خط پڑھنے کے بعد پھاڑا اور ایلچی کے منہ پر کہتے ہوئے دے مارا کہ'' میری رعایا میں سے ایک شخص مجھے ایسا خط بھیجنے کی جرات کیسے کر سکتا ہے؟'' پھر اس نے یمن میں اپنے گورنر بادسان کو خط لکھا کہ'' اس عرب نے جو اچانک حجاز میں نمودار ہوا ہے، مجھے ایک ناقابل قبول خط بھیجا ہے۔ اپنے دو اعتباری آدمی بھیجو کہ وہ اسے زنجیروں میں جکڑ کر میرے سامنے لائیں تاکہ میں دیکھوں کہ اس کے ساتھ نمٹنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔''

اگر اسلام اور اس کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ اکیسویں صدی کے عین آغاز پر بھی بامعنی ہیں تو اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ رسالہ یعنی قرآن کا پیغام دراصل ان طریقوں کا ایک سلسلہ ہے جن کی مدد سے بین الاقوامی طاقتوں کے استہزا سے بچا جا سکتا ہے۔ زماں پر تصرف سے مراد اہل ایمان کو ایک مدار میں لا کر ان کی زندگیوں کو ستاروں کے رقص سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ یہیں سے ایک دلچسپ سوال ابھرتا ہے کہ کیلنڈر یعنی تقویم کا خیال سب سے پہلے کیسے

آیا تھا، اس کا آغاز 622ء سے ہی کیوں کیا گیا تھا؟

مسلم کیلنڈر یعنی تقویم کی تخلیق

کیلنڈر کا خیال سب سے پہلے کیسے آیا؟ اس سوال کا کوئی متفق علیہ جواب نہیں ملتا۔ ایک روایت کے مطابق خود رسول اللہ نے اپنی مدینہ آمد کے فوراً بعد ایک تاریخ قائم کرنے کی تجویز دی۔ ایک اور روایت کے مطابق خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے دور میں پہلی بار اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

''جب حضرت محمد ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ اس وقت انہوں نے تاریخ قائم کرنے کا حکم دیا۔ کچھ کا کہنا ہے کہ انہوں نے آپؐ کی آمد سے پہلے ہی تاریخ استعمال کرنا شروع کر دی تھی جبکہ بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے حضرت عمر ابن الخطاب نے تاریخ قائم کرنے کا حکم دیا۔''(10)

چونکہ جن کائناتی فکری جہات سے حضرت محمد ﷺ متصف تھے، آپ کے صحابہ نہیں تھے چنانچہ میرے نزدیک نئے شہر میں اپنی آمد پر انہوں نے ہی کیلنڈر قائم کرنے کا حکم صادر فرمایا ہوگا۔ یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ انہوں نے ہی مدینہ آمد کے مختصر عرصے کے بعد قبلہ کا رخ بدلنے کا حکم دیا تھا۔ کئی ماہ تک مسلمان یروشلم کی طرف سجدہ ریز ہوتے رہے تھے، لیکن جب مدینہ کی یہودی آبادی نے دشمنی کا رویہ اختیار کیا تو پیغمبرؐ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے رخ بدل کر مکہ کی طرف کرنے کا حکم نازل کیا گیا۔ حضرت عمرؓ سے منسوب ایک واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تیزی سے بدلتے رویوں کے حامل معاشرے کے گرداب میں رہنا کس نوعیت کا تجربہ ہوگا۔

''بقول الشعبی ابوموسیٰ الاشعری نے حضرت عمرؓ کو لکھا: ''مجھے آپ کے کچھ خطوط ملے جن پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو مشاورت کے لئے جمع کیا۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ تاریخ بدلنے کا آغاز پیغمبرؐ پر پہلی وحی کے نزول کے وقت سے ہونا چاہیے۔ کچھ دوسروں کے خیال میں پیغمبرؐ کی ہجرت کو نقطہ آغاز بنانا زیادہ بہتر تھا۔ بالآخر عمرؓ نے ہجرت کو نقطہ آغاز کے طور پر اختیار کیا۔ اس لئے کہ ان کے خیال میں ''یہی وہ لمحہ تھا جب باطل اور حق کے درمیان صحیح معنوں میں انقطاع ہوا۔''(11)

MashalBooks.org

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ جناب رسول ﷺ کے وصال مبارک کے تیرہ برس بعد خلیفہ بنے۔ ان کے عمال میں ابوموسیٰ اشعری پہلے مسلمان گورنر تھے جنہیں مفتوحہ علاقوں کے منتظم کے طور پر بھیجا گیا۔ دو لمحات ماضی کے ساتھ انقطاع اور ایک نیا عہد شروع ہونے کے حوالے سے اہم تھے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جب اللہ نے حضرت محمد ﷺ پر آپ کے نبی ہونے کی وحی نازل کی اور دوسرا وہ، جب تیرہ برس بعد ہجرت ہوئی۔ حضرت محمد ﷺ ترپن برس کے تھے جب انہوں نے مکہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ شہر کے سرکردہ افراد نے محسوس کر لیا تھا کہ آپ مفاہمت پر تیار نہیں ہوں گے۔ شہر کی فضا معاندانہ اور متشددانہ ہوگئی۔ اگر کیلنڈر سازی میں نقطہ آغاز کے حوالے سے دوسرے موقع کا انتخاب درست ہے تو یقیناً یہ آغاز دنیا کے خزائن تک مسلمانوں کی رسائی سے ہم آہنگ تھا۔ اس حوالے سے ایک اور واقعہ بھی موجود ہے جو اس امر پر دال ہے کہ حضرت عمرؓ تاریخوں کو سمجھنے تک نہیں تھے۔ یہ امر میرے لئے بہرحال حیرت انگیز ہے۔

ابن سیرین کے بقول ایک شخص نے کھڑے ہوکر مطالبہ کیا کہ عمر ابن الخطاب تاریخیں ڈالا کریں۔ لگتا ہے کہ عمرؓ نے پوچھا ہوگا کہ ''تاریخیں ڈالنے سے کیا مراد ہے؟'' انہیں جواب دیا گیا، ''یہ کام عجمی کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ فلاں فلاں سال کے فلاں فلاں مہینے میں۔'' اس پر عمر ابن الخطاب نے کہا، ''بہت خوب۔'' پھر ان کے درمیان آئندہ تاریخیں ڈالنے کا فیصلہ ہوا۔ پھر سوال اٹھا کہ ہم اس عمل کا آغاز کہاں سے کریں۔ کچھ نے کہا کہ اس لمحے سے جب جناب رسول اللہ پر وحی نازل ہوئی جبکہ بعض کے خیال میں جناب کے وصال سے ابتداء ہونی چاہیے تھی لیکن کچھ اور ایسے بھی تھے جن کی تجویز تھی کہ ہجرت کو نقطہ آغاز ہونا چاہیے۔''(12)

یہاں ہم سنتے ہیں کہ جناب عمرؓ کو علم ہی نہ تھا کہ تاریخ ڈالنا کیا ہوتا ہے؟ لیکن ہمیں اس معاملے پر قدرے احتیاط سے غور وفکر کرنا ہوگا۔ عمرؓ کوئی وحشی بدو نہیں تھے بلکہ شہر کی تاجر اشرافیہ کے معزز رکن تھے۔ جب آپ لفظ تاجر استعمال کرتے ہیں تو اس دور میں بھی تاریخ سے مرصع اور باقاعدہ تصدیق شدہ دستاویزات کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ عربوں کو نہ صرف قرض کے معاملات کے انتظام و انصرام میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل تھی بلکہ مکہ اس دور کی عظیم تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ حضرت محمد ﷺ کے صحابہ کے خون میں تجارت

رچی بسی تھی۔ یہ دیکھ کر انصار حیران رہ گئے کہ اسلام کی سربلندی کے لئے جنگ کرنے کا وقت انہیں ہمیشہ دستیاب ہوتا جبکہ آرام وسکون کے نایاب لمحات میں وہ تجارت کرنے کے لئے بھی وقت نکال لیتے۔ اسی لئے یہ بعداز قیاس ہے کہ حضرت عمرؓ کو علم نہ ہو کہ تاریخ ثبت کرنا کیا ہوتا ہے؟ یہ زیادہ قابل یقین معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خلافت تک ایک نئی انتظامیہ کے دروبست کے اظہار کے طور پر ایک نیا کیلنڈر باقاعدہ اور سرکاری سطح پر استعمال میں آ چکا ہو؛ وہ نئی انتظامیہ جسے بہت جلد ایک سلطنت کی شکل اختیار کرنا تھا۔

اس پوری کہانی کی جزئیات میں سے ایک جزو مسلم دنیا کو درپیش موجودہ انتشار کے حوالے سے آج بھی اہم ہے۔ اوپر بیان کئے گئے اجلاس کے دوران میں جب حضرت عمرؓ ایک نئی تقویم (کیلنڈر) کے قیام پر غور وفکر میں مصروف تھے، ان کے ساتھیوں میں سے کچھ نے اہل فارس یا روم کا کیلنڈر استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔

''جب عمرؓ نے کہا، ''لوگوں کے لئے کچھ ڈھونڈو جسے وہ حوالے کے طور پر استعمال کر سکیں۔'' کچھ نے کہا کہ ''تاریخیں رومیوں کے انداز میں کیوں نہ ڈال لی جائیں۔'' کچھ اور نے کہا کہ ''اہل فارس کی تقویم کیوں اختیار نہ کر لی جائے؟'' لوگوں کی اکثریت نے ہجرت کو نقطہ آغاز کے طور پر اختیار کیا اور انہوں نے وہ سال گنے جو جناب محمد ﷺ نے مدینہ میں بسر کئے تھے۔''

اہل فارس یا روم سے کیلنڈر مستعار لینے والے یقیناً حضرت محمد ﷺ کے تشکیل کردہ نئے نظام کی فہم نہیں رکھتے تھے۔ اس کی بنیاد ہی ہمسایہ طاقتوں سے خودمختاری پر تھی۔ ہمیں اس واقعے سے احساس ہوتا ہے کہ ہمارا دوسروں پر انحصار اس درجہ بڑھ چکا ہے کہ مغربی کیلنڈر استعمال کرنا کسی طرح بھی ''غیرفطری'' نہیں لگتا۔

زمانہ قبل اسلام میں ایسا کوئی کیلنڈر نہیں تھا جس پر اہل عرب متفق ہوتے۔ طبری کے مطابق ''ہر قبیلہ اپنی ایک الگ تاریخ (تقویم، کیلنڈر) قائم کرتا جس کا آغاز قبیلہ کے لئے کسی اہم واقعہ مثلاً کسی بڑی تباہی، قحط یا جنگ وغیرہ سے ہوتا تھا۔(14) ہر قبیلے کی اپنی حسب منشاء ایک تاریخ (تقویم) ہونے سے قبیلوں اور شہروں کے مابین ابلاغ اور تبادلہ کے وقت پیش آنے والی مشکلات کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے قبیلہ قریش، جس کے پاس مکہ کا نظم ونسق تھا، کی اپنی ایک تاریخ (تقویم) تھی جس کا آغاز عام الفیل (ہاتھیوں کے

سال) میں ہونے والے واقعات سے ہوتا تھا اور واقعات کو تاریخ اس سال کے حوالے سے دی جاتی تھی۔ یہ وہ سال تھا جب ان مرعوب کن جانوروں پر سوار حبشہ کی فوج نے 570 عیسوی، یعنی جناب رسولؐ کی ولادت کے سال مکہ پر قبضہ کر لیا تھا۔(15) فیصلہ کیا گیا کہ نئی تقویم کا آغاز اس سال سے کیا جائے کیونکہ مکہ جیسے علاقے اور آب و ہوا میں ہاتھیوں کا دیکھا جانا یقیناً معمولی واقعہ نہیں تھا اور وقت کی شاہراہ پر فی الواقعی ایک نشان بننے کی اہلیت رکھتا تھا۔

وقت کے حساب کتاب کے حوالے سے عربوں میں کسی متفقہ اور ایک طریقے کے فقدان کی عکاس وہ بدنظمی ہے جو عجیب و دلچسپ مہینے نسی (Nasi) کے وجود میں آنے سے پیدا ہوئی۔ طبری کے مطابق عربوں نے اس ماہ کو نسی (Nasi) کا نام دیا جو شکار یا چھاپہ مارنے کی مہمات کے لئے مخصوص کر دیا گیا جبکہ، دوسری طرف، روایت کی رو سے یہ مہینہ شہر حرام تھا یعنی وہ مہینہ جس میں جنگ و جدل اور خون بہانا منع تھا۔(16) المسعودی کے نزدیک اس مہینے کا ایک اور وظیفہ تھا۔ ہر تین سال کے بعد کم دنوں والے قمری مہینوں کا ازالہ کرنے کے لئے اسے بطور لیپ کے مہینے سال میں داخل کیا جاتا تھا۔ اپنے طرز بیان کے مطابق نسی کی اصلیت بتانے سے پہلے وہ ہمیں متعلقہ زمانی سیاق و سباق سے متعارف کرواتا ہے۔

''محرم سے شروع ہونے والے قمری مہینے میں 354 دن ہوتے ہیں، یعنی شمسی سال سے سوا گیارہ دن کم۔ عرب سال نو روز کی تقریب کے بغیر ختم ہو جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے عرب ہر تین سال کے بعد ایک ماہ کا اضافہ کر دیا کرتے تھے۔ وہ اس مہینے کو نسی یعنی التواء کا نام رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ 9 کی آیت 37 میں اس رواج کی مذمت کی ''(ایک مقدس مہینے کا) التوا صرف کفر کی زیادتی ہے۔'' عربوں نے اپنے لئے ایک باقاعدہ نظام متعارف کروا رکھا تھا۔ وہ اپنے مہینوں کا آغاز محرم سے کرتے، جو سال کا پہلا مہینہ ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں جنگ اور ہر طرح کا شکار ممنوع ہوتا تھا۔''(17)

ان توضیحات کا باہم متضاد ہونا بعید از قیاس نہیں اور خصوصاً جب سیاسی فیصلہ سازی کا عمل پراگندگی کا شکار ہو جائے کہ شکار اور چھاپوں کے شائق قبائلی شہر الحرام کے تعطل کا بھی احترام نہ کریں اور تین سال گزرنے پر نسی کا مہینہ داخل کرنے سے انکار کر دیں۔

اسلام نے غیر متحد اور منتشر لوگوں کو وقت پر گرفت اور ستاروں اور ان کے گھروں یعنی

برجوں سے استفارے کا طریقہ دیا۔ آسمانوں کی حاکمیت کے بغیر زمین پر غلبہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر صدام حسین نے طبری کا اپنی تاریخ کے لئے لکھا ہوا دیباچہ از سرنو پڑھا ہوتا تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا ہوتا الزمان، یعنی کہ گھنٹوں کے تواتر جیسے ابتدائی معنوں میں بھی وقت واشنگٹن ڈی سی کی ملکیت ہے۔ حربی معاملات میں میرے جتنی محدود معلومات کا حامل شخص بھی فوراً یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ اگر آپ ''تیل مغرب سے چھین کر اسے عربوں اور مسلمانوں کی فلاح کے لئے استعمال کرنا'' چاہتے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے اپنی حکمت عملی آسمانوں سے وابستہ کرنا ہوگی تا کہ مصنوعی اور اصلی، ستاروں کی نگرانی سے استفادہ کر سکیں جو ناگزیر بھی ہے۔ یہ معاملہ ہمارے پیغمبرؐ پر عیاں تھا جنہوں نے چالیس برس کا ہونے تک قوت اور اس کے حصول کے طریقوں پر غور وفکر کیا۔ آپ جوں ہی گھنٹے، دن یا رات کے تعین پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، فوراً اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ستاروں سے معاونت لئے بغیر مسلمان زیادہ دور تک نہیں جا سکتے۔ ستارے آسمان پر موجود ہی اس لئے ہیں کہ ہم اپنے مقام کا تعین اور اپنی تقویم مرتب کر سکیں۔ طبری سورت 17 کی آیت12 کی تفسیر ان ہی اصطلاحات میں کرتا ہے۔

''اور ہم نے دو عجوبے رات اور دن مقرر کر دیئے۔ اور پھر ہم نے رات کا عجوبہ تاریک کر دیا اور ہم نے دن کا عجوبہ نظارہ خیز بنا دیا تا کہ تم اپنے مالک کے نازل کردہ انعام تلاش کر سکو اور تمہیں سالوں کا حساب لگانا اور انہیں شمار کرنا آ جائے اور ہم نے جو کچھ بھی بیان کیا ہے، غیر مبہم انداز میں بیان کیا ہے۔''

عظیم ماہرین حرب اپنی افواج کی کامیابی یقینی بنانے کے لئے بظاہر معمولی معاملات پر بھی گہری توجہ دیتے تھے۔ وہ کنوؤں کے محل وقوع، سامان رسد کی فراہمی کے انتظامات اور آمدورفت کے راستوں کو خاص طور پر ذہن میں رکھتے تھے، لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ تمام امور کی انجام دہی میں نہایت احتیاط سے بنائے گئے وقتی جدول پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ صدام حسین جزئیات میں سے ایک لیکن نہایت اہم جزو کو نظرانداز کر گئے اور یوں ان کی افواج کی کامیابی کا معاملہ مشکوک ہوگیا۔ وہ مربوط عالمی وقت (Time) کے ساتھ منسلک رہے۔ اس وقت کے ساتھ جس پر ان کے دشمنوں کا استحقاق تھا ایسے وقت کے ساتھ جو ان پر عیاں نہ تھا اور ان کے دشمنوں نے دوران جنگ ایک قدم بھی

ستاروں کی مشاورت کے بغیر نہیں اٹھایا۔

مربوط عالمگیر وقت

اگرچہ طبری 224ھ/838ء میں صوبہ طبرستان میں پیدا ہوا لیکن صدام حسین کی طرح اس نے بھی زندگی کا بیشتر حصہ بغداد میں گزارا جہاں وہ الٰہیات اور اصول قانون کی تدریس سے وابستہ تھا۔ اس کے عہد حیات میں امت سے منسلک کسی بھی کام کی انجام دہی میں، خواہ وہ تاریخ نویسی ہو یا نئے علاقوں کی فتوحات' وقت کی جدول طے کرنا پہلا قدم ہوتا تھا۔ اگر صدام حسین نے وہی کیا ہوتا جو ہزار برس پہلے طبری نے کیا تھا اور اپنے اقدامات کے حوالے سے ایک وقتی نظام اپنی مہم شروع کرنے سے پہلے متعین کر لیا ہوتا تو وہ بھی بالکل سامنے کی اور عیاں حقیقت کو سمجھ لیتا کہ اس کا زمانی نظام مربوط عالمگیر وقت ہے، جس پر مغربی مصنوعی سیاروں کا حکم چلتا ہے۔

''مربوط عالمی وقت سائنسی اور شہری سرگرمیوں کی عالمی بنیاد ہے۔ یہ وقت نہایت صحت سے مربوط کئے گئے ریڈیائی سگنلوں میں نشر کیا جاتا ہے۔ یہی ریڈیو سگنل تمام سرکاری اور نجی گھڑیوں میں وقت کی مطابقت کی بنیاد ہیں۔ یہ وقت ایٹمی گھڑیوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی اکائی بھی ایٹمی سیکنڈ (18) ہے۔

دنیا بھر میں صرف اہل مغرب اور جاپانیوں کو ایسا نظام قائم کرنے کے لئے درکار ٹیکنالوجی پر عبور حاصل ہے۔ باہم منسلک مصنوعی سیاروں کا ایک جال ہے جس کی وساطت سے دنیا میں وقت کو ہم آہنگ رکھا جاتا ہے۔ ژاک اٹالی (Jacques Attali) کے الفاظ میں، ''یہی انتہا درجے کی صحت اور درستگی ایک متجانس وقت کی تنظیم کرتی ہے اسی لئے پورا سیارہ ایک ہی وقت کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔''

جنگ خلیج یعنی بغداد کی ایسے بموں سے تباہی جن کی فاصلے سے رہنمائی کی گئی اور ان کی کارکردگی پر نظر رکھی گئی' ہم عربوں اور مسلمانوں کے لئے نہایت المناک تھی۔ اس لئے کہ اس جنگ نے ہمیں مربوط وقت کے متعلق اذیت ناک شعور دیا۔ ہم نے وقار کی بچی کھچی رمق کو برقرار رکھنے کے لئے اس وقت کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ ہمیں یہ تسلیم نہ کرنا پڑے کہ ہم ایسے وقت میں موجود ہیں جو ہمارا اپنا نہیں۔ ہم فقط اس وقت میں وجود برقرار رکھے

ہوئے ہیں جس کی تعریف مغرب کے ہاتھ میں ہے۔ ہولناک ترین نو آبادیاتی نظام وہ ہے جو آپ کے وقت میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں زخم خوردگی کا شکار آپ کا وقار ہوتا ہے اور پیدا ہونے والی پراگندگی و انتشار نچلی سطح تک اتر جاتا ہے۔ جاپانیوں نے دو سال کے دوران خصوصی طور پر مسلمانوں کے لئے ڈیزائن کردہ دس لاکھ ٹائم پیس بیچے۔ کبیر (عظیم) کے نام سے بیچے گئے یہ ٹائم پیس نماز کے اوقات پر دن میں پانچ بار الارم گھنٹی دیتے ہیں۔ ایک ماڈل ، جو نسبتاً مہنگا ہے، ہر گھنٹے کے بعد قرآن کی مختلف آیت سنواتا ہے۔'' (20)

اس کلاک کبیر سے زیادہ بہتر طریقہ سے عربوں کے زوال کو کوئی اور چیز ظاہر نہیں کرسکتی اگرچہ یہ کلاک صرف صاحب استطاعت لوگوں یعنی تیل کی دولت میں حصہ بٹانے والوں نے خریدے۔ یہ کلاک سلیکان کی ایک چپ ہے جس پر اپنی تعریف کے لحاظ سے دوری، مقدس کیلنڈر کندہ ہے۔ ٹیکنالوجی کی فتح کا علمبردار یہ آلہ کائنات پر مقدس انداز نظر کا منکر اور الیکٹرانی عہد کی فتح کا دعویدار ہے جہاں منافع ہی حرف اول و آخر ہے ۔ یہ عہد سائنسی انسان کا ہے جو مدت سے خوفزدہ نہیں رہا اور اپنی ساری قوت اپنے فانی ہونے سے ہی اخذ کرتا ہے۔ وہ یوں کہ عرصہ گزرا اس نے اپنے تمام دیوتا دفن کر دیئے اور زمین اور ستاروں کو ان اعداد میں تبدیل کر دیا ہے، جن کی پروسیسنگ مصنوعی سیارے کرتے ہیں۔

ہم عرب اور مسلمان اس عہد سے خارج ہیں اور محض آلات کے صارف بن کر رہ گئے ہیں۔ مسلم عوام اور دانشوروں کے عراق کی حمایت میں گھروں سے نکل آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ یہ عمل اپنی اصل میں صدام کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے سے زیادہ کبیر کلاکوں اور دوسرے آلات کے خریداروں کی مذمت تھا جو تیل کی آمدن کو سائنسی ترقی میں لگانے کے بجائے ضائع کر دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ احتجاج محرومی کا شکار نوجوان طبقے کی طرف سے ہوا اور جب آپ عرب نوجوانوں کی بات کرتے ہیں تو دراصل آپ ایسے آبادیاتی مظہر کی بات کر رہے ہیں جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ''صفر سے 24 سال عمر کا گروہ باقی تمام دنیا کے مقابلے میں دوگنا سالانہ شرح سے بڑھ رہا ہے۔'' سال 2000 میں کل عرب آبادی کا اکسٹھ فیصد عمر کے اسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا جبکہ باقی ساری دنیا میں عمر کے اس گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی شرح 48 فیصد ہے۔(21)

MashalBooks.org

عربوں کی یہ نسل بذریعہ ٹیلی ویژن مغرب میں وقوع پذیر ہونے والی ہر چیز سے وابستہ ہے کیونکہ سیٹلائیٹ پروجیکٹ جسے عرب دنیا کے لئے ''آزاد ہوتی ہوئی کمیونٹی کے لئے بندشوں سے آزاد ٹیلی ویژن'' بننا تھا، لاحصل رہا۔ (22) عرب سیٹ(Arabsat) ناکام رہا کیوں عرب حکومتیں ایسا ٹیلی ویژن نہیں چاہتی تھیں جو روشن خیالی پیدا کرے اور روایات کی بندشیں توڑے۔ ان حکومتوں کا خیال تھا کہ معاہدوں پر دستخط اور معاوضوں کی ادائیگی کے بعد ان کے ہاتھ اپنی عظمت کی تشہیر کا ایک اور ذریعہ لگے گا پہلے سے موجود نیشنل ٹیلی ویژن براڈ کاسٹ جیسا ایک موثر ذریعہ۔ مذکورہ بالا کیبر سنڈ روم ایک ہی مرض کا مجموعہ علامات ہے لیکن اس کی گرفت صرف ان چند لوگوں پر ہے جو فیصلہ سازی اور تیل کی دولت کو اپنے مفادات میں استعمال کرتے ہیں، لیکن وہ لوگ جو عربوں کو احمق خیال کرتے ہیں، ایک بات بھول جاتے ہیں کہ تاریخی یادداشت کے حامل عوام کو ''سدھانا'' بہت مشکل ہوتا ہے۔ شہر کا دستکار، خواندہ ہو یا ناخواندہ ہارون الرشید کے اس تحفے کے متعلق جانتا ہے جو اس نے شارلیمان کو بھجوایا تھا۔ سائنسی ترقی کا وہ عظیم سرپرست اپنے معاصر ہم مرتبہ افراد کو اکثر اس طرح کے عجائبات ونوادرات بھجوایا کرتا تھا۔

''سال 807ء میں شارلیمان نے بغداد سے ہارون الرشید کا بھیجا ایک تحفہ وصول کیا۔ یہ تحفہ پیتل کا، متحرک شبیہوں سے مرصع ایک آبی گھڑیال تھا۔ وقائع ایگن ہارڈ (Annals of Eginhard) کے مطابق یہ غزہ کے ہرکولیس گھڑیال کا سا تھا۔ سترہویں صدی کی ایک کتاب میں اس کی تفصیلات یوں ملتی ہیں، ''ایک مشین جو آبی طاقت سے چلتی تھی، گھنٹوں کی گنتی کے دوران گھنٹوں کے برابر پیتل کے گیند گھنٹی پر گراتی تھی۔ دوپہر کو بارہ کھڑکیوں سے بارہ گھڑ سوار نکلتے اور کھڑکیاں پھر سے بند ہو جاتیں۔ بہت بعد کے زمانے کا ہونے کے باوجود یہ بیان قابل اعتبار ہے کیونکہ بدیع الزمانی بالرسا التلزاری کی تصنیف (Book of Knowledge of Ingeneous Mechanical Devices) (نویں صدی) سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت پوری عرب دنیا ان گھڑیالوں کو بخوبی جانتی تھی۔(23)

یہ یادداشت ہمیں زوال و انہدام سے بچاتی ہے کیونکہ یہ ہمیں ایسے تاریخی اعداد وشمار مہیا کرتی ہے جو حال کو متواتر ایک تقابلی منظر فراہم کرتے ہیں۔ ہارون الرشید کی توصیف ہمارے آج کے حکمرانوں کو ہمارے احساس محرومی کا مرکز بناتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ذی

وقار عباسی خلیفہ جمہوریت کا سرگرم علمبردار تھا بلکہ اس کے برعکس وہ ایک کامیاب ترین مطلق العنانیت کا معمار تھا۔ لیکن وہ لوگوں سے لئے گئے فیصلہ سازی کے اختیار کو عظیم ترین سائنسی اور اقتصادی منصوبوں کی تکمیل میں استعمال کرتا تھا۔ جدید مطلق العنانیت لوگوں سے فیصلہ سازی کا اختیار لے کر اسے جاپان سے کبیر کی خریداری میں استعمال کرتی ہے۔

اگرچہ مسلم حکمرانوں نے مسلم کیلنڈر چھوڑ دیا ہے لیکن اسے آج بھی یادگاری اور خودشناسی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مراکش آنے والے سیاحوں کو یقیناً تجربہ ہوگا کہ کسی جمعہ کو وہ خریداری کے لئے نکلیں تو انہیں تمام دکانیں بند ملیں، حالانکہ نجی اور سرکاری دونوں شعبوں میں چھٹی اتوار کے روز ہوتی ہے- معاشرے کا بڑا حصہ، لاکھوں لوگ جنہیں جدیدیت تک رسائی نہیں ملی اور جنہیں بغیر کسی معاہدے کے ایسی ملازمتوں پر رکھا گیا ہے جہاں نہ تو کم از کم اجرت موجود ہے اور نہ ہی سماجی بہبود کا کوئی تصور، تاحال مقدس پرانے کیلنڈر سے چمٹے ہوئے ہیں۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مراکش میں طبقاتی کشمکش کے مظاہر میں سے ایک کیلنڈر کا استعمال بھی ہے۔ غریب ترین طبقہ مسلم کیلنڈر کے مطابق زندگی گزارتا ہے جبکہ امیر ترین مغربی کیلنڈر کا اتباع کرتا ہے۔ بعض اوقات کیلنڈر متصادم بھی ہو جاتے ہیں۔ رباط کی ٹیکسٹائل فیکٹری کا مالدار ڈائریکٹر اپنے جرمن گاہک کے ساتھ مال کی فراہمی کی طے شدہ تاریخ کا پاس کرنے میں ناکام رہتا ہے کیونکہ اس کے کم تنخواہ پر کام کرنے والے کارکن، جنہیں بیمہ تک کی سہولتیں میسر نہیں، عید میلاد النبی یا کسی دوسرے مذہبی تہوار میں شرکت کے لئے ان دنوں چھٹی کر لیتا ہے جو اس جرمن گاہک کے برلن میں واقع دفتر کے کیلنڈر میں مذکور نہیں۔ اگر کارکن ایک ہفتہ کی چھٹی پر جاتے ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ ساتویں دن کام پر موجود ہوں۔ چھٹیوں سے لطف اندوزی بڑھنے اور کسی ولی کے مزار پر گانے یا دھمال ڈالنے کا پروگرام طویل بھی ہو سکتا ہے اور اس کا انحصار اجتماعی سرخوشی اور پروگرام پر ہے۔

کیلنڈر پر ہونے والی کشاکش اقوام کے مابین کشاکش بھی ہے- اگرچہ کچھ نوجوان بنیاد پرستی اختیار کرتے، داڑھی رکھتے اور مساجد میں وقت گزارتے ہیں لیکن بہت سے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر ہٹ پریڈ گیت گاتے ہیں اور ان کا ہیرو ہارون الرشید کی بجائے کوجیک (Kojak) اور ڈیلس (Dallas) ہے- ان کیلئے ٹیلی ویژن نے پہلے سے احساس محرومی کا بندوبست کر رکھا ہے۔ مسلم کیلنڈر حوالے کا خلجان انگیز نقطہ بنتا جا رہا ہے۔ ایک المیہ یہ بھی

ہے کہ ہمارا کیلنڈر روز بروز فقط مذہبی تہواروں کی اور رسوم کی تواریخ بتانے تک محدود ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بیشتر عرب ممالک میں اسلامی سال کے آغاز یعنی یکم محرم کو نوجوان بہت جلد سو جاتے ہیں جبکہ اکتیس دسمبر کی رات فجر سے پہلے سونا محال ہوتا ہے۔ گاڑیوں کے ہارن اور نوجوانوں کے گیت کان پھاڑے ڈالتے ہیں جبکہ مقامی یا بین الاقوامی ریڈیو سے نشر ہونے والے تازہ ترین امریکی گیت اس پر مستزاد ہیں۔

ہماری پوری زندگی.....اشیاء کی تیاری اور خدمات کی فراہمی، سیاسی اور اقتصادی فیصلہ سازی، لوگوں اور خیالات کی نقل و حرکت، بینک اورایئرپورٹ .....مربوط وقت (Coordinated Time) پر چلتی ہے جبکہ ''عالمی'' خوش کلامی عموماً چھوڑ دی جاتی ہے۔ چونکہ ہم مغربی کیلنڈر کے مطابق وقت گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہمارا کیلنڈر فقط نمازوں کے اوقات بتانے تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ اور یہ ابھی تک نسبتاً غریب اہل ایمان کی زندگی کو ستاروں کے رستوں سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ بصورت دیگر ان کی پانچ نمازوں کے اوقات آسمان پر سورج کی پانچ منازل سے منسوب کیوں ہوتے؟ نمازیں اہل ایمان کو ایک مدار میں رکھنے کا طریقہ ہیں۔ وہ یوں کہ ہم اپنی نمازوں کے سلسلے میں متواتر آسمان پر سورج کی چال پر دھیان رکھتے ہیں تاکہ عبادت وقت پر کرسکیں۔ پہلی نماز فجر (طلوع)، دوسری ظہر (نصف النہار)، تیسری عصر، (سورج ڈھلنے کی ابتداء) ہے جبکہ چوتھی مغرب (غروب آفتاب) اور پانچویں عشاء (رات کا اعلان) ہے۔

اب ہماری زندگی مقدس کیلنڈر کے آہنگ کی مطابقت میں نہیں گزرتی لیکن ہم وہ تکنیکی بنیاد بنانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے جو کائنات (کون) تک رسائی کی ضمانت بن سکے اور یہی طاقت کے کھیل کی سب سے بڑی چال ہے۔ اپنے مسلم کیلنڈر سے بے گانہ ہوکر ہم الیکٹرانی کیلنڈر یعنی مربوط وقت سے اور زیادہ کٹ گئے ہیں۔ اس دوہرے انقطاع کے باعث ہمارے دن ٹمٹماہٹ تک محدود ہوگئے ہیں جو بصورت دیگر جگمگا رہے ہوتے۔ کتنی ہی بار میرے نوجوان طالب علم مجھ سے پوچھتے ہیں: ''یا استاذ، ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ ہمارا کام اس درجہ بے وقعت کیوں ہے اور ہماری زندگی اتنی بے معنی کیوں ہے؟'' ان معصوم چہروں کی اس تابانی کا ہمارے پاس کیا جواب ہے جو اپنے بڑوں کی دانش پر اعتبار کی عکاس ہے؟ نظریں جھکا کر سلسلہ گفتگو منقطع کرنے کے سوا کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے۔

چاند کو ازسرنو قمر کا نام دے دینا مسئلے کا حل نہیں ہے اور بڑے دکھ کی بات ہے کہ بنیاد پرست فقط یہی کر رہے ہیں۔ ہجری تقویم کے پہلے سال کو واپسی صرف ان معنوں میں اہم ہے کہ یہ ہمیں ایک اہم معاملے پر گرفت میں معاونت کرتی ہے' یہ عربوں کے لئے اسلام کا خوبصورت تحفہ ہے جس نے انہیں سر اٹھانا سکھایا۔ میری مراد سر اٹھانے کے انتہائی بنیادی معنوں سے ہے۔ اس نے ہمیں سورج اور ستاروں پر نظر جمائے ہوئے زندگی گزارنا سکھایا یعنی کائنات سے ہمیں ایک مضبوط تعلق دیا اور ہمیں اس کا ایک حصہ ہونے کا احساس دیا۔ اسلام کی یہی کہکشانی روایت ہے جسے ازسرنو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی ہماری ترقی کی بنیادی تحریک ثابت ہوسکتی ہے۔ یہی تحریک سیاروی اندازفکر کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ دور جاہلیت کے عرب ،اور، کیلنڈر کے ایک سال بعد، مسلمان عرب میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر کی نظر اس قبیلے پر ہوتی تھی جس کے پاس اس کے اپنے قبیلے سے دو اونٹ زیادہ ہوتے تھے اور وہ یہ دو اونٹ چرانا چاہتا تھا جبکہ موخرالذکر کی نگاہ ستاروں پر تھی۔ یہی وہ کونیاتی ارتکاز تھا جس نے تقریباً فوراً زندگی کو طاقت اور معنی دیئے۔ اسی کو نیاتی جہت کے کھو بیٹھنے نے ہمیں شناخت کے بحران سے دوچار کیا۔ حال میں زندگی گزارنے کی راہ میں مشکلات حائل کیں اور یہ دونوں بے معنویت کا باعث بنیں کیونکہ ہمارے افعال اپنی سمت کھو بیٹھے۔ ستاروں کے گرد رقص اور سائنس و ٹیکنالوجی کا جشن آفاقیت نہیں، یہ امریکی جھنڈے کے گرد ایک قبائلی رقص ہے۔

غیر عالمگیر جدیدیت؛ آرم سٹرانگ کا جھنڈا

آج ہماری زندگیوں پر چھائی بے معنویت کا سرچشمہ یہ حقیقت ہے کہ جدیدیت ہمیں ہر لحظہ احساس دلاتی ہے کہ 20 جولائی 1969ء کی رات سے' جب بھورے بالوں والے ایک طویل قامت انسان نے اپنی قوم کا جھنڈا چاند پر گاڑا، چاند عالمگیر نہیں رہا۔ بلکہ مغربی بن گیا ہے- بھورے بالوں والا وہ طویل قامت سفید فام انسان نیل آرمسٹرانگ ایک امریکی تھا۔ ہم سائنسی جذبے کی فتح کے شاہد ہونے پر خوش تھے، یہ ستاروں تک رسائی کا غیر معمولی آغاز تھا۔ لیکن اس خلاباز کا جھنڈا ہمیں واپس حقیقت کی طرف لے آیا۔ یہ عالمگیریت کا نہیں بلکہ اس کے اپنے قبیلے کا جھنڈا تھا۔ مرحوم ماہر اساطیر جارج کیمبل نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''اور پھر اپنے خلائی لباس میں ملبوس دو خلابازوں کو بڑی بے

تکلفی سے خوابناک قطعہ زمین پر چلتے پھرتے ، اپنے تفویض شدہ فرائض سرانجام دیتے اور امریکی جھنڈا لگاتے دکھایا گیا۔'' (24) اس واقعہ پر بہت سے امریکی فخر سے پھول گئے لیکن کئی جنہیں اپنی ملک کی عالمگیریت قائم کرنے کی ذمہ داری کا احساس تھا' جس میں ہر انسان خود کو شریک محسوس کرے، جارج کیمبل کے سے تھے جس نے اساطیر کا طالب علم ہونے کے حوالے سے دور قدیم کے اشاروں ، کنایوں کی بقاء اور ماہیت قلب کا تجزیہ کیا۔

امریکہ جھنڈا لگائے جانے کے بعد غیر مغربی ناظرین کی تواضع بائیبل سے لئے گئے ایک قول سے کی گئی۔ آرم سٹرانگ سے پہلے کے خلاباز بھی جنہوں نے چاند کے گرد سب سے پہلے چکر لگایا تھا، اپنے خلائی لباسوں میں ایسا ہی ایک حوالہ لے گئے تھے۔ انہوں نے ''کتاب پیدائش'' کے پہلے باب میں سے ٹی وی کیمرہ کے سامنے یہ حوالہ پڑا تھا' ''خدا نے سب سے پہلے آسمان اور زمین پیدا کئے، زمین بے ہیئت اور ہر چیز سے تہی تھی اور اتھاہ کے چہرے پر تاریکی تھی.....''

کیمبل آخر میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''مجھے خیال آیا کہ کس قدر افسوس ناک ہے کہ ہمارے پاس اس شاندار لمحے کے لئے ہماری اپنی شاعری میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس کائنات کے شکوہ وعظمت سے مناسبت رکھتی ہو یا اس کا کوئی اشارہ ہی دے سکتے جس میں تب ہم حرکت کر رہے تھے۔'' (25)

''طے شدہ امر ہے کہ مغرب پر، جو ہماری آنکھوں کے سامنے ایک دنیا کے خواب لہراتا ہے، انسانیت کے مستقبل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کی یہ ذمہ داری بھاری ہے کیونکہ اسے سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق معاملات میں اجاری داری حاصل ہے۔ مغرب یہ فیصلہ اکیلے کرتا ہے کہ مصنوعی سیارے عربوں کو تعلیم یافتہ کرنے میں استعمال کے لئے جانا ہیں یا ان پر بم گرانے میں۔ اگر تیسری دنیا سائنس کے جشن میں حصہ لینے کے قابل نہیں اور اس کی راہ پر گامزن نہیں تو یہ امر نہ صرف قابل فہم بلکہ قابل معافی بھی ہے اور اسی وجہ سے یہ اپنے لئے لائحہ عمل کی تلاش میں اساطیر اور تاریخی یادداشت پر بھروسہ کرنے لگتی ہے ، لیکن جب کہکشانی دور میں داخلے کے دروازے کھولنے والا مغرب چاند کی کھوج کی ابتداء اپنے قبائلی جھنڈوں اور بائبلوں کے استعمال سے کرتا ہے تو یہ کسی طور باہر رکھے گئے لوگوں کے نقصانات کا مداوا نہیں ہے جن میں عرب بھی شامل ہیں اور خصوصاً عرب نوجوان طبقہ۔ امریکہ انہیں کسی طرح محسوس نہیں کروا پائے گا کہ عالمگیریت میں وہ بھی ان کے ساتھی

ہیں۔حقیقت یہی ہے کہ دیوار برلن کے انہدام کے بعد سے طاقتور اور وحدت پرست مغرب جو ہمارے تخیل کو ہوا دیتا رہا ہے، حقیقت نہیں رہا افسانہ بن چکا ہے۔نسلی اور علاقائی عداوتوں میں پھٹا مغرب ہماری آنکھوں کے سامنے ٹوٹ رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ متضاد مفادات کا شکار مغرب آج بھی ہماری روزمرہ زندگیوں پر اختیار رکھتا ہے۔اس کا سامان جو ہم درآمد کرتے ہیں اور فضاؤں میں ہجوم کیئے اس کی فلمیں ہماری زندگیوں میں دخیل ہماری صلاحیتں تباہ کر رہی ہیں۔ بحیرہ روم کے عرب ساحل سے دیکھیں تو مغرب (زیادہ درست طور پر یورپ) خواہ کتنا بھی منقسم اور پارہ پارہ کیوں نہ ہو، ہمارے لئے ایک ایسی طاقت ہے جو ہمیں کچلے دیتی ہے، ہماری منڈیوں کا محاصرہ کئے ہوئے ہے اور ہمارے قلیل ترین وسائل' فیصلہ کرنے میں شاذونادر کی گئی پہل اور صلاحیتوں پر قابو رکھنا چاہتا ہے۔ہمیں اپنی صورتحال کا ایسا ہی ادراک ہوا تھا اور جنگ خلیج نے ہمارے اس ادراک پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔ یوں دیکھا جائے تو ایک ہی برمحل سوال ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ کہ آیا مغرب کے پاس ایک عالمی تمدن پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے؟ جواباً اہل مغرب کہہ سکتے ہیں کہ عالمی تمدن کی تشکیل محض ہمارا مسئلہ نہیں ہے، اس میں ہر کسی کو دلچسپی ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ عالمی تمدن کی تشکیل ان لوگوں کا مسئلہ ہے جنہوں نے مختلف اجارہ داریاں قائم کر رکھی ہیں اور ان میں سے اہم ترین علمی اجارہ داری ہے۔ یوں مغرب پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یقیناً مغرب ایک عالمی تمدن قائم کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ سائنسی علم اور الیکٹرانی ایجنڈے پر اپنی اجارہ داری سے دستبردار ہو جائے۔ مغرب عالمی تمدن پیدا کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے جھنڈوں سے دستبردار ہو جائے۔

اس علم میں برابر کی حصہ داری اور اس تک ہر کسی کی رسائی یقیناً یوٹوپیائی خواب نہیں ہے۔ یہ تو الیکٹرانی ٹیکنالوجی کی ساخت و ماہیت میں تحریر ہے کیونکہ یہ انفارمیشن کی ترسیل اور اشاعت کے سوا کچھ نہیں۔ ایلون ٹافر(Alvin Tofler) کے الفاظ میں،''تعریف کی رو سے قوت اور دولت دونوں طاقت ور اور دولت مند کی املاک ہیں۔لیکن علم کی حقیقی انقلابی صفت یہ ہے کہ غریب اور کمزور بھی اس پر عبور حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ طاقت کے منابع میں سے یہ سب سے زیادہ جمہوری ہے۔''(26)

انسانی تاریخ کو مغرب نے جس خطرے سے دوچار کر دیا ہے، وہی اِس کا مداوا کرسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے اپنے ہی ابتدائی نمونوں پر عمل کرنا ہوگا اور اس کا بہترین

طریقہ یہ ہوگا کہ دوسروں کو بھی فیصلہ سازی میں شریک کرے۔ اس کا آغاز مغرب میں رہائش پذیر تیسری دنیا کے ان ہزاروں دانش وروں اور اہل فکر سے استفادے کی صورت کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بیشتر سیاسی جلاوطن ہیں۔ شاذ و نادر ہی انہیں عالمگیریت کے موضوع پر مغربی اندازفکر متعین کرنے والے اداروں میں شرکت کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ بہت طاقت ور لیکن مزاحم مغرب اور ان تمدنوں کے درمیان پل کا کام کر سکتے ہیں جو عدم استحکام کے بغیر تبدیلی جیسی پیچیدہ خواہشات رکھتے ہیں، جن کی آگے بڑھنے کی اپنی امنگیں اور ان سے وابستہ استرداد بھی ہیں اور اپنی ہچکچاہٹیں اور پسپائیاں ہیں۔

عورتوں کا مقدر بڑی حد تک مغرب کے اس ذمہ داری کو قبول کرنے پر ہے۔ اس لئے کہ خواہ یہ حقیقت کتنی ہی متناقض نظر آئے، آزادی کے زچہ خانوں میں جدیدیت کے ہاتھوں اولین تقلیب ماہیت عورتوں کی ہوئی- حجاب میں ملفوف اور روایت میں جکڑی ساکت و صامت انفرادیت کے گیت میں عورتوں کی آواز بلند ترین تھی کیونکہ گروہ کے قانون نے سب سے زیادہ جبر ان پر مسلط کیا تھا۔ اتنے طویل عرصے تک خاموشی کی تذلیل سے گزرنے والی عورتوں کے گیت میں ''آزادی'' اور ''انفرادیت'' ایک سا آہنگ دینے لگے ہیں اور شہر ایک ''عجیب'' نغمہ سے متعارف ہوا ہے۔ عورتیں مسحور کن ہیں اور پرہول بھی۔ یہ غیض وغضب ابھارتی ہیں اور گستاخ و سرکش بھی ہیں۔ امام ان کی مذمت کرتے ہیں لیکن ان کی استقامت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بغیر نقابوں کے نازک اور ننگے چہرے، یہ عورتیں آگے کی طرف اپنے مارچ کا آغاز کر رہی ہیں اور پہلی بار ایسا رہا ہے کہ ان پر کوئی نگرانی نہیں اور وہ بھی ایسے شہر میں جہاں سوائے حد بندیوں کے تمام گرفتیں تاحال مضبوط ہیں۔

باب10

عورتوں کا گیت.....منزل آزادی

عرب دنیا اڑان بھرنے کو ہے۔

یہ کئی پیش گوئی نہیں ہے، ایک عورت کا وجدان ہے اور خدا، جو ہر چیز سے باخبر ہے، جانتا ہے کہ عورت کا وجدان شاذ و نادر ہی غلط ہوتا ہے۔

عرب دنیا اڑان بھرنے کو ہے کیونکہ ہر کوئی تبدیلی چاہتا ہے اور بنیاد پرست سب سے آگے ہیں۔ ان کی یہ تجویز کہ آگے بڑھنے کے لئے ماضی کو مراجعت ضروری ہے، محض اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی خواہش کتنی طاقت ور ہے۔ دنیا کے اس کونے میں کہیں اور جا بسنے کی خواہش بہت طاقتور ہے۔ یہ خواہش من حیث القوم کسی اور حال میں ہجرت کرنے کی خواہش ہے۔ شائد غیر ملکی ایسا محسوس نہیں کرتے لیکن ہر صبح جب میں ریڈیو پر کان لگائے بیدار ہوتی ہوں تو سوچتی ہوں، کچھ بھی ہوسکتا ہے، اس ایک اور اگلے منٹ کے دوران کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

جنگ خلیج نے دکھتی جگہوں..... انحصار، عدم جمہوریت اور کمزوری و بے بسی.....میں خنجر گھونپ کر ہمارے اندر کسی چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں نے بہت غور کیا ہے کہ جو کچھ ٹوٹا پھوٹا ہے، کیا ہوسکتا ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ ہم دائرہ در دائرہ جس ٹھنڈے خوف تلے دبے ہوئے تھے' وہ ٹوٹا ہے۔ جنگ میں پورے مغرب نے اپنی تمام تر ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہوئے عربوں پر بم برسائے؟ اس سے زیادہ دہشت اور کتنی ہوسکتی ہے؟

MashalBooks.org

جب آپ دہشت کی کسی واردات سے گزر چکتے ہیں تو خوف سے آزاد ہوکر ابھرتے ہیں۔ گہری یاسیت کا تجربہ رکھنے والے سبھی افراد یہ بات بخوبی جانتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ خوف سے نجات مل جاتی ہے بلکہ ایسا ہے کہ آپ خوف پر فتح پا لیتے ہیں۔ ان سب دہشتوں نے، جن کا اس کتاب میں کھوج لگایا گیا ہے، عرب دنیا کو مفلوج کر دیا تھا۔ انہیں اس جنگ کے نتیجے میں بالآخر ان دہشتوں سے گزرنے کا موقع ملا ہے۔ وہ اس واردات میں ڈوب کر ابھرے ہیں، شائد قدرے کپکپاتے ہوئے لیکن اس یقین محکم کے ساتھ کہ نامعلوم میں کسی بھی خطرے کی حامل چھلانگ بہرحال اس سے کم خطرناک ہے جو کچھ ہم پر بیت چکی تھی۔ روزمرہ کی ہلکی پھلکی گفتگو کا محاورہ تک بدل چکا ہے۔ ''ہیلو، آپ کیسے ہیں؟'' کی جگہ نیک نیتی سے ادا کئے گئے فقرے ''ابھی تک زندہ ہو'' نے لے لی ہے۔ یہ تبدیلی نامعلوم کیطرف لڑھک جانے کی عکاس ہے۔ اب ہر کوئی جانتا ہے کہ ایک عرب کے لئے بقاء کا مطلب تبدیلی ہے۔ یعنی زندگی کی ان جہات کی کھوج جنہیں کبھی چھیڑا نہیں گیا۔ ان میں عقل (استدلال)، انفرادی آزادی، رائے (فیصلہ) اور خصوصاً خیال شامل ہیں۔ خیال جو متخیلہ کی وہ طاقت ہے جو مستقبل کی دنیا میں بالادستی کی ضامن ہے۔ اگرچہ عرب جنگ کے بعد کے اس دور میں وا ہونے والے امکانات پر حیران ہیں لیکن عورتوں نے اقلیم آزادی کی طرف اپنا پرعزم اور خطرناک مارچ کئی دہائیاں پہلے شروع کر دیا تھا۔ مجھ سے سوال کیا جائے گا کہ عورتیں کس طرح ہراول دستہ ثابت ہوتی ہیں؟ یوں کہ ہمارے پاس کھونے کو اپنے خوف اور نقاب کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس فہرست میں تفریق اور تحدید کے مفلوج کر دینے والے اثرات بھی شامل کرلیں۔

عورتیں نامعلوم مہم جوئی میں کود پڑنے کو بے تاب ہیں۔ فلسطینی مادر حوصلہ اس بے تابی کی علامت ہے، جسے ہم ہر روز ٹیلی ویژن سکرین پر دیکھتے ہیں.....گلیوں میں جمی کھڑی- نہ خوفزدہ اور نہ ہی اسرائیلی فوجی کے لئے نفرت و کدورت سے بھری جسے وہ یوں گھورے جاتی ہے گویا وہ ایسا نوعمر بچہ ہے جو بالغ بننے کے لئے ناگزیر نوبلوغت کے دور سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔

عرب عورتیں جدیدیت سے خوفزدہ نہیں ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ روایت کا متبادل تعمیر کرنے کا غیر متوقع موقع ہے۔ اس روایت کا متبادل جو ان پر اس درجہ بوجھل ہے، انہیں

نئی دنیاؤں کی خواہش ہے جہاں آزادی ممکن ہے۔ صدیوں، نقاب اوڑھے اور بندش کا شکار یہ عورتیں آزادی کا گیت گاتی رہی ہیں لیکن کوئی سن نہیں رہا تھا۔ ایک مراکشی محقق محمد الفصی کو وہ گیت اکٹھے کرنے کا خیال سوجھا جو تیس کی دہائی میں فیض کی حرم سراؤں میں گردش کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سوں میں ممنوعہ جذبات، شبانہ ملاقاتوں اور مجنونانہ فرار کا بیان ہے اور کچھ ایسے ہیں جن میں زنجیروں اور تالوں کے موثر ہونے کی تضحیک کی گئی ہے۔ کچھ گیتوں میں پنجرے میں قید پرندوں کا ذکر ہے جو موقع ملنے پر اڑ جانے سے نہیں چوکتے۔

پرندہ! پرندہ!
جسے رکھنے کو میں نے ریشمی پنجرہ بنایا۔
اور جب اس نے سدھانے میں مزاحمت نہ کی تو
مجھے خیال تک نہ آیا کہ یہ بھی اڑ جائے گا۔

عورتیں کبھی اجازت نہیں دیتیں کہ انہیں سدھایا جائے۔ مردوں کا خیال تھا کہ ایک فرد خانہ بندی کا عادی ہو سکتا ہے، لیکن عورتیں مناسب لمحہ کی منتظر تھیں۔ انہوں نے بڑے وقار سے حالات کے بدل جانے کا انتظار کیا جب وہ شریک عمل ہو کر مکالمہ کر سکیں اور وہ لمحہ آ چکا ہے۔

وہ جا بھی چکیں اور امام پریشاں ہیں

عورتیں اڑ چکی ہیں۔ زرد رو اور خاموش عورتیں اس کی زیارت کر رہی ہیں جس کا خواب ان کی بڑی بوڑھیوں نے دیکھا تھا، لامحدود افق پر نظریں جمائے رقص کرنے کا خواب۔

وہ خوفزدہ ہیں، لڑکھڑاتی اور کمزوری محسوس کرتی ہیں۔ جب زنجیریں آپ کے طے شدہ مقدر میں لکھ دی جائیں، تو آپ کی حرکت کیسی ہوگی؟ لیکن کھلے سمندر کی پکار ناقابل مزاحمت ہوتی ہے۔ وہ گرتی اور پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرتیں اور کہنہ نشانوں کو ٹھوکریں مارتی ہیں۔ جب پنجرے کو آپ کا مستقبل ہونا تھا تو آپ خراماں خراماں کیسے ٹہل سکتے ہیں۔

شروع میں خوفزدہ اور خوفزدہ کر دینے والی ان خواتین نے مردوں کو پتھرا کر رکھ دیا۔

لیکن سالوں کے گزرنے پر جب مرد اپنی حیرت سے ذرا سنبھلے تو انہوں نے خواتین کی آواز پر کان دھرنا شروع کیا جو آزادہ روی کے گیت گا رہی تھیں اور حد بندیوں کے متروک قرار دیئے جانے کے لئے کوشاں تھیں۔ یہ گیت اتنا عجیب تھا کہ اس پر اس سمفنی کا گمان ہوتا تھا جو غیر اجنبی مغرب ایک مناجات کی صورت کہکشاؤں کے حضور غنائیہ کی صورت گنگنا رہا تھا۔ حرم فقط پوسٹ کارڈں پر باقی بچے ہیں یا ان چند امیروں کے ہاں جو اتنے دولت مند ہیں کہ اجداد کے سنہری دور کی ایک بھونڈی سی نقل پھر سے پیدا کر سکیں۔ باقی مرد اس عہد نو میں اجنبیت محسوس نہیں کرتے جس میں طاقت کا انحصار ماضی کی طرف مراجعت کی بجائے آگے بڑھنے میں ہے۔ شامی شاعر ایڈونس کے بقول، اس پاتال میں جس کی نمائندگی جدیدیت کرتی ہے، عرب مرد کو تبدیل ہو کر کو نیاتی اصطلاحات میں اپنا آپ دیکھنا ہوگا اور عین ممکن ہے اسے اپنی ذات ابر نما معلوم ہو۔

عرب عورتیں ہمیشہ وہ نہیں کہتیں جو ان کی سوچ میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ مرد جو اس پاتال میں ڈگ بھرتے جا رہے ہیں اور آندھی کے سے ہیں، پہلے سے کہیں زیادہ ان کے عاشق ہیں جو ان کے خوابوں کی زینت رہی ہیں..... جدیدیت کی خانہ بدوش، سبک بردار، کسی بھی ملک سے غیر وابستہ کیونکہ آگے کو سفر ہی ان کا قبیلہ ہے۔

یہ سچ نہیں کہ ہماری مائیں خود ستائشی میں لپٹے ہمارے باپوں کے ساتھ خوش تھیں۔ جب کبھی جمعہ کو پکنے والے تقریباتی کھانے میں نمک یا کالی مرچ زیادہ پڑ جاتی تو میرا چچا حاج محمد میز الٹ دیتا اور ہر بار چچی کنزہ کو طلاق کی دھمکیاں دینے لگتا۔ چچی اس کی موت پر روئی' اس کی یاد کو تازہ رکھتی اور اس میں کمی نہیں ہونے دیتی؟ لیکن کیا واقعی وہ چچا سے محبت کرتی تھی؟ کیا ایسے مرد سے محبت کی جا سکتی ہے جو ہمیشہ محض اس لئے حق پر ہو کہ قانون بیوی کو ازدواجی اطاعت پر مجبور کرتا ہے؟ کسے خبر نہیں جو مرد اپنے ہمیشہ درست ہونے پر اتنے مصر نہیں ہوتے اور اپنے طرز عمل پر غور کرتے رہتے ہیں، سب سے زیادہ پرکشش ہوتے ہیں۔ نوجوان عرب یہ حقیقت جانتے ہیں اور محبت کے واقعات اسی کے مرہون منت ہیں۔ ایک امر تو یقینی ہے کہ عورتیں فیصلہ کر بیٹھی ہیں انہیں وہ خطبے مزید نہیں سننا جنہیں لکھنے میں ان کا ہاتھ نہیں۔ وہ اوپر اٹھنے کی تیاری مکمل کر چکی ہیں۔ انہیں ہمیشہ سے علم ہے کہ مستقبل کا انحصار حد بندیوں کی تنسیخ میں ہے فرد عزت کیجانے کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ کہ

فرق ہرطرح کے مثبت رویے کی پرورش کرتا ہے۔ ان کے لئے سان فرانسسکو چارٹر (منشور) نہ تو ندرت ہے اور نہ ہی کسی نئے دور کا آغاز۔ یہ محض محروموں کو ہمیشہ سے عزیز خوابوں کی تشکیل ہے۔ یہ طلسمان کی طرح ہے جو ان خوابوں کی حفاظت کرتا ہے۔

اس سارے دورانئے میں صدیوں تک ازدواجی طاقت کو فرض قرار دینے والے امام شعلے اگل رہے ہیں۔ خاوند کی فرمانبرداری خدا کی فرمانبرداری ہے۔ معاصر قانونی ضابطہ میں موجود لفظ طاعت نے حرم میں خلیفہ کے احکام کی اندھی بجاآوری کو جنم دیا تھا۔ امام اس لئے برہم ہیں کہ اگر گھریلو سطح پر کمزور اور بے بس عورت طاعت کو چیلنج کرتی ہے تو مردوں سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے رہنما کے لحاظ سے آنکھیں جھکائے رکھیں گے۔ عرب عورت کی انکساری ہی سارے سیاسی نظا م کے استحکام کا محور ہے۔ احادیث کے پورے پورے ابواب موجود ہیں جن میں ہمارے لئے احکام ہیں کہ اپنے بال کس طرح بنائیں، آنکھیں کس طرح جھکائے رکھیں اور حکم ملنے پر کسی طرح اطاعت کے خول میں سمٹ جائیں۔ خطبات آج بھی جاری ہیں۔ صنفوں کے اختلاط کے خطرات پر قاہرہ سے چھپی سات سو صفحات پر مشتمل ایک نئی کتاب اہل ایمان کے لئے 95 درہم میں دستیاب ہے۔ مصنف نے عورتوں سے متعلق تمام فقہی احکام اس میں جمع کر دیئے ہیں۔ ''لباس و زیبائش، پاکیزہ روایت''، نامی اس کتاب میں کھلے گھیر کا پائجامہ پہننے کے فضائل جیسے اہم مسائل، بھنویں نوچنے اور جلد ملائم رکھنے کے طریقوں اور چہرے پر پاؤڈر لگانے کے حسن و قبح پر بحث شامل ہے۔ آخر میں ایک پورا باب جوتوں کے لئے وقف ہے۔

یقیناً تمام مرد ابھی اوپر اٹھنے یعنی تعصید کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ابھی وہ غیر متعین اور غیر یقینی، کثیر پہلو جدیدیت اور غیر محفوظ شہروں کو سفر کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے کہ حجاب کے فوائد اور تابعداری کے فضائل کے لئے انہیں تیل کی آمدن سے خاصا حصہ مل جاتا ہے۔

اطاعت سے انکار کرنے والوں کے خلاف جوروستم اور جبرواستبداد کا بازار اس بار، معتزلہ یا صوفیاء کے خلاف گرم نہیں کیا جا رہا۔ اس بار تشدد کا نشانہ عورتیں ہیں جنہوں نے ان کا نعرہ اپنا لیا ہے- جو ایسے شہر چاہتی ہیں جس کے گرد بلند و بالا دیواریں نہ ہوں۔ جہاں بچے دوران پرورش تبدیلی سے آشنا ہوں اور ان کی جڑیں صرف اس روایت میں گہری ہوں

جو آج کے دور میں بھی کارآمد ہے؛ ان روایات میں جو ستاروں کے سفر کی مہم جوئی کی امین ہیں۔

جہاں تک ہمارے آباؤ اجداد کے شہروں میں ہونے والے تشدد کا تعلق ہے تو بیشتر اوقات اس کا خاموش نشانہ عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ عورتوں کو ہی مختلف غلطیوں کے بھگتان میں بے گناہ اور بے جواز نشانہ بنایا جاتا تھا۔ خلفاء نے ان کی کبھی عزت نہیں کی۔ جوں ہی کوئی بحران شروع ہوتا، عورت اور شراب کی مذمت کی جانے لگتی۔ صدیوں تک عورت اور شراب کو ہی ہمارے تمام مصائب و مشکلات کا ماخذ گردانا گیا۔

خلافت اور عورتیں: بحران اور تشدد

مسلم سیاسی نظریے میں سیاسی بحرانوں کے حل کے لئے صنفوں کے اختلاط پر پابندی اور مردوں اور عورتوں کی علیحدگی معمول کی کاروائی رہی ہے۔ یہ روایت باقاعدہ ریاستی سطح پر اختیار کی جاتی رہی ہے۔ عورت مخالف قوتیں ماضی کے اس عمل کو عورت سے حقارت کے سلوک کی بنیاد کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ جب بھی کسی مسلم حکمران کو بحران کا سامنا ہوتا، عوامی بغاوت ہو جاتی یا قحط کے باعث فسادات پھوٹ پڑتے تو وہ فوراً شراب کی دکانیں تباہ کرنے اور عورتوں کو گھروں تک محدود کر دینے کے روایتی طریقہ سے رجوع کرتا۔ ان پر روایتاً مردوں کے لئے مخصوص ذرائع نقل و حمل بند کر دیے جاتے- یوں بغداد اور قاہرہ جیسے دارالحکومتوں میں، جہاں دریائی سفر کیا جاتا تھا، عورتیں مکمل طور پر غیر متحرک ہو جاتیں۔ بس کی گانٹھ فقط شراب اور عورتیں تھیں۔ معاشرتی ڈھانچے کی رسوماتی پاکیزگی یعنی تطہیر اس امر کی متقاضی خیال کی جاتی تھی کہ شراب ختم کر دی جائے اور عورت کی تحدید۔ عورتوں کے خلاف تشدد کے ہمارے دیکھنے میں آنے والے حالیہ واقعات الجزائر میں ہوئے جہاں 15 نومبر 1989ء کو انابہ میں حقوق نسواں کی علمبردار کا گھر نذر آتش کر دیا گیا۔ یہ حرکت خالصتاً ہماری روایت کا تسلسل ہے۔

فاطمی خلیفہ الحکم نے اپنے ریاضی دان کو حکم دیا کہ وہ نیل میں پانی کے بہاو کو باضابطہ بنائے لیکن وہ ناکام رہا- جب پانی کی متواتر کمی سے فصلیں متاثر ہوئیں، قحط پڑ گیا اور مہنگائی بہت زیادہ ہونے سے عوام الناس فسادات پر اتر آئے (4) تو خلیفہ نے دوسرے طریقہ سے

رجوع کیا جو اس کے خیال میں زیادہ بہتر طور پر بروئے کار لایا جا سکتا تھا۔405 ہجری میں اس نے مصری عورتوں کو گھروں میں بند ہو جانے کا حکم دیا۔ اس سال الحکم نے عورتوں کے کسی بھی صورت گھروں سے نکلنے کی ممانعت کر دی۔ ان کا حماموں تک جانا ممنوع قرار پایا اور اس کے حکم سے عورتوں کے جوتوں کی تیاری بند کر دی گئی۔ بہت سوں نے اس کے حکم کی خلاف ورزی کی اور قتل ہوئے۔(5)

کچھ دہائیوں کے بعد 487 ہجری میں یہی مناظر بغداد میں بھی دہرائے گئے۔ عباسی خاندان کے اٹھائیسویں حکمران المقتدیٰ نے گانے والی اور بری شہرت کی حامل عورتوں کو شہر بدر کر دیا۔''ان کے گھر فروخت کر دیئے گئے اور انہیں دیس نکالا دے دیا گیا۔ کمر کے گرد لپیٹنے والا کپڑا ساتھ لئے بغیر حماموں میں جانا ممنوع قرار پایا۔ ملاحوں کو حکم ہوا کہ وہ مردوں اور عورتوں کو اکٹھا سفر نہ کرائیں۔''(6)

اقتصادی عدم تحفظ کے باعث عوام الناس میں بے چینی پھیلتی لیکن شہزادے کا غصہ عورتوں کے خلاف کچھ زیادہ نہ بھی بھڑکتا تو بیشتر اوقات عورتوں کے خلاف اقدامات امتناعی ''پیکیج'' کا حصہ بنا دیئے جاتے۔مخصوص کھانوں اور مشروبات پر پابندی جیسی یہ ممنوعات، جو نہ صرف فضول بلکہ تکلیف دہ بھی ہوتیں، شہر میں ایک اور عمل متعارف کرواتیں جس سے مسلمان سب سے زیادہ ڈرتے تھے۔تشدد کے واقعات معمول بن جاتے۔بحران، آفت اور تطہیر کے مابین تعلق تاریخی یادداشت میں بہت مضبوط ہے اور صدیوں مسلسل موجود رہا اور اب تک باقی ہے۔ الجیریائی بنیاد پرست تحریک کے بانی شیخ عباس مدنی پوری طرح قائل ہیں کہ شراب اور خواتین ان کے ملک کی سیاسی اور اقتصادی مشکلات کی بنیاد ہیں۔

''ہمارا مذہب ہمیں مشاورت کا پابند کرتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: ''دین مشاورت ہے۔'' چنانچہ ہم نے تمام حالات میں اپنے بھائیوں سے مشاورت کے لیئے رجوع کرنے اور اس ملک اور کمیونٹی کی خیرخواہی کے لئے اکٹھے کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہماری نظروں سے ایسی اخلاقی گراوٹیں گزری ہیں جن کا مذہب یا الجزائر کی روایات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مے نوشی قانونی قرار دی جا چکی ہے۔سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صنفی اختلاط کے باعث ناجائز بچے پیدا ہو رہے ہیں۔فسق و فجور کا دور دورہ ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ عورتیں، اندرون اور بیرون خانہ خود کو ڈھانپتی نہیں بلکہ آرائش و سنگھار سے

اپنے جسم کی نمائش کرتی اور سب کچھ دکھاتی ہیں۔ الجزائر کے مرد کی غیرت کہاں ہے کہ اس کی عزت یوں سر بازار اچھالی جا رہی ہے؟(7)''

اپنی قوم کو درپیش مسائل کا اس طور تجزیہ کرنے والے شخص کا اصلاحی پروگرام بہت سادہ ہے ''عورتوں کو بند کر دو اور شراب پر پابندی عائد کر دو۔''

عورتوں کی نقل و حرکت کو اس طرح روک دینا اور یوں امت کے نصف کو غیر متحرک کر دینا، کسی بھی مسلم حکمران کے اصلاحی اقدامات میں بغیر کسی تردد کے درست بیٹھتا ہے۔ بحران کا یہ نظریہ اور اس کا یہ حل مسلم تاریخ میں' خواہ وہ مغرب کے مسلمانوں کی ہو یا مشرق کے مسلمانوں کی، بار بار وقوع پذیر ہوتا ہے۔ تیرہویں صدی کے زیرک ترین مورخین میں سے ایک المراکشی کے مطابق بازاروں میں اور سیاسی منظر پر عورتوں کے ظہور نے طاقتور بربری الموارز خاندان کو برباد کر دیا جن کی مغربی سلطنت سپین سے شمالی افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ المراکشی نے اس خاندان کے آخری بادشاہ کی بے بسی کی لفظی تصویر کشی کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ وہ ابھرتے ہوئے مذہبی مخالفین کے مدمقابل کس طرح بے بس ہوگیا۔ وہ مذہبی مخالفین بھی، ہمارے عہد کے بنیاد پرستوں کی طرح، حکومت سے وحدت اور آہنگ پر مبنی لائحہ عمل اختیار کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ وہ المواحدین (وحدت کو فروغ دینے والے) کہلاتے تھے۔ عورت دشمنی ان کے پروپیگنڈے کا کلیدی جزو تھا۔ المراکشی اس پورے بحران کا خلاصہ یوں بیان کرتا ہے۔

''500 ہجری آتے آتے امیرالمومنین کی حیثیت خاصی مخدوش ہوگئی۔ برسراقتدار خاندان کے اہم افراد آمرانہ رویے کا مظاہرہ کرنے لگے جس سے گناہ بڑھ گئے۔ حکومتی معاملات عورتوں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے، انہیں مختار کر دیا گیا۔ اندلس باغی ہوگیا اور اپنی پہلی (مسیحی سلطنت) حالت کی طرف لوٹنے کی دھمکی دینے لگا۔''(8)

الموارد اصلاً صحرا خانہ بدوش تھے جن میں گروہی بقاء کے حوالے سے عورت کو خاصی اہمیت حاصل تھی اور اس کے ساتھ مقابلتاً عزت کا سلوک کیا جاتا تھا۔ الموارد کی عورتیں سیاست میں اہم کردار ادا کرتی تھیں جس کی ایک مثال یوسف بن تاشفین کی بیوی زینب ہے۔

سات صدیوں بعد، بیسویں صدی کے وسط میں، غیر معمولی لکھاری (''فجر الاسلام، ''ضحیٰ الا سلام'' اور ''ظہر الاسلام'' جیسے سلسلہ کتب کے مصنف) احمد امین نے تاریخ کے

پندرہ سو سال کے تجزیے کی ایک یادگار کوشش کی اورعورتوں کے لئے اسی نفرت کو دہراتے ہوئے اسی رائے پر قائم رہا کہ عورتوں نے ہی وقتاً فوقتاً مختلف سلطنتوں کی قبریں کھود دیں، جس لمحے عورتیں منظرعام پر نظر آنے لگیں، مسلم نظام اور سلطنت دونوں کے پرخچے اڑ گئے۔ حجاب کی ازسرنو ترویج کی دعویدار حزب اختلاف کی جماعتیں اِسی نوع کے نظریات سطح پر لانے، پھیلانے اور ذہن نشیں کروانے کے لئے کام کر رہی ہیں۔عورت دشمنی کی ان صدیوں میں خلافتی جبر کی غلام گردشوں میں جو روایت سینچی گئی، مسلم عورتیں اسے ہی چیلنج کر رہی ہیں۔ کائناتی قوتیں مومن کو ہر سمت سے دھکیل رہی ہیں اور وہ ان کے اثر سے ڈگمگا رہا ہے۔ عورتیں اس مومن کو مجبور کر رہی ہیں کہ وہ انہیں اپنے برابر تسلیم کرے یعنی کہ اس امر کو حقیقت مان لے جسے فقط تین صدی قبل محض ایک مبالغہ انگیز مضحک صورتحال سمجھا جاتا تھا۔ ان کا مطالبہ ہے کہ اس متجانس شہر کو بطور مثالیہ ماننے سے اعلان برات کر دیا جائے جسے نہایت احتیاط اور صحت کے ساتھ حفظ مراتب کے حامل علاقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور جہاں سیاسی انتظام اور فیصلہ سازی فقط ایک صنف کے پاس تھی۔شہر میں عورت کا سرعام نمودار ہونا اجنبیوں یا غیر ملکیوں کے ظہور کے مترادف خیال کیا جاتا تھا۔ ایسے معاشرے کی اکثریت کے لئے جہاں نگرانی اور قابو میں رکھنے کی غرض سے ''آلحصن'' تاحال ایک قانون ہے۔ یہ سب کچھ سیکھنا ایک تکلیف دہ لیکن ناگزیر عمل ہوگا۔ ایک شادی شدہ خاتون کیلئے المحصنہ باقاعدہ ایک قانونی اصطلاح ہے۔اس عورت کو اپنی شادی کا تحفظ حاصل ہے جسے محصن کہتے ہیں۔شخصی ضابطے کی ہر دفعہ اور شق ایک ایسے خاندان کی شبیہہ ذہن میں لاتی ہے جو خلیفہ کے محل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں جہاں طاعت کا تقاضا کیا جاتا ہے اور رہنما کی مرضی اور ارادہ باقی ہر ارادے اور خواہش کو ختم کر سکتی ہے۔

عورتیں سول کوڈ کو انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ سے متضاد قرار دیتی ہیں جبکہ مطلق العنان ریاستیں اسے مقدس قرار دے کر انہیں برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔90 کی دہائی کی جنگ عورت کے عزم اور حکمرانوں کی کوششوں کے مابین جنگ ہوگی۔ جدیدیت نے عورت کو بذریعہ تعلیم اور بامعاوضہ ملازمت گھروں سے باہر گلیوں بازاروں میں دھکیل دیا ہے، جہاں بے نقاب اور غیر مودب عورتیں کسی اور ہی لہجے میں بات کرتی ہیں۔ خلفاء کے رطب السان اور جابر اسلام دونوں کیلئے یہ مثالیہ غیر ملکی اور درآمدشدہ ہے۔ یہ حکومتیں نہ

صرف غدار بلکہ مغرب اور اس کے فلسفیوں کی حلیف ہیں۔ اس حیثیت میں عورتیں کل کے معتزلہ اور تعقل پسندوں کی طرح ہیں جنہوں نے یونانی افکار درآمد کئے۔

عورتیں جبر اور ہراساں کے لئے جانے کے عمل سے گزرتی رہی ہیں، گزر رہی ہیں اور گزرتی رہیں گی۔ صاحب اقتدار اور ماضی کو مراجعت کی صدا لگانے والی حزب اختلاف دونوں اس عمل میں برابر کی حصہ دار ہیں۔ پاکستان میں یہ عمل اسی کی دہائی میں ہوا۔ ایران میں اب تک ہو رہا ہے اور آج نوے کی دہائی کے آغاز میں الجزائر میں یہ عمل اپنے عروج پر ہے۔ کل یہ عمل کسی اور جگہ بھی ہوسکتا ہے۔ وجہ بہت سادہ ہے، صرف عورتیں ہی ہیں جو کھلے عام بطور فرد اپنے حقوق اور توثیق ذات کی بات کرتی ہیں اور وہ فقط باتیں نہیں بناتیں عمل بھی کرتی ہیں (ترک نقاب اور بیرون خانہ سرگرمیاں)۔ آج ترقی پذیر شہری معاشرے کا متحرک ترین جزو عورتوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ تاحال سیاسی اعتبار سے وہ غیر منظّم ہیں لیکن وہ ان قلعہ بندیوں میں گھسنے میں کامیاب ہوچکی ہیں جو مدتوں ان کے لئے ممنوع تھیں۔ میری مراد باقاعدہ تعلیم سے ہے۔ ہائی سکول اور یونیورسٹی ڈپلوموں اور ڈگریوں سے مرصع تعلیم عورت کے لئے اکتسابات ہیں۔ تاحال عورتوں کو امور خانہ داری اور قالین بانی جیسی کمتر اور کم اجرت کی حامل مہارتوں تک محدود رکھا جاتا تھا۔

انقلابی چیلنج کے لئے ایک قوت

مغرب، جو نقاب پوش عورتوں پر ہمیشہ سے خصوصی توجہ دیتا رہا(10) اس کے متعلق ایک حقیقت سے اچھی طرح آگاہ نہیں اور اسی حقیقت کو امام اور مذہبی اصولوں کے سخت گیر موئید بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب عورتوں حرم میں قید نہیں ی رہیں اور نہ ہی وہ محجوب اور خاموش ہیں۔ ان کی ایک بہت بڑی تعداد ممنوعہ علاقوں اور خصوصاً یونیورسٹیوں میں گھس چکی ہے۔ اگر ایران میں امام عورتوں پر کڑی نگاہ رکھتا ہے تو اس کی وجہ ہے کہ 1986ء میں ایرانی یونیورسٹیوں کے تدریسی عملے کا انیس فیصد خواتین پر مشتمل تھا جبکہ اس سال مغربی جرمنی میں یہی شرح فقط 17 فیصد تھی۔ (11) چنانچہ حقیقت اس کے علاوہ کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ امام خمینی نے 1980ء میں ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے جو اقدام اٹھائے ان میں سے ایک کے مطابق تمام سرکاری ادروں میں کام کرنے والی خواتین کے لئے حجاب لازم قرار دے دیا

گیا۔(12) حکومت اور حزب اختلاف دونوں نے عورت کے خلاف جو بے رحمانہ جنگ چھیڑ رکھی ہے اس کا خصوصی ہدف متوسط طبقہ کی عورت ہے جس نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اچھی تنخواہ کی حامل ملازمتوں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ ان کی دشمنی روایتی جلالہ میں ملبوس عورت سے نہیں جسے طول طویل فاصلوں پر بذریعہ بس کام پر لے جایا اور واپس چھوڑا جاتا ہے۔وقت پر ایسی ڈیوٹی پر پہنچنے کے لئے تھکا دینے والا سفر عورت کی مجبوری ہے- ان عورتوں کی مزدوری مقابلتاً کم ہوتی ہے اور یہ یونین سازی جیسی ''عیاشیوں'' سے بھی محروم ہیں۔ حزب اختلاف اور تقدس پر مبنی اہل اقتدار ہر دو کو ان عورتوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں اس عورت کا مالیخولیا ہے جو اپنی جدت میں ہر نظر آنے والی سہولت سے استفادہ کر رہی ہے۔ ننگے سر، ہوا سے لہراتے بال ، کار چلاتی وہ عورت جس کے اپنے شناختی کاغذات اور اپنے نام کا پاسپورٹ دستی بیگ میں موجود ہے۔ وہ عورت جو فقط خانہ شماری کے رجسٹر میں اپنے نام کے اندراج کے بعد اپنے شوہر کو اپنی جگہ ووٹ ڈالنے کا اختیار دیتی ہے بنیاد پرستوں کو اتنا تنگ نہیں کرتی۔ان کی تنگی طبع کا باعث وہ عورت ہے جس نے بالکل جائز طریقہ سے یونیورسٹی تک رسائی حاصل کر لی ہے اور اپنے اس نئے نئے حاصل شدہ منبر سے تبلیغ کرتی، لکھتی تعلیم دیتی اور صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ بنیاد پرستوں کا ہدف یہ عورت ہے؛ ہر نوع کے بنیاد پرستوں کا خواہ وہ سربراہان مملکت ہوں یا مقبول عام مذہبی رہنما۔

اسی طرح کی عورتیں تھیں جنہوں نے پاکستان میں ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے خلاف عورت ایکشن محاذ بنائے اور گلیوں بازاروں میں احتجاج کیا۔ یونیورسٹی تعلیم یافتہ عورتیں ہی تھیں جو الجزائر کے صدارتی محل کے سامنے گلیوں میں جمع ہوکر جمہوریت کی متقاضی ہوئیں۔سب سے پہلے انہی عورتوں نے (National Libration Front)NLF کے سوشلزم کے پردے میں چھپے آمرانہ ہتھکنڈوں کو بے نقاب کیا۔ ہوسکتا ہے کہ پرولتاری عورتیں ان مظاہروں میں شریک نہ ہوسکتی ہوں- لیکن ان پر برداشت سے زیادہ بوجھ ہے۔ ان کے بچوں کی دیکھ بھال کیلئے سہولتیں عنقا ہیں اور پھر بسوں کے انتظار میں گھنٹوں قطار بنا کر کھڑے رہنا! ان سے جب بن پڑتا ہے وہ بھی ان مظاہروں میں شرکت کرتی ہیں لیکن یقیناً پہل ان کی طرف سے ہوتی ہے اور نہ ہی تحریک کی رہنما ان میں سے اٹھتی ہیں۔ پاکستان اور الجزائر دونوں ممالک میں عورتیں نے سرکار کی نافذ کردہ اوراس کے زیر انتظام شریعت کو

گذشتہ دہائی میں چیلنج کیا جبکہ کافر کہلانے کا خطرہ بہرحال موجود تھا اور دونوں جگہوں پر قیادت فقط یونیورسٹی تعلیم یافتہ خواتین کے پاس تھی اور صورتحال یہ ہے کہ 1984ء میں پاکستان اور الجزائر میں اعلیٰ سطح پر تعلیمی عملے کا بالترتیب 25 اور 24 فیصد خواتین پر مشتمل تھا۔ (13)

خواتین میں خود کو آزاد کروانے کی خواہش کے خلاف موجود جبر کی شدت سمجھنے کے لئے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ انہوں نے تعلیم کیلئے یوں سرتوڑ کوشش کی تھی جیسے ڈوبتا شخص تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دونسلوں سے بھی کم عرصے میں انہوں نے علمی دنیا کا محاصرہ کر لیا تھا۔ جدید یونیورسٹی کا رویہ خواتین سے دوستی کا زیادہ اور دشمنی کا کم ہے۔ اس حوالے سے ترقی پسند دانشوروں کے فیصلہ کن کردار کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی خواتین کے موقف کی حمایت کی جس کا اعتراف ضروری ہے۔ ممکنہ طور پر موجود خیال کے برعکس ترقی پسند عرب مرد نے تبدیلی کی اپنی خواہش میں عورتوں کے ساتھ تعلق کو ہمیشہ مرکزی جگہ دی ہے۔ تبدیلی کیلئے مراکشی عورتوں کی جدوجہد میں بایاں بازو ہمیشہ ان کا شریک کار اور معتمد رہا۔ تبدیلی کی شروعات اور یونیورسٹی کو امید کا مرکز بنانے میں ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ میری نسل کی عورتوں کیلئے تعلیم عیش کوشی خیال نہیں کی جاتی تھی۔ تب اعلیٰ تعلیم بقاء اور چند دہائی قبل معاشرتی تنظیم میں عورتوں کیلئے موجود تحقیر سے فرار کا ایک ذریعہ تھی۔ ساٹھ کی دہائی میں عورتیں اپنا کاروبار چلا سکتی تھیں اور نہ ہی سیاست کو بطور پیشہ اپنا سکتی تھیں۔ اس صورت حال سے نکلنے کا واحد رستہ تعلیم اور یونیورسٹی تھی۔ عورتوں نے نرسیں یا معاون نرس بننے کو اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا ہدف مقرر نہ کیا۔ ماتحتی میں کی جانے والی ملازمتیں ایک بار پھر گھریلو مسائل کھڑے کرنے کی مترادف تھیں۔ چنانچہ انہوں نے طب کی تعلیم کو پیش نظر رکھا۔ 1987ء میں تونس میں میڈیکل کے کل طالب علموں کا پچاس فیصد خواتین پر مشتمل تھا جبکہ شام اور الجزائر کے لئے یہی تناسب بالترتیب 37 اور 30 فیصد تھا۔

اگر ہم یونیورسٹی کو پیمانہ بنا کر دیکھیں تو صنفوں کے درمیان تعلق کے حوالے سے آنے والی تبدیلی کی رفتار چکرا دینے والی ہے۔ جاپان میں، جو کہ ایک اور قدامت پسند اور روایت پرست معاشرہ ہے، دوسری جنگ عظیم کے بعد سائنسی اور تکنیکی میدان میں ہونے والی تمام تر

زبردست ترقی کے باوجود، 1987ء تک یونیورسٹی میں خواتین پروفیسروں کا تناسب محض دس فیصد تھا۔ جب کہ مصر میں جہاں اخوان المسلمین کی طاقتور بنیاد پرستی کے مدمقابل صرف مصری حقوق نسواں کی علمبردار خواتین تھیں؛ یہی تناسب 1986ء میں اٹھائیس فیصد تھا اور یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ امریکہ اور فرانس میں یہ تناسب بالترتیب 1980ء میں 24 فیصد اور 1987ء میں 23 فیصد تھا۔

مصر میں بنیاد پرستی اور تحریک آزادی نسواں نے ایک ساتھ جنم لیا اور پھر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ پہلو بہ پہلو نہ چلی ہوں۔ میرے جیسی شمالی افریقہ کے ایک شہری کے لئے جس کی ماں ناخواندہ تھی، مصر میں ہونے والی کسی کانفرنس میں شرکت ہمیشہ ازسرنو حیرت خیز ثابت ہوتی ہے۔ حقوق نسواں کی علمبردار منی سکرٹ میں ملبوس نوخیز لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ نانیوں، دادیوں کی عمر کی ان خواتین کے سرسفید اور آواز میں لرزش ہوتی ہے، لیکن ان کے خیالات ہمیشہ نوبہ نو اور فکرانگیز ہوتے ہیں۔

اخوان المسلمین 1928ء سے 1936ء کے درمیانی عرصے میں وجود میں آئی۔ یہی وہ دور تھا جب حقوق نسواں کی مصری علمبردار ہدیٰ شعراوی دنیا کی سب سے زیادہ انقلابی نسوانی تحریک کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ ان کی سرگرمیوں کا دور عروج 1923ء سے 1947ء (ان کا سال وفات) تک کا ہے۔ آج کے معیارات پر بھی پرکھا جائے تو اس خاتون کی قیادت اپنی انقلاب انگیزی میں لاثانی تھی۔ ان کی تحریک نے فرد کی عزت کو ایمان کی بنیادی شق تسلیم کرنے پر زور دیا۔(16) 1920ء میں وفد پارٹی کے اندر شعبہ خواتین خاصی اہمیت حاصل کر چکا تھا اور اسے عوام کے ایک قابل ذکر حصے کی تائید میسر تھی۔

حقوق نسواں کے علمبرداروں سے بنیاد پرستوں کے دشمنانہ رویے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جدید تعلیم نے مصر میں دو گروہوں کو خصوصیت سے فائدہ پہنچایا۔ ان میں سے ایک دیہات کے زیریں طبقہ کے افراد پر مشتمل تھا اور دوسرا شہروں کی متوسط اور بالائی طبقے کی لڑکیوں پر۔ مفت سرکاری تعلیم سے استفادہ کرنے والے ان دو گروہوں نے حالیہ دہائیوں میں نئے متوسط طبقہ کو جنم دیا ہے۔ دونوں کے درمیان تنازعہ عین فطری ہے۔ متحرک عرب دنیا میں موجود طبقاتی کشمکش میں سے ایک یہ بھی ہے۔ ان دو گروہوں کے مفادات مختلف ہیں اور توقع کی جانا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک دنیا کے متعلق اپنا انداز فکر و نظر لاگو کرنے

کی کوشش کرے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ بنیاد پرستوں کی سرگرمیوں کو سرکاری خفیہ اعانت و پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے جبکہ خواتین تنہا جدوجہد کرتی ہیں۔ چونکہ بنیاد پرست خدا کی ترجمانی اور اس کی طرف سے بولنے کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں چنانچہ نسوانی طبقہ الوہی تائید سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ خدا اور اپنی تاریخی روایت پر حق آج کی عورت کا دعویٰ ہے۔ اس کی کئی شکلیں ہیں۔ کچھ خواتین بنیاد پرست تحریکوں کے اندر کام کر رہی ہیں اور کچھ کا ارتکاز اسلامی ورثے کی توضیح نو پر ہے کیونکہ وہ اسے جدیدیت کا ناگزیر عنصر خیال کرتی ہیں۔ ماضی کا ازسرنو مطالعہ اور ہماری تہذیب کے اجزائے ترکیبی کی اضافی اہمیت کا ازسرنو تعین ہی ہمیں آزادی دلوا سکتا ہے۔ قرآن اور مساجد کا خواتین سے تعلق اتنا ہی زیادہ ہے جتنا اجرام فلکی سے۔ ہم ان کی کلیت پر یقین رکھتی ہیں۔ ان کے اندر موجود ہماری جدید شناخت کے اجزاء ترکیبی پر ہمارا حق ہے۔

خواتین بنیاد پرستوں کو تابع فرمان، خاموش تماشائی اور غیر فعال حصہ خیال کرنا مذہبی احتجاجی تحریکوں کو سمجھنے میں غلطی کے مترادف ہوگا۔ حق اور عدل جیسے تصورات کی اہمیت ہمارے پیش نظر ہے۔ اگر شروع میں ان تحریکوں میں خواتین کو مخصوص مقاصد کے حصول کی غرض سے بھی شامل کیا گیا تھا تو آج ایران اور الجزائر جیسے کئی مسلم ممالک میں ہم بنیاد پرست جماعتوں کے اندر سے طاقتور نسوانی قیادت ابھرتی دیکھ رہے ہیں۔ اپنے جائزوں میں ہمیں امتثالیت سے گریز کی سعی کرنا ہوگی۔ ہمیں اپنی آنکھیں کھلی اور اذہان تجزیاتی رکھنا ہوں گے۔ ایرانی ماہر معاشریات نیرہے توحیدی (Nayrehe Tohidi) اور حال ہی میں ''تشخص، سیاست اور عورتیں'' کے زیرعنوان ہونے والی کانفرنس کی شرکاء اس رویے کی مثال ہیں۔ انہوں نے نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ''بنیاد پرستوں کی صفوں سے بھی حقوق نسواں کا چیلنج ابھر رہا ہے اور باعث حیرت ہے۔''(17)

تعلیمی دنیا تک رسائی کے ساتھ ہی ساتھ عرب عورتوں نے عموماً اور مصری عورتوں نے خصوصاً تحریک حقوق نسواں کو وہ تقویت دی کہ پریس میں ان کے مضامین اور پمفلٹوں کی بھرمار ہوگئی اور یوں انہوں نے رویوں کو نہایت گہری سطح پر متاثر کیا۔(18) مصری خواتین نے تحریک آزادی کے دوران بھی نمایاں کردار ادا کیا اور اس کے بعد انفرادی حیثیت میں ان تھک محنت کی متاثر کن مثال ہدیٰ شعراوی کی ہے۔ چالیس کی دہائی میں عرب لیگ کے

منشور کے اولین مسودے میں خواتین کو ووٹ، تعلیم اور ملازمت کے حق کا بیان شامل کرنے کا فیصلہ کرنے کے عمل میں جو تیزی نظر آتی ہے اس کی وجہ ان خواتین کی انتھک کوششیں ہیں۔1970ء کی دہائی میں مصر کی نوال السعداوی عربوں میں پہلی بار رشتوں اور تعلقات میں مطلق العنانی اور جنسیت کو تشدد کی ایک خاص قلمرو کے طور پر زیر بحث لانے میں کامیاب رہی۔ نوجوان نسل سے تعلق رکھنے والے لاکھوں افراد نے ان کی کتابیں گھول کر پی لیں۔ کتابیں بلاشبہ ممنوع بھی قرار دی گئیں لیکن اس کا اثر الٹ ہوا اوران کی طلب بڑھ گئی۔ حقوق نسواں کی علمبرداروں کو سبق ملا کہ انہیں ''انتھک قلم'' کی سیاست کرنا ہوگی یعنی پولیس کی طرف سے ممانعت جتنی زیادہ بڑھے، لکھنے کا عمل اتنا ہی تیز کر دو۔ کسی عورت کی تحریر سنسر کر دی جائے تو اسے حوصلہ ہارنے کی ضرورت نہیں۔ پانچ صفحات روزانہ لکھنے کی بجائے اسے چھ یا سات صفحات لکھنا ہوں گے۔ مقصد یہی ہونا چاہیے کہ سنسرشدہ مواد سے آنے والی کمی پر پورا قابو پایا جائے۔ مختلف ادوار حکومت میں نوال کو پیش آنے والی قید و بند اس کے حوصلے پست نہ کر سکی۔ اس کی زیرادارت نکلنے والا رسالہ ''نون'' (NUN) اور اس کی تنظیم ''عرب خواتین کی یک جہتی'' (Solidarity of Arab Women) دونوں پر پابندی لگا دی گئی.....اول الذکر پر جنگ خلیج سے پہلے اور موخرالذکر جنگ خلیج کے بعد۔

تاہم اسّی کی دہائی میں سب سے زیادہ حیرت انگیز طرزعمل سعودی خواتین کی طرف سے دیکھنے کو ملا۔ بڑھتی ہوئی نگرانی اور تقریباً جیل جیسے ماحول میں رہنے کے باوجود ان میں سے کئی ایک 1970ء سے ہی ڈگریاں حاصل کرنے میں کامیاب ہونے لگیں۔1986ء میں یونیورسٹی پروفیسروں میں سے 32 فیصد خواتین تھیں۔(19) بلاشبہ یونیورسیٹوں میں صنفی تفریق موجود ہے لیکن یہ خواتین کو زیرنقاب ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں سجانے سے نہیں روک سکی جن میں سے بیشتر امریکہ اور برطانیہ کے معتبر اداروں کی طرف سے عطا کی گئی ہیں۔ اگرچہ ڈاکٹریٹ سے متصف خواتین کو تاحال سعودی عرب میں حجاب اور تحدید سے نجات نہیں ملی لیکن اتنا بہرحال ہے کہ ناخواندہ خواتین کی طرح انہیں فقط چولہے چوکے سے وابستہ خیال نہیں کیا جاتا۔ جدید تعلیم ایک نئی جہت متعارف کرواتی اور عورت اور اس کے گروہ کے درمیان تعلق کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ خلیجی جنگ کے دوران مٹھی بھر خواتین کی طرف سے عورتوں کی ڈرائیونگ پر عائد پابندی توڑنے اور ریاض میں کاریں دوڑائے پھرنے پر مذہبی

رہنماؤں کی چیخ و پکار کی یہی ایک تشریح ہوسکتی ہے۔

اگرچہ کوئی شعبہ خواتین سے خالی نہیں رہا لیکن کام کی ماہیت کے باعث یونیورسٹیوں میں ملازمت کے دوران خواتین کو تحقیق و تحریر کا موقع مل جاتا ہے۔ بطور صحافی، مدیران جرائد و رسائل، مصنف اور خصوصاً ناول نگار خواتین کی تحریروں نے بے پناہ اثرات مرتب کئے ہیں۔ (20) مغربی اشاعتی حلقوں کی رائے کے برعکس میں نے حقوق نسواں کا ادب اور خواتین کی لکھی گئی کتابیں خوب بکتی دیکھیں اور زیادہ تر خریدار مرد تھے۔ عرب دنیا خواتین کی تحریروں کو وقعت دیتی ہے اور کئی خواتین ناول نگار سالوں سب سے زیادہ بکنے والے مصنفین میں شمار ہوتی ہیں۔ مصری سلویٰ بکر، فلسطینی حیانہ بدر اور لبنانی غدۃ السمّن جیسی خواتین ناول اور تجزیہ نگار اور کویتی سعادالصباء، حامدہ نعنہ جیسی شاعرات کی کتابیں ہمیشہ کتب فروشوں کے ہاں تمام عرب دنیا میں دستیاب رہیں اور انہوں نے تیل کے پیسے سے لکھوائی گئی کتب کا بخوبی مقابلہ کیا۔ لیبیا کی فاطمہ محمود کے زیرادارت قبرص سے نکلنے والے جریدے ''شہرزاد'' کی ساری عرب دنیا میں مانگ ہے۔ اس میں عورتوں اور قدامت پسندقوتوں کے مابین تنازعہ پر تیکھے ترین تجزیے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ (21) اگرچہ بائیں بازو کے رسالے ابھی تک ختم نہ ہونے والی نظریاتی بحثوں اور ثقیل زبان کے قیدی ہیں' مصنفوں کے واضح اندازنگارش اور غلط و صحیح کو براہ راست آشکار کرنے کے ساتھ ساتھ مطلوبہ تبدیلیوں کو بغیر لگی لپٹی رکھے بیان کرنے کے باعث یہ رسالے خواتین میں اور ان کے حوالے سے بیداری میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

اسّی کی دہائی میں حجاب کی جانب رجوع کی پکار میں آنے والی شدت دراصل ثقافتی محاذ پر عورتوں کی سرگرمی اور فعالیت کا ردعمل ہے۔ رجعت پسند عناصر کی دشمنی میں آنیوالی شدت کی درست تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ ہم ترقی پسند عورتوں کے خیالات اور ان کے نتائج کار کے ایسے معاشرے میں سرایت کر جانے کو پیش نظر رکھیں جہاں عورت کی جہالت ایک مسلمہ روایت خیال کی جاتی ہے۔ قومی تحریک کے دوران مذہبی رہنما نہایت سرگرم رہے لیکن آزادی کے بعد انہوں نے فقط داد و تحسین پر تکیہ کیا۔ گذشتہ دہائی میں میں اچانک ایک اجنبی عفریت نے انہیں چونکا دیا۔ وہ اجنبی عفریت تعلیم یافتہ عورت تھی جو بے نقاب گلیوں میں اقوام متحدہ کے منشور کے نام پر اور سرکاری شریعت کے خلاف نعرہ زن تھی۔

رجعت پسندان نعروں پر اصوات الغرب (مغرب کی آوازیں) کا لیبل چسپاں کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں شہر میں اجنبی قوتوں نے بسیرا کر لیا ہے۔ عورتیں نقاب اتارتی ہیں تو کیا لگتی ہیں؟ ایک اجنبی قوت بالکل مغرب کی سی- اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ صورت حال سمجھ نہیں پا رہے اور ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ محمد پنجم یونیورسٹی میں میرے ساتھ پندرہ برس تک کام کرنے کے بعد بھی میرے شرکائے کار میں سے ایک ، جو مجھے خاصا پسند کرتا ہے، ابھی تک مجھے مقامی تسلیم کرنے کو تیار نہیں اور کئی ماہ ساحل پر گزارنے کے بعد بھی جب اگست میں میری رنگت زیتون کی سی سیاہ ہوتی ہے، وہ مجھے فاطمہ سویدیہ (سویڈن کی) کہہ کر بلاتا ہے۔ نمونے کی روایتی عورت کے تقابل میں جدید عورت کا یہ عفریت پن اتنا علم تک رسائی حاصل کر لینے کے باعث نہیں جتنا کہ اس دعویٰ کے باعث کہ وہ بھی ریاست کی ایک شہری ہے اور اس حوالے سے وہ اقوام متحدہ کے منشور اور انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ کی رو سے حکومت کو چیلنج کر سکتی ہے۔ مسلم دنیا اور خصوصاً بالائی طبقہ کبھی بھی تعلیم یافتہ خواتین سے خالی نہیں رہا اور وہ اکثر دینی علوم کی درس و تدریس میں تخصیص حاصل کرتیں۔ عمر کخلہ (Umar Kakhalla) نے چار جلدوں پر مبنی اپنی کتاب کا خاصا بڑا حصہ ان عرب اور غیر عرب مسلم خواتین کے لئے وقف کیا ہے۔ (22) لیکن انحطاط کے دور میں خوشحال طبقہ بھی ناخواندگی کا شکار ہوا اور نتیجتاً ملک نوآبادی بن گیا۔ (23) نیا مظہر عورت کا تعلیم یافتہ ہونا نہیں بلکہ ماضی کی روایت سے نقطہ انقطاع عورت کا ریاست کو چیلنج کرنا اور پھر اس چیلنج کو بطور مسئلہ لیتے ہوئے مذاکرات اور نئے معاہدے کے لئے زور دینا ہے۔ حکومت کی طرف سے عورت کو نظر انداز کرنا ایک روایت ہے۔ صرف بحران کے دنوں میں عورت پر توجہ دی جاتی ہے اور وہ بھی صرف تیز و تند حملوں کی صورت میں۔ مسلم عورتوں کی کوئی حکومت نہیں جو انہیں تحفظ فراہم کر سکے۔ ازمنہ وسطیٰ کی مطلق العنان جابر ریاست کے جدید ریاست میں بدلنے کے انتہائی سست رفتار سفر میں عورتوں کے المیے کی بنیاد یہی حقیقت مذکورہ بالا ہے۔ ان کے لئے ابھی جدید ریاست کا جنم نہیں ہوا۔ وہ اپنی جنگ خود لڑ رہی ہے اور ان کے خلاف ہونے والے تمام تر جبر و تشدد، جس کا انتخاب خود حکومت سے ہوتا ہے، کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ عدم مشاورت کو مقدس قرار دیتے ہوئے شخصی قوانین کے نفاذ کے وقت سے اسے قانونی حیثیت دے دی گئی ہے۔ یوں الجزائر کے بنیاد پرستوں کا اصرار سمجھ میں آتا ہے کہ انہیں

دوران انتخاب اپنی بیویوں کی جگہ ووٹ ڈالنے کی اجازت دی جائے۔ یوں مختلف میونسپل انتخابات کے دوران انہیں اپنی بیویوں کے ووٹ استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔(24) جدیدیت کا اصل مطلب عورتوں کا بطور ریاستی شہری سامنے آنا ہے اور اس عمل سے ریاست کی حیثیت میں اچانک تقلیب ہو جاتی ہے۔عورتوں کو بدترین خطرہ بے روزگاری سے لاحق ہے اور خدشہ ہے کہ اگلی دہائی میں انہیں نگل نہ لے۔ جمہوریت پر مبنی تعلقات کے لئے عورت کو ملنے والے گفت وشنید کے مواقع پر خلیجی جنگ کیسے اثرات مرتب کرے گی اور خطے میں بطور فاتح اور خطے کی اقتصادیات میں اپنے نئے اور غالب طاقت کے کردار میں مسٹر بش کے نئے ورلڈ آرڈر کی ذمہ داری کیا ہے؟

عورتوں پر خلیجی جنگ کے اثرات؛ بے روزگاری، تیل اور حجاب:

عرب ریاستوں میں استحکام کو بدترین خطرہ بے روزگاری سے لاحق ہے۔ اس کی وجوہات میں سے ایک آبادی میں اضافے کی شرح ہے۔ یہاں آبادی میں اضافے کی شرح 3.9 فی صد ہے اور یہ دنیا کے مختلف خطوں کی بلند ترین شرحوں میں سے ایک ہے۔ 1985ء سے 1990ء تک عربوں کی آبادی 188 ملین سے بڑھ کر 217 ملین ہوگئی۔ صرف پانچ سالوں میں عربوں کی آبادی میں 29 ملین اضافہ ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق 1990ء سے 2000ء تک اس آبادی میں 64 ملین کا اضافہ ہوگا۔ یعنی بیسویں صدی کے آخر تک عورتوں کی آبادی بڑھ کر 281 ملین ہو جائے گی۔(25)

عورتیں اس آبادی کا نصف ہیں۔1990ء میں ان کی تعداد 190 ملین تھی جو فرانس اور مغربی جرمنی کی مجموعی آبادی کے برابر ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کی تعداد 25 برس سے کم عمر کی ہے اور یہ ملازمت کے متلاشی افراد کی بہت بڑی فوج ہے اور حال یہ ہے کہ 1990ء میں ہی ہر تین عربوں میں سے دو چوبیس برس یا اس سے کم عمر کے تھے۔(26) اس عمر کے حامل گروہ میں سے آدھے 167.5 ملین بالغ ہیں۔ چنانچہ جب ہم عرب عورتوں کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد پختہ عمر اور طے شدہ طرز زندگی پر گامزن عورتیں نہیں ہوتیں بلکہ ہمارا واسطہ ملازمت کی متلاشی 83 ملین سے ہوتا ہے جو شادی میں جلدی نہیں کریں گی کیونکہ انہیں بھی اپنے مستقبل کی فکر ہے اور یہ پہلے تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ کبھی اوائل عمری کی

شادی عرب دنیا کا غالب رواج ہوا کرتا تھا لیکن اب یہاں شادی کی عمر میں قابل غور التوا دیکھنے میں آ رہا ہے۔(27) اور چونکہ اس نوعیت کی تبدیلی کی پہلے سے پیش گوئی نہیں کی جا سکی تھی اور نہ ہی کوئی باقاعدہ قوانین وضوابط بنانے جا سکے تھے چنانچہ شادی کے بغیر بچوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ الجزائر کے رہنما شیخ مدنی جو ماہر معاشریات ہیں، اس ساری شماریات سے بخوبی واقف ہیں۔ حجاب کی طرف مراجعت پر جبر کے ذریعے وہ مزدوری اور ملازمت کی منڈی میں عورت کی موجودگی کو غیرقانونی قرار دے رہے ہیں۔ یہ غیرمعمولی طاقت ور سیاسی ہتھیار ہے۔

بحران سے دوچار سیاسی رہنماؤں کے لئے حجاب من وسلویٰ سے کم نہیں ہے۔ یہ محض کپڑے کا ایک ٹکڑا نہیں بلکہ محنت کی تقسیم ہے۔ حجاب عورتوں کو واپس باورچی خانے میں دھکیلنے کا عمل ہے۔ اگر شریعت کو مطلق العنان جابر خلفاء کے انداز نظر سے دیکھا جائے تو کوئی بھی مسلم ریاست محض اس کا سہارا لے کر اپنی بے روزگاری کی سطح نصف کر سکتی ہے۔ یہ ریاستیں اسی وجہ سے بنیاد پرستوں کو گلیوں میں مظاہرے منعقد کرنے والے چند افراد تک محدود کرنے کے عمل سے اس قدر گریزاں ہیں۔ حکمرانوں کے اس طرز عمل کو علاقائی اور عالمی اقتصادی صورت حال کے تناظر میں اور تیل کی دولت اور مغرب کی طرف سے ہمارے لئے تجویز کردہ نیو ورلڈ آرڈر سے منسلک کر کے دیکھنا ضروری ہے۔

بلاشبہ مغرب خلیجی جنگ میں فاتح رہا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ عرب دنیا کا سب سے زیادہ قدامت پسند اور حقوق انسانی سے متنفر سعودی عرب نہ صرف زیادہ طاقت ور بلکہ ہمارے مستقبل کی تشکیل کے حوالے سے پہلے کسی بھی دور سے زیادہ موثر اور فیصلہ کن قوت کے طور پر سامنے آیا۔ دنیا میں موجود کل تیل کا دو تہائی تا حال عرب کے نیچے محفوظ پڑا ہے۔

اگر کئی ملین عرب اپنے مسائل کے حل کے لئے اس دولت سے استفادے کا دائرہ کار پھیلانے کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ کچھ اتنا ناجائز یا غیرمعمولی طرز عمل نہیں ہے۔ سعودی عرب نے جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہے اسے لبنانی مصنف جارج کارم (George Corm) کے جملے ''تیل کے ظلم میں ناقابل مزاحمت زیادتی'' سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ سعودی عرب ان کئی ملین بے روزگاروں کو اسلام کے پروپیگنڈے سے ٹھنڈا اور بے حس رکھنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اسلام میں ''حق'' اور ''عدل'' کے تصورات سے وہ دھماکہ خیز قوت منضبط ہوتی ہے جو ان

نوجوانوں کے احساس محرومی کی ترجمان ہے۔

بنیاد پرستی میں تیل کے کردار کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس حوالے سے تیل کی سعودی دولت بیک وقت دو محاذوں پر استعمال ہو رہی ہے۔ ایک طرف اسے ترقی پسندانہ نظریات کی مزاحمت میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف اسے شاہانہ اسلامی تمدن کی اشاعت و ترویج میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ یوں بحیثیت مجموعی ایسی مطلق العنان حکومت جنم لیتی ہے جسے رحمہ کا نام دیا جاتا ہے۔ سعودی عرب میں بنیاد پرستی کے لئے زیادہ بہتر نام پیٹرو وہابیت (Petro Wahhabism) ہوگا جس میں حجاب پوش عورت کو ستون کی حیثیت حاصل ہے۔

شمالی افریقہ میں عوام الناس نے عراق پر بمباری کے خلاف جو مظاہرے کئے اس کی وجہ جزواً سعودی عرب سے ان کی مخاصمت بھی تھی۔ ان کے خیال میں اس ملک کے حکمران عالمی شطرنج کا اہم مہرہ ہوتے ہوئے بھی خطے میں بیروزگاری ختم کرنے کے انتظامات کی اہلیت ثابت نہ کر پائے۔ خلیجی جنگ نے اصل مسئلہ کی نشان دہی کر دی ہے کہ جمہوریت کی عدم موجودگی کے باعث تمام دولت پر چند خاندانوں کی اجارہ داری قائم ہے۔ دوران جنگ کویت کی طرف سے صدر متراں کو بحران سے نکالنے کے لئے ادا شدہ دولت کی خبریں عام ہوئیں تو عرب دنیا کے شہروں میں کیئے جانے والے تبصروں میں اسے آخری حدود کو چھوتی غیر منصفانہ لایعنیت قرار دیا گیا۔ عوام الناس کا ایقان پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہوگیا کہ عرب ریاستوں میں جمہوریت لائے بغیر بے روزگاری کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔

سرحدوں سے ناآشنا اس جنگ نے ایک ایسے عہد کا آغاز کیا ہے جس میں ذمہ داری بھی سرحدوں سے ناآشنا ہوگی۔ عرب نوجوانوں پر اس تنازعے میں فیصلہ سازی کی صلاحیت سے محروم سعودی قیادت کی اہلیت کھل گئی ہے اور وہ اس ملک میں ہاتھ کاٹے جانے کی ذمہ داری محض اس حکومت پر نہیں ڈالتے۔ سب سے اہم یہ کہ انہیں علم ہوگیا ہے کہ اسلام اس طرح کی دہشت ناکی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ یہ ایسی حکومت کے افعال ہیں جو اسے وقت سے پچھڑے ہوئے بلکہ عہد عتیق کے قوانین پر تقدس کا پردہ ڈالنے کے لئے استعمال کرتی ہے- اور یہ کہ جو کچھ سعودی حکومت مسٹر بش کے ہم پر ٹھونسے گئے نئے عالمی نظام (New World Order) کے تحت کر رہی ہے اس میں اسلام کا کوئی قصور نہیں۔ امریکی صدر نے علاقے کی اخلاقی ذمہ داری قبول کی ہے۔ فرانس کے صدر متراں، جرمنی کے صدر ہیلمٹ

کوہل اور انہیں منتخب کرنے والی ان مغربی جمہوریتوں کے عوام بھی ان کے شریک کار ہیں۔

اور ستم ظریفی یہ ہے کہ خلیجی جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ تیل، جو اس سارے تنازعے کی بنیاد ہے اور جس نے علاقے میں ختم نہ ہونے والی دشمنیوں کو تا حال صرف ہوا دی ہے' تمدنوں کو باہم قریب لانے اور ذمہ داری کے احساس کو اثر انگیزی بھی دے سکتا ہے۔ مغرب کو عربوں کے تیل کی ضرورت ہے۔ ہم اس امر سے بے خبر نہیں ہیں لیکن کیا اہل مغرب اس امر کو سمجھنے کے لئے بھی تیار ہیں کہ تیل کے فوائد کو محض اپنے تک محدود جاننے کا رویہ ان کے لئے کس درجہ غیر مناسب ہے؟ اس جنگ نے ذمہ داری کو بین الاقوامی سطح پر محسوس کئے جانے کی ضرورت کو اجاگر کیا ہے اور یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اس چھوٹے سے سیارے پر تعلقات کو دیکھنے کے کئی دیگر انداز اور طریقے بھی موجود ہیں جنہیں اختیار کرنا ہم سب کے لئے ممکن ہے۔ آیئے کچھ منظرناموں کا جائزہ لیتے ہیں جو بحیرہ روم کے علاقے کی کچھ ممکنات کو بیان کرتے ہیں جن میں خواتین کا تحفظ بھی شامل ہے۔

پہلا منظرنامہ:

کیا تیل کی ضرورت مند مغربی جمہوریتیں جو اس کشاکش میں فاتح رہیں اس اچانک مل جانے والے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عرب دنیا میں جمہوریت کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گی۔ کم از کم اس وقت مغرب جمہوریت کے عوامی مطالبات پر کان نہ دھرنے والی عرب ریاستوں پر بے پناہ اقتصادی دباؤ ڈال سکتا ہے۔

کیا کویت کو بچانے کے لیئے لپکنے والے جنرل اور بینکار حقوق سے محروم عرب عورتوں کو بچانے کے لئے بھی آگے بڑھیں گے؟ مستقبل بتائے گا کہ مغرب جمہوریت کے لئے، جس سے پناہ محبت کا سبق اس نے ہمیں دیا ہے، قربانی میں کس حد تک جا سکتا ہے؟ مغرب کو ہم پر عیاں کرنے کا موقع ملا ہے کہ اس کے مثالیئے واقعی ایسی تہذیب کی بنیاد ہیں جو دوسری کسی بھی تہذیب کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ اور اخلاقیات کی موئید ہے۔ جنگ کے نتیجے میں عرب دنیا میں موجود حالت استقرار (Status Quo) کو تقویت ملی ہے۔ عرب ممالک میں جمہوریت کا فروغ بجائے خود مغرب کے لئے بھی مفید ہوگا۔ وہ یوں کہ جمہوریت کا مطلب اختیارات کا نوجوانوں کے ہاتھ لگنا ہوگا جو تیل کی دولت کو خود اپنے

مفاد میں استعمال کرنے کو ترجیح دیں گے؟

کیا مغرب اس امر پر راضی ہو جائے گا کہ وہ ان حکومتوں کے جائز ہونے پر اپنے وثوق کا اظہار ذرا کم شدت سے کرے جنہیں اس نے ابھی ابھی طوفان سے بچایا ہے؟ کیا مغرب ترقی پسند قوتوں کی معاونت کرے گا تا کہ ایسا مہذب معاشرہ وجود میں آئے جو نہ صرف فیصلہ سازی کے عمل میں حصہ لے بلکہ وسائل کے استعمال کا حساب بھی مانگ سکے؟ عظیم یورپی اور مغربی عوام کے لئے یہ منظرنامہ ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے؛ ان عوام کے لئے جو عالمگیریت اور جمہوریت کے لئے اپنی محبت کا اس قدر پرچار کرتے ہیں۔

دوسرا منظرنامہ:

یا یہ کہ مغرب اپنا اثر ورسوخ محض موجودہ حالت کو برقرار رکھنے کے لئے استعمال کرے گا اور مدد کیلئے پکارنے والی حکومتوں کے جائز ہونے کی توثیق کرتا رہے گا؟ اگر مغرب ان حکومتوں کو جائز قرار دینے کی ترجیح کا انتخاب کرتا ہے تو انہیں بنیاد پرستی کا ہتھکنڈہ استعمال کرنے کی شہ ملے گی۔ عورتوں کو ایک بار پھر حجاب کی پابندی پر مجبور کیا جائے گا اور ترقی پسند قوتیں سوائے خاموشی سے دعا کے اور کچھ نہ کر پائیں گی۔ طاعت پر مبنی سیاست سیٹلائیٹ سے نازل ہوتے ٹیلی پیٹرو اسلام (Tele Petro Islam) کا ایک عقیدہ بن کر رہ جائے گی۔ نوجوانوں کو منتقل کرنے کے لئے جو ورثہ مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ یہی مذکورہ بالا عقیدہ ہے۔ چونکہ الیکٹرانک ایجنڈے کے ذریعے ذہن نشین کروا دیا گیا ہے کہ عرب نوجوان نسل کے لئے جدید ورثہ فقط یہی طرز ابہام ہے نتیجتاً جمہوریت کیلئے آواز بلند کرنے والوں پر تشدد کی ایک بوچھاڑ ہوگی اور مجرموں میں خواتین کو سرفہرست رکھا جائے گا۔ اس سارے عمل کی ذمہ داری بڑی حد تک مغرب پر ہوگی۔ اقتصادیات اور ذمہ داری کی گلوبلائزیشن کے بعد شمال اور جنوب کی خوش قسمتی اور بدقسمتی باہم متحد ہیں۔ مغرب کی نوجوان نسل گلوبلائزیشن کے حوالے سے بہت حساس ہے۔ مستقبل قریب پر اس کی پرچھائیاں انہیں خوفزدہ کر دیتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یگانگت اور رحمہ جیسے اور بہت سے امکانات کی امید بھی ان کے اندر موجود ہے جس میں صلیبی جنگیں بہرحال شامل نہیں ہیں۔ فرانس، جرمنی اور اٹلی کی نوجوان نسل اس چیز سے خوفزدہ ہے جسے ذرائع ابلاغ ''عرب دراندازی'' کا نام دیتے

ہیں۔ لیکن کیا پیٹرو ڈالر کے بہاؤ اور عرب سیاحوں کے لئے ویزا کے سلسلے میں روزافزوں کڑی شرط کی موجودہ صورت حال کو برقرار رکھا جائے گا۔ کیا کوئی عالمگیریت کے پرچار اور سرحدوں پر دیواریں کھڑی کرنے جیسے متضاد کام بیک وقت کر سکتا ہے۔ کیا عربوں کی یورپ ہجرت کو روکنے کا بہترین طریقہ یہ نہیں کہ بحیرہ روم کے خطے کی اقتصادیات تیل کے بہتر انتظام پر استوار کی جائے تا کہ ہر جگہ روزگار کی فراہمی اور جمہوریت کو یقینی بنایا جا سکے؟ کیا مغرب فوجی اور خلائی ٹیکنالوجی کو اپنی اقتصادی بنیاد کے طور پر برقرار رکھتے ہوئے ایک ایسی دنیا کے اپنے مثالیئے کو حقیقت کی شکل دے سکتا ہے جبکہ اس کی پیداوار نے دنیا بھر اور خصوصاً عرب علاقے کی منڈیوں میں بھرمار کر دی ہو؟

صدام حسین کی ''مہیب اور خوفناک فوجی قوت'' کو تباہ کرنے کی خواہش قابل تعریف ہے۔ لیکن یہ طرز عمل صرف اسی وقت قابل اعتبار نظر آتا ہے جب مغرب اپنی ان کوششوں کا انضمام صرف ایک علاقے کو عسکریت سے پاک کرنے کی بجائے پورے سیارے کو پیش نظر رکھے۔ صدام حسین کی نیوکلیائی اہلیت کو تباہ کرنا اور اسی دوران علاقے کے دوسرے ممالک کے اسلحہ خانے ازسرنو بھرنا اور مغربی عسکری صنعت میں سرمایہ کاری کرتے چلے جانا یقیناً پرامن مستقبل کے حصول کا غالباً بہترین طریقہ نہیں ہے۔ اسلحہ کی خریداری پر عرب ممالک اپنی مجموعی پیداوار کا جتنا فیصد صرف کرتے ہیں، وہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر سعودی عرب اپنی مجموعی قومی پیداوار کا ایک چوتھائی ہتھیاروں پر خرچ کرتا ہے۔ یہ تناسب اردن، ڈیموکریٹک ریپبلک آف یمن اور شام کے لئے بالترتیب سولہ، سولہ اور سترہ فی صد ہے۔ اس دور میں فرانس، سابقہ مغربی جرمنی، اٹلی، سویڈن، سپین، کینیڈا اور جاپان نے دفاع پر اپنی کل قومی پیداوار کا فقط 4 فی صد، 3.1 فی صد، 3.2 فی صد، 1.7 فی صد، 3 فی صد، 3.2 فی صد اور ایک فی صد خرچ کیا۔

خلیجی جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ ہتھیاروں کے انبار کسی مفید مصرف میں نہیں آ سکتے۔ اگر عرب ممالک اپنی اقتصادیات اسلحے کی درآمد جیسے اخراجات کے لئے وقف رکھیں گے تو عرب خواتین اپنے معاشروں کی نسواں مخالف قوتوں پر کیسے غالب آئیں گی اور باتنخواہ کام کے گھر سے نکل پائیں گی؟ بیروزگاری سے متاثرہ کوئی بھی معاشرہ عورتوں کے ساتھ رعایت برتنے کو تیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ اگر مغرب عرب ممالک کو اسلحہ کی فروخت جاری رکھتے ہیں تو

عورتوں کے اپنے معاشروں میں نئے رشتے قائم کرنے کی جدوجہد میں کامیابی کے امکان کم ہوتے چلے جائیں گے۔

بڑھتی ہوئی بے روزگاری کی وجوہات میں سے ایک قرض بھی ہے، جس کا تعلق ناگزیر طور پر اخراجات سے ہے۔ 1989ء Memento Defense Desarmament میں جریدے کے مدیران کے تخمینہ کی رو سے ''اگر تیسری دنیا کے مقروض ممالک نے اسلحہ نہ خریدا ہوتا تو 1979ء سے قبل تک ان کے حاصل کردہ قرضہ جات کی کل مقدار 20 سے 30 فی صد تک کم رہی ہوتی۔ ہتھیاروں کی خریداری کے تقریباً نصف سے زیادہ معاہدے براہ راست یا بالواسطہ قرض کی رقم سے پایہ تکمیل کو پہنچے اور یہ ترقی یافتہ ممالک کے بیرونی قرضہ جات کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔(31)'' اس قرض کے سائے میں بنیاد پرستی پھلی پھولی اور اس کا احاطہ کار وسیع ہوا۔ مدیران نے فوجی اخراجات اور قرض سے پیدا ہونے والی افراط زر کے درمیان واضح تعلق قائم کیا ہے۔ انہیں اس مقصد کے لئے ایک تصور متعارف کروانا پڑا جسے انہوں نے ''برمحل یا مناسب قیمت'' کا نام دیا۔

''اسلحہ کی خریداری نہ کرنے کی صورت میں دوسری درآمد کیلئے جو اثاثے دستیاب ہو سکتے تھے انہیں ''برمحل قیمت'' کہا جاتا ہے۔ یہ تصور اس حقیقت پر مبنی ہے کہ فوجی اور غیر فوجی ہر دو طرح کی درآمدات کے لئے مالی وسائل کا صرف ایک ذریعہ دستیاب ہے یعنی برآمدات- بڑھتی ہوئی درآمدات کا مطلب بڑے بجٹ ہیں جنہیں فی الوقت صرف برآمدات سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں کسی بھی حکومت کے پاس اختیار کرنے کو صرف تین طریقے ہوتے ہیں۔ (1) وہ اپنی فوجی درآمدات کم کرے (2) یا تجارتی درآمدات کم کرے یا (3) قرضہ جات کے ذریعے اپنے غیرملکی کرنسی کے ذخائر میں اضافہ کرے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ تیسرا طریقہ سب سے زیادہ استعمال کیا گیا۔''

عسکری ساز وسامان کی درآمدات کا انتخاب عرب شہریوں اور بالخصوص خواتین کے مفاد سے متصادم ہے۔ بائیں بازو کی کوئی بھی تحریک اگر خطے میں لاعسکریت کی ترویج کو اپنی ترجیحات میں نہیں رکھتی تو اس کے پاس کوئی سنجیدہ اور متبادل لائحہ عمل موجود نہیں۔ عرب عورتوں کو لازماً لاعسکریت کے اس مسئلے پر متحرک کرنا ہوگا بصورت دیگر ان کے مقدر کی بہتری کا کوئی بھی تصور ایک کارعبث ہوگا۔ عرب ممالک کے پاس ایک ہی رستہ ہے کہ وہ

جاپان کی پیروی کریں جو اپنے بجٹ کا صرف ایک فی صد دفاع کے لئے مختص کرتا ہے، کم نہ زیادہ.....اس لائحہ عمل کے اختیار کر لئے جانے کی صورت میں نقصان کسے ہوگا؟ مغربی ممالک کے اسلحہ سازی کے کارخانوں اور دلالوں کو۔ بس، اور کسی کو نہیں.....اور فاتح کون رہے گا؟ ساری دنیا جس کے سرخیل مغربی دنیا کے شہری ہوں گے۔ اسلحہ کی بجائے دوسری اشیاء کی پیداوار پر ارتکاز اس امر کا بین ثبوت ہوگا کہ مغرب کو عالمگیر اقدار کی ترویج سے واقعی کوئی سروکار اور دلچسپی ہے۔

دوران انتظار ہم جولیا کرسٹیوا (Julia Kristeva) کے سنگ ایک ایسے مستقبل کا خواب دیکھ سکتے ہیں جس میں غریب ''اجنبی'' اور خوفزدہ کر دینے والا نہیں ہوگا۔ کیا ''اجنبی''، جو ابتدائی معاشروں (Primitive Societies) میں ''دشمن'' کے مترادف ہے' جدید دنیا کے منظر سے غائب ہوسکتا ہے۔

میری رجائیت پسندی ناقابل شکست ہے۔ ہمارے پاس آج ایک بہتر دنیا کی تخلیق کے لئے جو مواقع موجود ہیں، پہلے کبھی میسر نہ تھے۔ میں تیسری دنیا کے ان کئی ملین لوگوں میں سے ہوں جنہیں ابھی حالیہ زمانے تک علم کے میدان سے باہر رکھا گیا- اس من وسلویٰ تک ان کی رسائی کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ ہمیں شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہونے اور بیسویں صدی کو بیچارگی اور بے بسی کا زمانہ قرار دینے سے بچنا چاہئیے۔ کم از کم تیسری دنیا کے ممالک کے لئے یہ نہایت شاندار صدی ہے، یعنی ان ممالک کے لئے جو مادی، سیاسی اور تمدنی محرومی کے جمود کا شکار رہے ہیں۔ میرے وطن جیسے ممالک میں کئی ڈاکٹر اور ذہین پروفیسر ایسے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا آغاز گلہ بانی سے کیا اور وہ اس حقیقت کو بیشتر اوقات ایک خاص طرح کے فخر سے یاد کرتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب انہیں اپنے طالب علموں تک تیسری دنیا کے ان باسیوں کے احساسات پہنچانا مقصود ہوتے ہیں جنہیں علم تک رسائی ہوئی جس کی انہیں کوئی امید نہیں تھی۔ آیئے ہم کم ہتھیاروں اور زیادہ تعلیم کا رستہ اختیار کرتے ہیں۔ تبھی ہمارے پاس وہ دنیا ہوگی جس میں سفر کرنا مجھے محبوب ہوگا۔ ایسی دنیا جس کی تخلیق میں حصہ لینا میرے لئے باعث فخر ہوگا۔ مجھے خبر ہے کہ کروڑوں بے نام لوگ ہیں جو اسی طرح کی دنیا چاہتے ہیں۔ صوفیاء میں سے میرے

MashalBooks.org

پسندیدہ ترین فریدالدین عطارؒ نے نوصدیاں قبل ایک عجب شاندار زمین کا خواب دیکھا تھا جس کے باسی ہمیں جیسے خیالی پرندے تھے وہ پرندے اڑنا اور سفر کرنا چاہتے تھے لیکن خوفزدہ تھے۔ تاہم علم کی شدید خواہش نے ان کی زندگیاں بدل دیں، جس صوفی اسلام کے گیت عطارؒ نے گائے، مغربی ذرائع ابلاغ اس سے قطعی لاعلم ہیں۔ یہی صوفی اسلام غالباً الیکٹرانی ایجنڈے کے لئے واحد کامیاب چیلنج ثابت ہوسکتا ہے۔ اسی اسلام کے پاس دنیا کے لئے وہ کچھ ہے جس کی جگہ الیکٹرانی ایجنڈا لے سکتا ہے اور نہ ہی اس کے لئے خطرہ بن سکتا ہے۔ یہ ایسی روحانیت ہے جو پرواز عطا کرتی ہے اور آپ کو دوسرے کے لئے پھول کی مانند کھول دیتی ہے۔ پھول کو ''غریب'' سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ غریب سیمرغ کی صورت بھی ہوسکتا ہے اور ہم سب کے باطن میں ایک سیمرغ موجود ہوتا ہے۔

نتیجہ

سیمرغ ہم میں ہیں

ایران کے شہر نیشا پور کا واقعہ ہے کہ بہار1175ء میں ایک شخص نے ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا جو ہر طرح کے خوف و خدشہ سے پاک تھی، جس میں حد بندیاں نہیں تھیں اور جس میں بہت دور تک سفر کے بعد بھی خود کو ایسے اجنبیوں کی محفل میں پاتے جنہیں آپ اتنی ہی اچھی طرح جانتے ہیں جتنا خود کو.....وہ اجنبی جارح ہیں اور نہ ہی دشمن۔

عطار نیشا پور میں طویل غور و فکر اور مراقبہ کے بعد ایک ایسی تخیلاتی دنیا بسانے میں کامیاب ہوئے جہاں اجنبیت ہمیں فقط ہمارے ممکنہ درجہ کمال تک پہنچاتی تھی۔ عطار نے اپنا خواب کاغذ پر منتقل کیا تو ایک طویل نظم وجود میں آئی جسے انہوں نے منطق الطیر (پرندوں کی کانفرنس) کا نام دیا۔ نظم فوراً مشہور ہوگئی لیکن ایک رات جہالت اور تشدد نے عطار کے دروازے پر دستک دی۔1230 میں چنگیز خان کے منگول سپاہیوں نے عطار کو قتل کردیا۔

شاعر مر گیا لیکن اس کا خواب صدیوں سے بے نیاز ہوکر آج بھی ہمیں مسحور کرتا ہے۔

ہزاروں پرندوں نے سیمرغ نامی ایک خیالی مخلوق کا نام سن رکھا تھا اور اسے دیکھنے اور جاننے کو متجسس تھے۔ سب نے ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے اس مقام کے سفر کا ارادہ کیا جہاں انہیں سیمرغ کے پائے جانے کی خبر دی گئی تھی۔ وہ اس ضوفشاں خیالی مخلوق سیمرغ کی تلاش میں برسوں دریا اور سمندر پار کرتے رہے۔ بیشتر پرندے سفر ختم کرنے سے پہلے رستے میں ہی مر گئے۔ آب و ہوا کی سختی اور سفر کی تکان نے بہت سوں کو نیست و نابود کر دیا۔ صرف تیس پرندے اس افسانوی سیمرغ کے قلعہ کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن بالآخر جب ان کا استقبال ہوا تو شدید حیرت کا عالم ان پر طاری ہوگیا۔

وہاں پہنچے تو ایک جہان حیرت ان کا منتظر تھا۔ اگر یہ علم ہو کہ فارسی میں سی، اور ''مرغ'' بالترتیب ''تیس'' اور ''پرندوں'' کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں تو ان کی حیرت ناقابل فہم نہیں رہتی۔

وہاں سیمرغ کے ضوفشاں چہرے میں انہیں
اپنا آپ یعنی دنیا کے تیس پرندے نظر آئے۔
وہ حیرت میں گم سم اسے ٹکٹکی باندھے تکتے رہے
وہ خود ہی مرغ تھے اور سفر کے اختتام پر بھی
انہوں نے جو سیمرغ دیکھا.....ان کی نظریں خود اپنے آپ پر جمی تھیں۔
وہاں کھڑا ایک اور سیمرغ نظر آیا
پتہ چلا کہ دونوں ایک ہیں،

ان تیس ششدر و خیراں پرندوں نے سیمرغ سے درخواست کی کہ وہ اس عجب وقوعہ کی وضاحت کریں۔ اس پر سی مرغ نے انہیں ایک آئینے کا بتایا جو تمام عالم مع اس کی رنگا رنگ مخلوق اور ان کی الگ الگ شناخت بھی منعکس کرتا تھا۔ اس پر وہ سیمرغ کہنے لگے کہ براہ کرم اس راز پر سے پردہ اٹھائیں کہ یہ جو ''ہم'' ہیں ''آپ'' سے الگ متشخص کیوں ہیں؟ سیمرغ نے انہیں جو وضاحت دی وہ ہمارے لیڈر آج آٹھ صدیاں گزرنے پر بھی نہیں سمجھ پائے۔ وہ یہ حقیقت نہیں سمجھ پائے کہ کل عالم انفرادیت کا آئینہ ہوسکتا ہے اور یہ کہ اس کی مجموعی طاقت ہی عظیم نفرت بن سکتی ہے۔

''میں تمہاری آنکھوں کے سامنے رکھا آئینہ ہوں
اور جو بھی جو میری آب و تاب کے سامنے آتا ہے
خود کو ایسا ہی پاتا ہے اور یہی اس کی بے مثال اصل ہوتی ہے۔
اور تم کہ سی مرغ تیس پرندوں کی شکل میں آئے ہو اور اسی لئے دیکھتے ہو
یہی تیس پرندے جو کہ تم خود ہو، تیس سے زیادہ نہ اس سے کم
اگر تم یہاں چالیس، پچاس کے جھنڈ میں آئے ہوتے
تم پر جواب چالیس پچاس کی شکل میں کھلا ہوتا
اور چونکہ تم فقط سی مرغ کے جھنڈ کی صورت آئے تھے،
تم نے مجھے دریافت بطور سیمرغ کیا
سیمرغ، حق کا حتمی بے داغ نگینہ، وہ نور
جس میں تم اپنے فانی نظاروں میں کھو جاؤ گے
بکھر کے عدم میں کھو جاؤ گے، حتیٰ کہ ایک بار پھر
تمہیں میرے وجود میں اپنی اصل ملے گی۔

عطارؒ کے زمانے سے مشرق کے شاہی محلوں میں ممنوع سیمرغ نے عورتوں کی داستانوں اور بچوں کے خوابوں کو قبضا رکھا ہے۔ آج تکثیر کے لئے بلند کی جانے والی آواز کو مابعد الطبیعیاتی استعاروں میں چھپانے کی ضرورت نہیں۔ ہم سائنسی ترقی کی بدولت ایک بالکل نئی دنیا وجود میں لا سکتے ہیں۔ اس ترقی کی بدولت ہم مسلسل ابلاغ اور لامحدود باہمی گفت وشنید کے باعث ایسا عالمی آئینہ تخلیق کر سکتے ہیں جس میں تمام تمدن اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے منعکس ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس نئی دنیا کے وجود میں آنے کی امید سے زیادہ سرخوشی کوئی چیز نہیں دے سکتی اور اس پر مستزاد ایقان ہے کہ ہمیں آگے ہی آگے بڑھنا ہے اور کوئی حد بندی مزید موجود نہیں جو ہمیں خوفزدہ کر سکے ہم اس پاتال سے اور ہوا سا سبک رو ہونا کیسے سیکھ پائیں گے۔ ہم جنگلوں کی طرح اپنے دفاع سے بے نیاز کیسے رہیں گے؟ ہم اپنے ملک کی بے یقینی کیسے دور کر پائیں گے؟ نئی کہکشاؤں کے اس سفر میں یقیناً شاعر ہی ہمارے رہنما ہوں گے۔

حواشی

1- خلیجی جنگ، خوف اور اس کی سرحدیں

1- حجاب اور خصوصاً اس کے صوری، مکانی اور اخلاقی پہلوؤں پر میری کتاب دیکھیں جو امریکہ میں The veil and the Male Ethics A Feminist Interpretation of Women and Islam, An Historical and Theological Enquiry اور برطانیہ میں Women Rights In Islam ''کے نام سے چھپی۔

2- برآمد کے لیئے جوتے بنانے والی فیکٹریوں کا رد کیا گیا مال سوق السبت کو بھیج دیا جاتا ہے۔ تنگ گلیوں پر مشتمل یہ علاقہ گپ شپ کے لئے نہایت موزوں ہے۔ اہم سیاسی مواقع پر تمام ٹی وی اور ریڈیو چلتے رکھے جاتے ہیں اور خبروں کے وقت خرید و فروخت رک جاتی ہے۔ کیسابلانکا کی فیکٹریوں کے کارکنوں سے دوستی کی بناء پر علی اور اِس کے ہمسایہ دکاندار اپنے گاہکوں کے پاؤں کے مطابق اور ان کے من پسند رنگ اور ڈیزائن کے جوتے بنوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جوتا سازی کی بڑی صنعت کے پہلو بہ پہلو اِن چھوٹی دکانوں اور فیکٹری کارکنوں کے مابین غیر رسمی تعلقات کی بدولت فیشن کا خیال رکھنے والا اور، خصوصاً ،نوجوان گاہک یہاں کھنچا چلا آتا ہے۔

3- تاریخ درج کرنے کے اس طریقہ میں پہلی تاریخ مسلم کیلنڈر اور دوسری مسیحی کیلنڈر کے مطابق درج کی گئی ہے۔

4- ''عورہ'' کے مطلب کے لیئے دیکھئے، تفسیر طبری (بیروت دارلفقیر) جلد 21، صفحہ

-136

5- جاہلیہ کے تبرج کے لیئے دیکھئے، آیت 33، سورہ 33- اِس کی تفسیر کے لیئے طبری کی تفسیر، جلد 21، صفحہ 36- علاوہ ازیں دیکھئے آیت 60، سورہ 24 (اور تفسیر طبری، جلد 18، صفحہ 165) جہاں یہ بیان ہے کہ سن یاس کو پہنچ جانے والی عورتیں نقاب اتار سکتی ہیں-

6- ''محصنات'' (مامون عورتیں) کے لیئے دیکھئے، آیت 25-24، سورہ 4 اور تفسیر طبری، جلد پنجم-

2- اجنبی مغرب کا خوف

1- یہاں میں نے عبدالفتاح کلیتو سے استفادہ کیا ہے، جس نے سب سے پہلے مغرب اور اجنبیت کے باہمی تعلق کا تجزیہ کیا تھا- دیکھئے ''الادب و الغرب'' (بیروت 1982ء)

2- ''الف لیلہ واللیل'' ترجمہ رچرڈ ایف برٹن، مطبوعہ بیروت، جلد چہارم، صفحہ 31-130

3- ایضاً، صفحہ 32-131

4- یہاں مجھے اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ میں ''اسلام'' اور ''عرب'' کی اصطلاحات ایک سے معنوں میں کیوں استعمال کر رہی ہوں اور یہاں سے آگے عربی زبان اور عرب تجزیے کا خصوصی حوالہ کیوں ہوں گے- یقیناً اسلام میں دوسرے تمدنوں کی خدمات کم مایہ نہیں ہیں- میں خود کو عرب اتحاد پر تفصیلی گفتگو کے مقام پر نہیں پاتی، کیونکہ بیشتر اہل مراکش کی طرح میں نسلاً بربر ہوں- عرب لیگ کی تشکیل کے وقت بھی اس مسئلے نے سر اٹھایا تھا- عرب لیگ عربوں پر مشتمل ہے تو اس میں بربر اور سوڈانی کیا کر رہے ہیں- مراکشی رہنما علل الفصی نے اپنی کتاب ''الحرکہ الاستقلالیہ فی المغرب'' (عرب مغرب میں تحریک آزادی) میں وضاحت کی تھی کہ لیگ کے چارٹر کی ایک شق کی رو سے المغرب کے ممالک عرب دنیا کا جزو لازم ہے اور اس کی بنیاد انہوں نے تمدن کے فرق کو نظر انداز کرنے پر رکھی تھی- ایسا نہیں کہ ''عرب'' اور ''مسلمان'' ہونا ہم معنی ہیں- ایرانی، ترک اور چینی مسلمان عرب نہیں ہیں اور عرب

عیسائی اور یہودی اقلیتیں مسلمان نہیں ہیں- مذکورہ بالا طرز استدلال کی وجہ یہ ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا- اگرچہ دوسرے تمدنوں نے اسلامی ادب میں خاص ترقی کر لی ہے لیکن صحیفہ کی اصل زبان ہونے کے ناطے عربی کی اہمیت برقرار رہی- چنانچہ اگر میں اسلامی تمدن کو عربی زبان کے حوالے سے اجاگر کرنے کی کوشش کروں تو ان میں وہ ممالک بھی آ جاتے ہیں جن کی زبان عربی نہیں ہے- میرا نقطہ نظر یہ نہیں کہ اسلام کو عربیت میں تحویل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ایسے کوئی کوشش مسائل کی تفہیم میں معاون ہوسکتی ہے- مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ کچھ عربی الفاظ کی ہیت ترکیبی اور محل استعمال کا تجزیہ ہمیں اسلام کی بہتر تفہیم دے سکتا ہے- چنانچہ میں نے خود کو صرف ایسے گروہ کے تجزیے تک محدود رکھا ہے جو عرب ہیں اور مسلمان بھی- میں نے لفظ تمدن برتا ہے، نسل نہیں کیونکہ بہت سے الجیریائی، مراکش اور سوڈانی نسلاً عرب نہ ہونے کے باوجود عرب زبان اور مسلم تمدن سے قریبی طور پر متعلق ہیں- مجھے یہ کہنا ہے کہ ہماری تماثیل اور علامتیں جن میں افکار و احساسات جنم لیتے ہیں، ایک ایسی داخلی سطح سے جنم لیتے ہیں، جہاں اسلام اور زبان عملی طور پر ایک ہی چیز بن کر رہ جاتے ہیں-

5- امام القرطبی الانتقانی فضائل الائمتہ الفقیہہ ، مالکؒ، شافعیؒ و ابوحنیفہؒ، مطبوعہ دارالعلمیہ ، بیروت، صفحہ 44، مصنف متوفی 463ہجری-

6- ابن خلدون ''وفایات الاعیان'' جلد دوم، صفحہ 140، ابن خلیکان، متوفی 681 ہجری- حلاج کے متعلق مزید مطالعے کے خواہش مند حضرات کو اس پر میزینوں کی چار جلدوں پر مشتمل کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے-

3- امام کا خوف

1- فاطمہ مرنیسی، اسلام کی فراموش کردہ ملکائیں'' (Forgotten Queens of Islam)، کیمبرج 1993ء، باب دوم

2- برنارڈ لیوس Islam et Politique en Proche Orient میں ''Islam et Societe Civil'' صفحہ 29-

MashalBooks.org

3- شہرستانی ''الملل والنحل''، جلد اول، صفحہ 114، مصنف متوی 547 ہجری

4- المسعودی ''معارج الذہب''، جلد دوم، صفحہ 423- مصنف متوفی 346، ہجری-

5- شہرستانی ''الملل والنحل'' جلد اول، صفحہ 115، بنیاد پرستانہ دعووں کے حوالے سے دیکھئے، قاضی اشمعوی، ''الاسلام السیاسیہ'' باب اول

6- شہرستانی ''الملل والنحل''، جلد اول، صفحہ 122-

7- اشمعوی ''الاسلام السیاسہ'' باغی جمہوریت کے مقابلے میں نمائندہ جمہوریت کے دفاع میں ایک مختصر بحث اٹھائی گئی ہے-

8- ابن حزم ''الرسائل''، جل دوم، صفحہ 106، مصنف متوفی 456 ہجری-

9- علیؓ کے بعد خلافت کو اسلام کی روح کے خلاف موروثیت میں بدل دیا گیا اور 31 ہجری عہد بنو امیہ کا آغاز ہوا-

10- ابن حزم ''الرسائل'' جلد دوم، صفحہ 102-

11- ایضاً، صفحہ 103

12- حمام کو اپنے خاوند کے قتل میں استعمال کرنے والیوں میں ایک شجرۃ الدر جس نے مملوک مصر کو قتل کیا- دیکھئے مرنیسی کی ''فراموش شدہ سلاطین'' باب ششم-

13- المسعودی ''المعارج'' جلد چہارم، صفحہ 20-

14- ایضاً

15- ''لسان العرب'' دیکھیں ''شریعہ''

16- شہرستانی ''الملل والنحل'' صفحہ 45-

17- المسعودی ''المعارج'' جلد سوم، صفحہ 236-

18- ''معتزلہ'' پر ایک جامع بحث اور مبسوط حوالوں کے لیئے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام''

19- مارشل-جی-ایس ہاجس

(The venture of Islam, The conscience and History, world Civilization.)

جلد اول، صفحہ 410-

20- بنیاد پرستی کے مطالعہ پر مختص ''Muslim World'' کا خصوصی شمارہ (جنوری 1990ء)

21- محمد عبدالجابر ''Nahnu wa al-Tharwa'' مطبوعہ 1980- بیروت-

MashalBooks.org

22- محمد عابد الجابر ''تقوین العقل العربی'' مطبوعہ بیروت 1980ء-
23- شہرستانی الملل والنحل، جلد اول، صفحہ 37-

3- جمہوریت کا خوف

1- اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کا ہفتہ وار جائزہ (La Semaine Internale)، صفحہ 7، 9 فروری 1987ء-
2- دنیا کے عسکری اخراجات اور سامان حرب کی نقل وحمل (World Military Expenditures and Arms Transfer) (یو ایس آرمز اینڈ ڈس آرمامنٹ ایجنسی، 1984ء) صفحہ 9-8-
3- ایضاً-
4- سکاٹ آرم سٹرانگ (Arm Strong)، ''Eye of Storm'' Mother Jones U.S.Information Agency نومبر/دسمبر 1991ء، صفحہ 34-
5- ''On Secular Humanism'' جیمز ڈیوی سن ہنٹر، ڈائیلاگ (Dialogue) یو ایس انفارمیشن ایجنسی واشنگٹن، دی-سی، فروری 1991ء، صفحہ 70-
6- ایضاً، صفحہ 66-
7- Hichem Djait (Culture et Politique dans Le mode Arab)، خصوصی شمارہ، Islam et Politique 1991ء، صفحہ 71-
8- ''On Secular Humanism'' ہنٹر، صفحہ 70-
9- ''اصل التقدم عند مفکر الاسلام'' محولہ ''Culture et Politique'' F.Jadan (خصوصی شمارہ) 1991ء، صفحہ 71-
10- ''التسامح حسب الاصلاحیہ الاسلامیہ'' بیروت 1985ء-
11- ایضاً، صفحہ 47-
12- انور الجندی ''محمد طحہ حسین'' قاہرہ 1984ء، صفحہ 15-
13- درست طور پر یاد نہیں کہ اِن کی دو کتابوں میں کونسی تحریروں کا انتخاب ہمارے سکول کے نصاب میں شامل تھا- بہرکیف پچھلے دنوں کے مطالعہ نے مجھے تقریباً اوائل عمری کا

MashalBooks.org

سا سرور بخشا۔

14- رفعت الختاوی ''آ الاعمال المملیہ'' محولہ ''التسامسح، صفحہ 117۔

15- باب پنجم میں مذکور میری ابتدائی تعلیم قرانی مدرسے ہی میں ہوئی تھی۔

16- دیکھئے سعد الدین ابراہیم ''Anatomy of Egypt's Militant Islamic Group'' یکے از مطبوعات ''International Journal of Middle East Studies'' صفحات 423-53۔

17- یونیسکو کے لیے عرب ماہرین کا تحقیقی کام،

''La Science et la technologic nds les estates Arab's a horizon 2000'' مئی 1988ء۔

18- Djait ''Culture et Politique''، صفحہ 88۔

19- مشرقی یورپ سے کما حقہ واقف نہ ہونے کی بنا پر میں فقط مغربی یورپ کے حوالے سے بات کر رہی ہوں۔

20- قرآن حکیم، آیت 186 سورہ روم۔

21- بطور ملازم کارکنوں کے خدشات کے لیئے دیکھئے۔ فاطمہ مرینسی کا کیا گیا انٹرویو مطبوعہ حالیہ شمارہ رسالہ Le Maro co raconte par ses Fammes۔

4- اقوام متحدہ کا چارٹر

1- Multilateral Treaties Deposited with the Secreta General as December 31, 1987، صفحات 162-63۔

2- ''Human Rights Status of Internal instrument'' یو-این، نیویارک، 1987۔

3- دیکھئے نورالدین سعدی ''Femmes et loi en Algeria'' کاسابلانکا 1991ء،

شریف شاری عالیہ ''Femmes et loi en Tunisia'' کاسابلانکا 1991ء۔

عبدالرزاق مولے رشید ''Femmes et loi au Maroc'' کاسابلانکا 1991ء۔

4- ریڈیو اور ٹی وی کے متعلق تمام شماریات ''UNESCO Year Book'' 1985ء 1997ء سے لی گئی ہیں۔

MashalBooks.org

9- قرآن میں ان الفاظ کے لیے میں نے زیادہ تر محمد فہد عبدالباقی کی ''المعجم المفرح الفاظ القرن'' پر انحصار کیا ہے۔

5- قرآن حکیم

1- امام ابن کثیر ''تفسیر القرآن العظیم'' بیروت، جلد اول، صفحہ 8۔

2- ابن ہشام ''سیرۃ النبیؐ'' مصنف کا انتقال 216 ہجری میں ہوا۔ ذاتی طور پر میں ابن سعد کی ''سیرہ'' کو ترجیح دیتی ہوں، جن کا سال پیدائش 167 ہجری ہے۔ اس تصنیف میں جزئیات بکثرت ملتی ہیں۔ ابن سعد مصنف ''الطبقات الکبریٰ'' اور دوسرے مورخین نے بالعموم ابن ہشام سے خوشہ چینی کی ہے۔

3- ابن ہشام ''سیرہ''، ابن سعد طبقات، المسعودی معارج، جلد دوم، صفحہ 282۔

4- نزول قرآن کا دورانیہ کچھ کے نزدیک بیس اور کچھ تیئس سالوں پر محیط مانتے ہیں۔ بعض کو 25 برس پر بھی اصرار ہے۔ جلال الدین السیوطی کی ''اسرار ترتیب القرن'' اس موضوع پر مفصل بحث کرتی ہے۔ السوطی کا انتقال 911 ہجری میں ہوا۔

5- النیشا پوری ''اسباب النزول'' صفحہ 7۔

6- طبری تفسیر جامع البیان، جلد دوم، صفحہ 254۔

7- السیوطی ''اسرار'' صفحہ 71۔

8- ابن کثیر تفسیر القرآن، جلد اول، صفحہ 8۔

9- ابن سعد ''طبقات''، جلد دوم، صفحہ 355۔

10- سیطوطی، ''اسرار، تعارف'' صفحہ 44۔

11- شہرستانی، الملل ونحل'' صفحہ، جلد اول، صفحہ 128۔

12- ایضاً۔

13- فلپا عزینؔ ''Les Financiers de Islam'' رسالہ Le point، مئی 27 جون 2، 1991ء صفحہ 21۔

MashalBooks.org

6- حریتِ فکر کا خوف

1- ''لسان العرب'' لفظ سلم، بطور مصدر-
2- ابن سعد ''طبقات''، جلد دوم، صفحہ 136-
3- ابن الکلبی، ''کتاب الاصنام''، صفحہ 33-
4- عبدالباقی، ''کتاب المعجم'' صفحہ 379-
5- طبری ''تفسیر''، جلد 7، صفحہ 208، ''لسان العرب''-
6- لسان العرب-
7- طبری ''تفسیر'' جلد سات، صفحہ 208-
8- یہاں لفظ ''عقل'' اجتماعی عقلی رویے کے معنی میں استعمال ہوا ہے- یہاں فرد سے اپنی خواہش یعنی ہوا کو امت کے تابع کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے- یہاں ''عقل'' معتزلہ کی اس اصطلاح بمعنی انفرادی رائے سے متصادم ہے- اس بنیادی فرق کی وضاحت پر ایک مکمل کتاب ''Woman and the Muslim Unconscious'' پرگیمن پریس نیویارک موجود ہے-
9- عبدالباقی المعجم -
10- بخاریؒ الصحیح مطبوعہ بیروت 1978ء، جلد چہارم، صفحہ 44-
11- الکلبی، ''کتاب الاصنام''، صفحہ 8-
12- ''لسان العرب''، ''زندیق''
13- ابن کثیر، تفسیر القران، جلد اول، صفحہ 49-
14- طبری، تفسیر، جلد 23، صفحہ 125-
15- ابن الکلبی، ''کتاب الاصنام''، صفحہ 53-
16- تفسیر، جلد 23، صفحہ 123-
17- لسان العرب دیکھئے، ''حزب شیعہ''، ''مرثیہ'' ''Forgotten Queens of Islam''

MashalBooks.org

7- انفرادیت کا خوف

1- ہشام ''سیرہ'' جلد اول، صفحہ 83-

2- ابن الکلبی ''کتاب الاصنام''، صفحہ 28- یہ واقعہ ہشام نے سیرہ میں بھی بیان کیا ہے- لیکن اشخاص کے نام نہیں دیئے- تاہم وہ کچھ راویوں کی زبانی اسے امرا القیس سے منسوب ہونا بیان کرتے ہیں-

3- قرآن کی سورہ 79 آیت 15 تا 26 میں موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان اس مکالمہ کا ذکر موجود ہے-

4- مرنیسی ''Forgotten Queens of Islam'' باب نہم-

5- خیر الدین ''قاموس الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین''

6- المسعودی ''معارج'' جلد چہارم، صفحہ 188، موسیٰؑ کے واقعہ کے لئے قرآن کی سورہ 28 کی آیات 32-31-

7- الجاحز ''کتاب الحیوان'' محولہ بہ ابن الکلبی ''کتاب الاصنام'' صفحہ 94-

8- ابن ہشام ''سیرہ'' جلد چہارم، صفحہ 53-

9- ہاجسن ''The Venture of Islam'' جلد دوم، صفحہ 543-

10- استنباط کے جدید منابع سے منقطع ہونے کے نتیجے میں مسلم معاشروں کے انحطاط پر ایرانی صورتحال کے تناظر میں ایک تجزیہ ''Dariyus Shayegan'' کی ''Le Dechirure'' میں ملتا ہے جو ''Islamet Politique'' کے خصوصی شمارے میں چھپا-

11- اسلام اور جاہلیہ میں معاشرتی مقالہ کے حوالے سے عرب عورت پر مرنیسی نے اپنی کتاب ''The veil and Male Elite'' میں تفصیلاً روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح انہیں ایک فرد کی بجائے اشیائے صرف میں شمار کیا جانے لگا-

8- ماضی کا خوف

1- الجاحز ''کتاب الحجاب'' یہ رسال قاہرہ سے شائع ہونے والی ''رسائل الجاحز'' کی جلد دوم، صفحہ 86-28 پر موجود ہے- خلیفہ کے حجاب پر تفصیلی معلومات ملتی ہیں-

MashalBooks.org

2- ماضی سے آنکھیں چرانے کے باوجود عرب اپنے ماضی میں دلچسپی لیتے رہے- ابن ہشام کی ''سیرہ'' ابن حبیب ''کتاب المحابر'' ابن الکلبی ''کتاب الاصنام'' طبری ''تفسیر'' ابن سعد ''طبقات''، یاقوت ''معجم البلدان'' المسعودی ''معارج''-

3- ابن ہشام سیرہ جلد اول، صفحات 87-86-

4- ابن الکلبی ''کتاب الاصنام''

5- توفیق فہد ''Let Pantheon ed Arabe Central'' صفحہ 125-

6- ایضاً، صفحہ 126-

7- ابن الکلبی، ''کتاب الاضام'' صفحہ 15-

8- ایضاً-

9- ''Les Cultes du Hourani epoque Romaine'' ''Dominique Sourdel'' پیرس 1952ء، صفحہ 69-

10- ایضاً، صفحہ 73-

11- ابن الکلبی، کتاب الاصنام، صفحہ 15-

12- توفیق فہد ''Pantheon a.....'' صفحہ 169-

13- العلی ''محاورات'' صفحہ 182-

14- طبری ''تفسیر'' جلد 8، صفحہ 43-

15- ایضاً، جلد 8، صفحہ 51-

16- ابن ہشام، ''سیرہ'' جلد اول، صفحہ 160-

17- توفیق فہد ''Le pantheon'' صفحہ 168-

18- المسعودی ''معارج'' صفحہ 231-

19- ایضاً، صفحہ 248-

20- زہرہ کے حوالے سے دیکھیے Franz Comount کی ''Le Cult de Venus Chez Les Arabes'' مطبوعہ رسالہ ''Syria'' شمارہ، ص 192- مختلف اقوام اور ادوار میں دیویوں سے منسوب ستاروں کا ذکر کرتے ہوئے ثابت کیا گیا ہے کہ فینیز یوں کی اشطار ہی عربوں کی زہرہ تھی-

MashalBooks.org

21- طبری، تفسیر، جلد دوم، صفحہ 121-

22- یاقوت ''معجم البلدان''

23- طبری تفسیر، جلد 27- صفحہ 88-

24- ابن حبیب ''کتاب المخابر''، صفحہ 157-

25- قرآن میں کئی جگہ حیات بعد الموت پر کافروں کے افکار کے حوالے سے آیات موجود ہیں-

9- حال کا خوف

1- ہاجسن ''The Venture of Islam'' صفحہ 168-

2- الحاکم، مصر پر 386 سے 996 ہجری تک حکومت کرنے والے فاطمیوں میں سے ایک- اسے ستارہ شناسی کا جنون کی حد تک شوق تھا- اس کی عمومی ذہنی حالت پر بھی مورخین شک کرتے ہیں- وہ اپنی مختلف مہمات کے سلسلے میں بھی علم نجوم سے معاونت حاصل کرتا- مرنیسی کی کتاب ''Forgotten Queens of Islam'' میں اُس پر ایک پورا باب ملتا ہے- شیعہ مسلم حکومتوں کے اس نمایاں حکمران پر بن سالم ہمیش نے بھی ایک کتاب ''مجنون الحاکم'' مطبوعہ لندن، 1991ء لکھی-

4- موت یعنی زندگی اور اس کے تعلیقات سے انقطاع پر مذہب دوسری دنیا کا تصور دے کر انسان کو خوف سے نجات دلانے میں سائنس کے عقلی دلائل سے بہتر خدمات سر انجام دیتا رہا ہے-

5- برٹرینڈ رسل ''Religion and Science'' لندن آکسفورڈ 1956ء، صفحہ 19-

6- ایضاً، صفحہ 24-

9- طبری ''تاریخ الامم والملوک''، جلد سوم، صفحہ 90-

10- ایضاً، جلد دوم، صفحہ 252-

11- ایضاً، جلد اول، صفحہ 252-

12- ایضاً

13- ایضاً

MashalBooks.org

14- ایضاً، جلد دوم، صفحہ 253-254-

15- ایضاً، صفحہ 254-

16- طبری تفسیر، جلد 10، صفحہ 203-

17- المسعودی معارج، جلد دوم، صفحہ- 203

18- ''New Encyclopedia Britannica'' جلد سوم، صفحہ 606-

19- Jacques Attali کی Historic du temps، پیرس 1958ء، صفحہ 286-

20- ایضاً، صفحہ 284-

21- Science et Technologie کی Opuahes

22- عربوں کی ناکامی پر براق انیسہ کی تحریر Arabsat: Bilan et Perspectis مطبوعہ، Science et La Information، یونیورسٹی، ہربس، فروری 1986ء دیکھئے-

23- Attali, Histoire du temps صفحہ 62-

24- جوزف کیمپبل کی Myths to live By، نیویارک، صفحہ 242-

25- ایضاً، صفحہ 244-

26- ایلوٹافلر ''Power shift; Knowledge, wealth and violence Edge of Century'' نیویارک 1990ء، صفحہ 20-

10- عورتوں کا گیت _____ منزل آزادی

1- محمد لفصیح Chant ancient de femmes de Tez صفحہ 98-

2- ایڈوانس Chant de Mihyale Damasene، پیرس 1983ء-

3- محمد عبدالحکیم القاضی اللباس والزینۃ-

4- المقریزی، انحطاط، مصنف کا انتقال 845 ہجری میں ہوا-

5- ابی الفلاح، شذرات، جلد سوم، صفحہ 173-

6- ابن الاثیر الکامل فی التاریخ، جلد 8، صفحہ 494، مصنف کا انتقال 630 ہجری میں ہوا-

8- ولید المراکش، المعجب فی تخلیص اخبار المغرب، صفحہ 260، مصنف 621 ہجری میں یہ کتاب لکھ رہا تھا-

MashalBooks.org

12- اسلامی انقلاب کے بعد ایران میں خواتین کی تحریک پر فرح ایزاری کی تحریریں۔
13- پاکستان سے متعلق حقائق کے لئے یونیسکو کی Statirtical Yearbook UNESCO
statistical yearbook 1989ء۔
15- ایضاً۔
16- Harem years ہدیٰ شعراوی کی یادداشتیں۔
24- بیوی کی جگہ خاوند کے ووٹ ڈالنے کو دسمبر 1991ء سے الجیریا میں قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ہے۔
25- UNESCO Yearbook, 1988۔
27- مسلم ممالک میں شادی کی بڑھتی عمر اور اس کے نتیجے میں آنے والی معاشرتی تبدیلیوں کے لیے دیکھئے Women of the World, The Near East and Africa
29- نور عبداللہ ''الپٹرول والاخلاق'' کا باب، ''تیل کے معاشرے میں عورتیں''۔
30- Momento Defense Disarmament، 1989ء صفحہ 183۔
31- ایضاً، صفحہ 190۔
32- ایضاً۔
33- Julia Kristena ''Estrangers a nous - nemes''، پیرس، 1988ء۔

نتیجہ: سیمرغ ہم میں ہیں

1- فریدالدین عطار The conference of Birds، Hammondworth's، 1984ء۔
2- ایضاً۔
3- ایضاً۔ صفحہ 20-219۔

MashalBooks.org